خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اکیسویں صدی کا منفرد ڈائجسٹ

ردا ڈائجسٹ

MARCH
2016

ماڈل: صائمہ انصار
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی: موسیٰ رضا

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

مارچ 2016ء
جلد نمبر 20 شمارہ نمبر 3
قیمت 60 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
720 روپے



34535726

پبلشر وایڈیٹر صالحہ محمود نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
مقام اشاعت: ۱۲۹/ڈی بلاک-2-پی-ای-سی-ایچ-سوسائٹی، کراچی

مستقل سلسلے





نئی ساعتوں کے ساتھ آپی آپ سے مخاطب ہے۔ آپ کے سندیسے ہمیں تروتازہ کر دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے آبیٹھے ہیں۔ زندگی کے خوشگوار لمحات ہماری زندگی کا ایک اہم حصہ ہوتے ہیں۔ جہاں ہم ایک دوسرے سے شیئر کرتے ہیں وہیں ذات باری تعالیٰ سے دعاؤں کی استدعا بھی ہوتی رہتی ہے۔ لمحات پھر ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں اور ہم پھر ایک دوسرے سے آملتے ہیں۔ خوشیوں بھری شام اور یہ دن جو ہم فروری کے پچھلے پہر میں چھوڑ آئے ہیں آگے کا سفر پھر جاری وساری ہے۔

محبتوں اور ہماری چاہتوں میں آپ سب آباد رہتے ہیں۔ خوشیاں ڈھونڈنے کے لیے فاصلوں کو نہیں قرب کو ڈھونڈتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم کینہ اور حسد سے جب بچتے ہیں تو ہمارا قلب پاک ہوتا ہے۔ پاکیزگی اللہ کو پسند ہے جسم اور روح کی پاکیزگی بھی یہ ہے کہ ہمارے جسم سے زیادہ ہماری روح تروتازہ رہتی ہے۔ جسم ایک مادی شے ہے۔ روح ایک حقیقی عنصر جو قائم اور دائم ہے اور اس یقین کے ساتھ کہ ہم روح اور قلب کی پاکیزگی کے ساتھ ایک دن اٹھائے جائیں گے۔ اس یقین کے ساتھ زندہ رہیں کہ ہمیں اس دنیا میں رہتے ہوئے اپنی روح کو پاک وصاف رکھنا ہے۔ قلب انسانی میں جو وسوسے ہوتے ہیں وہ ہمیں نقصان سے قریب اور فائدے سے دور کر دیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنی روح کے اندر خود کو دیکھ سکتے ہیں۔

بس ایک چھوٹی سی بات کہ اپنے آپ کو ہر برائی سے بچائے رکھیے اردگرد رہنے والوں سے محبت اور خوشی کا اظہار کیجیے۔ ضد، غصہ، حسد، ذہنی بیماریاں ہیں ان سے بچیے اور خود کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے ان بیماریوں سے دور رہیے۔

ماہ مارچ کا ردا آپ کو کیسا لگا یہ ضرور لکھیے گا۔ سندیسے رہنمائی کا ذریعہ ہیں۔ ہمیں اپنی آرا سے آگاہ کیجیے۔

آپی

صالحہ محمود



ایمان اور اس کے مسائل

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مسلمان وہ آدمی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ آدمی ہے جس سے لوگوں کے خون اور مال محفوظ ہوں۔" (ترمذی، نسائی، عن ابی ہریرہؓ)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس آدمی میں امانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں اور جو وعدے کا خیال نہیں کرتا اس کے دین کا کوئی اعتبار نہیں۔" (بیہقی، عن انسؓ)

کبیرہ گناہوں اور نفاق کی علامات کا بیان

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب کوئی آدمی زنا کرتا ہے تو اس (کے جسم) سے اس کا ایمان نکل کر اس کے سر پر سائے کی مثل رہتا ہے اور جب وہ اس فعل سے رک جاتا ہے تو ایمان اس کی طرف واپس لوٹ آتا ہے۔" (ترمذی۔ عن ابی ہریرہؓ)

ایک یہودی نے اپنے ساتھی سے کہا کہ آؤ اس نبی (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس چلیں تو اس کے ساتھی نے اس سے کہا کہ انہیں نبی نہ کہو۔ اگر اس نے تم سے یہ الفاظ سن لیے تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائیں گے) چنانچہ وہ دونوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے واضح احکامات کے بارے میں سوال کیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، چوری نہ کرو، زنا نہ کرو۔ جس جان کو اللہ تعالیٰ نے قتل کرنا حرام قرار دیا ہے اسے ناحق قتل نہ کرو۔ کسی بے گناہ کو قتل کرانے کے لیے (اس پر غلط الزام لگا کر) حاکم کے پاس نہ لے جاؤ۔ جادو نہ کرو، سود نہ کھاؤ۔ پاک دامن عورتوں پر (زنا کی) تہمت نہ لگاؤ۔ میدان جنگ سے نہ بھاگو اور اے یہودیو! تمہارے لیے خاص حکم یہ ہے کہ ہفتہ کے دن (حکم الٰہی سے تجاوز نہ کرو۔" (یہ سن کر) ان دونوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اور پاؤں کو چوما اور اقرار کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سچے نبی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "پھر تمہیں میری پیروی سے کون سی چیز روک رہی ہے؟" انہوں نے کہا کہ داؤد علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ نبوت کا سلسلہ ہمیشہ انہی کی اولاد میں چلتا رہے۔ لہٰذا ہمیں خطرہ ہے اگر ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی تو یہودی ہمیں قتل کر دیں گے۔ (ترمذی، نسائی، عن صفوان بن عسالؓ)

(وضاحت: یہودیوں کی مذہبی کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا تذکرہ موجود تھا انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کا اس طرح یقین تھا جس طرح کسی کو اس کی اولاد اپنی ہونے کا یقین ہوتا ہے مگر حسد اور بغض کی وجہ سے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے۔ داؤد علیہ السلام کی دعا یہودیوں کی اپنی گھڑی ہوئی بات تھی انہوں نے ایسی دعا نہیں کی تھی اس لیے کہ انہوں نے خود تورات اور زبور میں آپ صلی

اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا پڑھ رکھا تھا۔)

وسوسہ کا بیان

ایک صحابیؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے دل میں ایسے خیالات پاتا ہوں کہ زبان سے ان کے اظہار کے بجائے جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے زیادہ پسند ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کا شکر ہے جس نے ان خیالوں کو وسوسوں تک محدود رکھا۔" (اور انہیں یقین و عمل کا حصہ نہیں بننے دیا)۔ (ابوداؤد۔ عن ابن عباسؓ)

تقدیر پر ایمان لانے کا بیان

(وضاحت: تقدیر کے معنی مقدار مقرر کرنا ہے۔ اصطلاح شریعت میں افعال مخلوق (مخلوق کے اچھے یا برے کاموں) کے بارے میں مالک ارض و سما نے جو کچھ لکھا ہے وہ تقدیر کہلاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں تقدیر اللہ رب العزت کا علم مستقبل ہے جو کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ تقدیر کے بارے میں پائی جانے والی الجھنوں کا سبب اس کے صحیح مفہوم سے عدم واقفیت ہے۔ معنی و مفہوم سمجھ لینے کے بعد اس کی بابت کوئی اشکال باقی نہیں رہتا یہ بات ہمارے مشاہدے میں ہے کہ انسان اپنے علم اور تجربے کی بنیاد پر کسی چیز کے بارے میں کوئی رائے قائم کر لیتا ہے اور اس کے انتہائی محدود علم کے باوجود بعض اوقات اس کی رائے اور اندازہ سو فیصد درست ثابت ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ کا علم اس قدر وسیع اور نہ ختم ہونے والا ہے کہ اس کے لیے ماضی، حال اور مستقبل غائب اور حاضر، دن اور رات، روشنی اور تاریکی جیسی اصطلاحات بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے سامنے ہر چیز کھلی کتاب کی طرح ہے اس وسیع اور لامحدود علم کی بدولت مخلوق کے بارے میں اس کی لکھی ہوئی تقدیر کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ اپنے اسی وسیع علم کی روشنی میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے عمل کرنے سے پہلے ہی اس کے حساب (کھاتے) میں لکھ دیا ہے کہ یہ انسان اچھے یا برے اور کیا کیا کام کرے گا اور اس کی جزا یا سزا کیا ہوگی۔ ہادی کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "ایک آدمی مسلسل نیک کام کرتا ہے یہاں تک کہ بالکل جنت کے قریب پہنچ جاتا ہے پھر اچانک وہی آدمی تقدیر کے مطابق برے کام کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ وہ دوزخ میں چلا جاتا ہے اسی طرح ایک آدمی برے کام کرتا ہے اور دوزخ کے بالکل قریب پہنچ جاتا ہے پھر وہ اچانک تقدیر کے مطابق اچھے کام کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ وہ جنت میں چلا جاتا ہے۔" (صحیح بخاری کتاب القدر)۔ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پہلے سے جانتے ہیں کہ کون کب اور کیا عمل کرے گا وہ اپنے وسیع علم کی بدولت یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ گناہ گار انسان آخر کار توبہ کر لے گا اور نیک عمل کرنے لگے گا اور اسی (اچھے عمل) پر اس کا خاتمہ ہوگا یا یہ نیکی کرنے والا بالآخر نیکی کا دامن چھوڑ کر گناہوں کی طرف راغب ہو جائے گا اور اسی برائی کی حالت میں اس کا خاتمہ ہوگا۔

تقدیر کے بارے میں یہ تاثر انتہائی گمراہ کن ہے کہ انسان تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہے اور وہ اپنی مرضی اور اختیار سے کچھ نہیں کر سکتا حالانکہ نیکی اور برائی کی راہ اختیار کرنا انسان کا اپنا فعل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی جبر نہیں ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک استاد امتحان سے پہلے اپنے شاگردوں کے بارے میں اندازہ لگاتا ہے کہ فلاں پاس ہوگا فلاں فیل ہوگا اور اگر استاد کا اندازہ درست ثابت ہو جائے تو یہ ہرگز نہیں کہا جا سکے گا کہ یہ استاد کے اندازے کی وجہ سے پاس یا فیل ہوئے ہیں۔ پاس یا فیل ہونا اس کے اپنے عمل کی وجہ سے ہے۔ جس طرح استاد کا اندازہ لگانا شاگردوں کو پاس یا فیل ہونے پر مجبور نہیں کرتا اسی طرح اللہ تعالیٰ کا مخلوق کے بارے میں اپنے علم مستقبل کی وجہ سے تقدیر لکھنا انسانوں کو کسی کام پر ہرگز مجبور نہیں کرتا ہے۔☆

شازیہ مصطفیٰ عمران

سلسلے وار ناول

آخری قسط

تجھ سے مانگوں میں تجھ کو

شہریار نے بھی خاصی توجہ سے فلیٹ سجا کے رکھا تھا۔
"آپ کی ڈیوٹی کب سے اسٹارٹ ہے؟"



''کل سے جوائن کرنا ہے چھٹیاں بھی ختم ہو گئی ہیں۔'' وہ اس کی پشت پر آ گیا۔
''ارے کیا کرتے ہیں مجھے ناشتہ تو بنانے دیں۔''
''تم اس حلیے میں گھومتی رہو گی تو میری نیت خراب ہوتی رہے گی۔'' وہ معنی خیزی سے بول رہا تھا۔
''آپ بھی بس...... ! ہٹیے۔'' اس نے زبردستی شہریار کو ہٹایا۔
''یار! اپنی بیوی کو پیار کر رہا ہوں۔''
''پیار و محبت کا بھی وقت ہوتا ہے۔'' وہ شرما گئی تھی۔
''ہمارے پیار و محبت کے ہر وقت ہی ہیں تاکہ تمہیں یہ احساس نہ ہو کہ میں یہاں لا کے تم پر توجہ نہیں دے رہا۔''
''ہاں اپنے مطلب کی باتیں یاد رہتی ہیں۔'' ناشتہ تیار کر کے وہ ڈائننگ ٹیبل پر لگا چکی تھی۔
''ایسی بھی بات نہیں ہے تم جلدی سے فریش ہو جاؤ۔ آج میں تمہیں گھماؤں گا پھراؤں گا۔'' وہ سلائس



کھانے لگا۔

"مجھے حباب سے فون پر بات کرنی ہے۔"

"آ کے رات میں آرام سے کریں گے ابھی تو تم جلدی سے تیاری کرو۔" اس نے حکم دیا۔ حسنیٰ حباب سے پوچھنا چاہتی تھی ضمران سے صلح کر لی کہ نہیں کیونکہ وہ یہاں آنے سے پہلے کافی لمبا لیکچر دے کے آئی تھی وہ بھی تو شہریار کی محبت پا کے بہت خوش تھی۔

☆......☆

مریم کی خالہ نے ایک چھوٹی سی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ ان کے حالات اتنے اچھے نہیں تھے کہ فاران کے گھر والوں کا مقابلہ کرتے۔ مرتضیٰ علی نے بھی انہیں زیادہ کچھ کرنے سے منع کیا تھا۔ بارات میں بھی صرف گھر کے افراد ہی آ رہے تھے۔ ولیمے پر خاصا اہتمام تھا۔

"کتنی تیاری اور کرنی ہے آپ لوگوں نے نو تو یہیں بجا دیئے۔" اشرف علی خاصے برہم ہو رہے تھے۔

"ارے لڑکیوں کہاں ہو؟" نزہت نے ہال کمرے سے سب کو آواز دی۔

"امی! میں تو تیار ہوں ماہ رخ اور چچی جان بھی آ رہی ہیں۔"

"خوشنما کا پتا کرو وہ تیار ہوئی یا نہیں۔" نزہت اسے کچھ دنوں سے اہمیت دینے لگی تھیں۔ جو ہم حیرت و انبساط میں مبتلا ہو کے انہیں دیکھنے لگی جو فان کلر کی نفیس سی کامدانی والی ساڑھی میں سو بر لگ رہی تھیں۔

"میرا منہ کیا تک رہی ہو، دیکھ کے آؤ اسے۔" ساتھ ہی انہوں نے اسے ڈپٹ کے حکم دیا اور خود باقی لوگوں کی تیاری دیکھنے اندر آ چکی تھیں۔ جو ہم نے خوشنما کو خوش ہو کر بتایا تھا۔ وہ بھی مطمئن اور خوش ہو گئی تھی۔

ریڈ جدید اسٹائلش ڈریس میں وہ جیولری میک اپ میں اپسرا سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ ہیثم کڑھے ہوئے کرتے شلوار میں ملبوس ڈیسنٹ لگ رہا تھا، وہ کئی دفعہ اسے چوری چوری غور سے دیکھ رہا تھا۔ خوشنما اس کی یہ حرکت کئی دفعہ نوٹ کر چکی تھی۔

فاران بھی شیروانی کلاہ میں شہزادوں سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

شاہدہ اور ارتضیٰ علی سب کو گاڑیوں میں بیٹھنے کا کہہ رہے تھے۔

خوشنما بھی اپنے ڈریس کو سنبھالتی ہوئی آگے آگے جا رہی تھی۔

"ذرا آرام سے، کہیں گر نہ جانا۔" ہیثم کی شوخ سی آواز نے اسے پزل کر دیا۔

"چلو میری گاڑی میں بیٹھو۔" وہ گیٹ سے باہر اس کا ہاتھ پکڑے لے جا رہا تھا۔

"ارے اس نئے نویلے جوڑے کو تو دیکھو۔" مہران کی بھی رگ ظرافت پھڑکی۔

خوشنما نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ سارے ہی ساتھ نکل پڑے تھے۔

فاران مرتضیٰ علی کے ساتھ بیٹھا تھا گاڑی کو بہت خوب صورت سجایا گیا تھا جو ہیثم نے ہی سجائی تھی۔

"کتنا خوش لگ رہا ہے فاران۔" ہیثم نے رشک بھری نگاہوں سے دیکھا۔

وہ پہلو بدل کے رہ گئی اس کے ساتھ ہی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔

"ظاہر ہے خوش کیوں نہ ہو اس کی بیوی جو خوش ہو گی اسے پا کے۔" خوشنما کی فہمائشی نگاہ نے اسے گھورا۔

"ہر کوئی آپ کی طرح تھوڑی ہی ہو گا، اپنی شادی سے سب خوش ہوتے ہیں۔"

''اے بیوی تم اب مجھ پر الزام لگا رہی ہو۔'' گاڑی کا اسٹیئرنگ سنبھال کے اس کے قاتل حسن کو آنکھوں میں کب سے جذب کر رہا تھا۔

خوشنما کا بھی دل آج مختلف انداز میں دھڑک رہا تھا۔ ہیثم کی شوخیاں خوشنما کے روڈ رویئے کی وجہ سے بھی کم نہیں ہو رہی تھیں۔

آگے پیچھے گاڑیاں روانہ ہو چکی تھیں۔

''میں الزام نہیں لگا رہی جو حقیقت ہے وہ بول رہی ہوں۔'' ماتھے پر لگی بندیا اس کے چہرے کو اور دلنشین بنا رہی تھی۔

''حقیقت تو یہی ہے کہ میں تم سے سچی محبت اور پیار کرنے لگا ہوں۔'' وہ بڑی احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا سب کی گاڑیاں آگے جا کے الگ الگ ہو گئی تھیں۔ سڑک پر ٹریفک کا ایک ہجوم تھا۔ ساتھ چلنا محال تھا۔

''پتا نہیں۔'' وہ منمنائی۔

''تم تو لگتا ہے جب میں اس دنیا میں نہیں ہوں گا جب ہی یقین کرو گی۔''

''اللہ نہ کرے کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں دھیان سے گاڑی ڈرائیو کریں۔'' خوشنما تو یہ سب تصور بھی نہیں کر سکتی وہ ہیثم سے پیار کرنے لگی تھی اس کی ایسی باتیں روح فرسا تھیں وہ اپنے منہ سے اقرار کرتے ہوئے جھجک رہی تھی۔

''بیوی والا انداز ہے۔''

''بیوی ہوں تو انداز بھی وہی ہوگا۔'' وہ پورے راستے درود شریف اور آیۃ الکرسی کا ورد کرتی رہی اور ہیثم سے بات کرنے سے گریز کیا کیونکہ وہ مسلسل الٹی سیدھی باتیں کر رہا تھا اور وہ ایسی کوئی بدمزگی نہیں چاہتی تھی۔ سب کچھ اتنا اچھا ہو گیا تھا اسے سب اچھا لگنے لگا تھا۔ بڑی مامی کا رویہ بھی اس کے ساتھ اچھا ہوتا جا رہا تھا۔

☆......☆

''کیا بات ہے صبح سے لوگوں کو فرصت ہی نہیں ہے۔'' ضمران نے اس کے اندر داخل ہوتے ہی ذرا خفگی سے کہا۔

''جی ایسی کوئی بات نہیں ہے، نوشین اور کرن کی منگنی کے فنکشن کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی تھکن ہو گئی ہے۔'' وہ عذر پیش کرنے لگی۔

''منگنی ہوئے بھی آج تیسرا دن ہے۔'' وہ لیپ ٹاپ میں مصروف تھا۔

''آپ کے بھائیوں نے خود گھر اتنا پھیلایا ہے اسے بھی سمیٹنا تھا۔'' وہ بالوں کو جوڑے کی طرح لپیٹ کے اس کے برابر ہی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''سب کچھ اتنا اچھا ہو گیا ہے مجھے تو یقین ہی نہیں ہو رہا۔'' حباب کو تو یقین نہیں ہو رہا تھا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' ضمران نے بھی تائیدی سر ہلایا۔

''دونوں کے منگیتر بھی اچھے ہیں۔ فیملی اچھی ہے۔'' حباب کو یہ زیادہ خوشی تھی کہ لوگ اچھے تھے اور نوشین کی جو سوچ تھی اس کے مطابق ملے تھے۔

''اچھا اگر آپ ان تمام باتوں سے فارغ ہو گئی ہوں تو ادھر بھی بات کر لیں۔'' ضمران نے لیپ ٹاپ کا

رخ ادھر کیا۔

سامنے اسکرین پر شہریار اور حسنیٰ نظر آئے۔

"ارے شہریار ماموں، حسنیٰ آنٹی کیسی ہیں؟" وہ ان دونوں کو سامنے دیکھ کر وفورِ مسرت سے گویا ہوئی۔

"ہم تو الحمدللہ خیریت سے ہیں تم سناؤ کیسی گزر رہی ہے۔" حسنیٰ کی خوشی سے بھرپور چہکتی ہوئی آواز آئی وہ ویسے بھی بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔

"ہم بھی ٹھیک ہیں۔" حباب نے ہنس کے ہی جواب دیا۔

"حسنیٰ آنٹی! آپ تو بہت پیاری ہوگئی ہیں۔"

"ارے کیا تم لوگ یہ باتیں کرنے بیٹھ گئے یہ بتاؤ وہاں سب ٹھیک تو ہے اور خوش خبری ہے کوئی۔" ضمران نے تو حباب کو کن انکھیوں سے دیکھنے کے بعد اپنی مسکراہٹ دبائی۔

"کیا ہے! آپ تو شروع ہو جاتی ہیں۔" اسے شہریار اور ضمران کی موجودگی میں حیا سی آنے لگی۔

"میں نے تو کچھ نہیں سنا۔" ضمران اسے تنگ کرنے لگا۔ کافی دیر تک ان لوگوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ شہریار نے ہی خدا حافظ کہا تھا ورنہ تو حسنیٰ اور حباب کی باتیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

"حسنیٰ آنٹی کتنی خوش اور پیاری لگ رہی تھیں۔"

"خوش اور پیاری تو آپ بھی ہیں۔" ضمران نے آنکھوں میں خمار لیے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑا۔

"میں ان کی بات کر رہی ہوں۔" وہ جھینپ گئی۔

"میں تمہاری بات کر رہا ہوں جانِ من۔" اس پر شوخیاں سوار ہونے لگیں۔

"ارے کیا کرتے ہیں مجھے اتنے کام کرنے ہیں۔"

"بھاڑ میں گئے تمہارے کام ابھی صرف میری بات ہوگی۔" وہ اسے اپنے پہلو میں گرا کے گویا ہوا۔

"آپ ضرورت سے زیادہ شوخ نہیں ہوگئے؟" حباب کو وہ حیران ہی کر رہا تھا۔

"میں ایسا ہی شوخ ہوں وہ تو تم نے ہی خاطر میں نہیں لیا۔ وہی سوگ مناتی رہیں ہماری شادی ایسے کیوں ہوگئی۔ ارے وہ تو بھلا ہو چندا میاں کا جو انہوں نے ہمیں ملا دیا۔"

"چندا میاں نے نہیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ملایا ہے۔" فوراً تصحیح کی۔

"مگر سبب تو وہی بنے ہیں پھر اللہ تعالیٰ نے ہم دونوں کو ملا دیا میں تو صرف تمہیں سوچتا تھا مگر کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ میرا اور تمہارا ملن بھی ہوگا۔" اس نے حباب کے جانے کے تمام راستے مسدود ہی کر دیئے۔

"میرے خیال میں مجھے اٹھنا چاہیے ابھی رات کا کھانا بھی بنانا ہے۔" وہ اٹھنے لگی۔

"تمہیں کیا ہر وقت کام یاد آتے رہتے ہیں۔" وہ بھنا گیا۔

"آج اگر آپ نے چھٹی کی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں سارے کاموں کی چھٹی ہے۔ ابو جلدی کھانا کھاتے ہیں آپ کو پتا ہے میں اس لیے جلدی کھانا بنا لیتی ہوں۔" وہ وضاحت دینے لگی۔

"امی سے بولوں گا آدم کی بھی جلدی شادی کریں تاکہ تم کاموں کا بہانہ کم بناؤ۔"

"آپ تو سچ میں ناراض ہوگئے۔" وہ ہنسنے لگی۔

"جاؤ یہاں سے اپنے سارے کام انجام دے لو، میرا کام ہی انجام نہیں دینا۔" وہ واقعی خفگی دکھاتا ہوا دور ہو کے لیٹ گیا۔

حباب جز بز سی ہو گئی تھی وہ کچھ دیر تک ایسے ہی اسے دیکھتی رہی پھر مسکرانے لگی۔
''اچھا آتی ہوں کچھ دیر میں۔''
''جاؤ جاؤ۔'' وہ روٹھ کے لیٹ گیا تھا۔ حباب جانتی تھی اسے کیسے منانا ہے۔

☆......☆

رخصتی بارہ بجے سے پہلے ہی ہو گئی تھی۔ بارات بھی واپس جلدی ہی آ گئی تھی سب ہی چینج کر کے فری ہو گئے تھے۔
''تم جا کے ذرا مریم کے کمرے میں یہ کھانے کا سامان رکھ آنا اس کی خالہ بتا رہی تھیں اس نے کچھ کھایا پیا نہیں ہے۔'' نزہت نے اسے مخاطب کیا جو ایزی سے قمیض شلوار میں ملبوس سب کے لیے چائے بنا رہی تھی۔
''جی اچھا۔'' خوشنما تو حیران ہی رہ گئی نزہت نے اسے آج یوں مخاطب جو کیا تھا۔
''ارے اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو بیٹا۔''
''آپ اتنے عرصے بعد مجھ سے اتنے اچھے انداز میں جو بولی ہیں۔'' خوشنما صاف گو مزاج کی تھی۔ اس نے آہستگی سے یہ کہہ دیا۔
''بیٹا! میں ہی غلطی پر تھی جو تم سے غلط رویہ رکھتی رہی اور ہیثم بھی دیکھو مجھ سے دور ہو گیا جانے غصے میں اسے کیا کیا کہہ دیا۔'' نزہت واقعی بہت شرمندہ تھیں اگر مرتضیٰ علی انہیں نہیں سمجھاتے تو وہ تو سب کے ساتھ غلط کرتی رہتیں۔
''مامی آپ ایسا نہیں سوچیے آپ تو ہماری بڑی ہیں۔''
''بڑے ایسے ہوتے ہیں اپنے بچوں کو ہی برا بولتے ہیں اور دیکھو میرے بڑے بول ہی میرے آگے آئے ہیں فاران کی شادی......!''
''مامی آپ ایسی بات نہ کریں آپ فاران بھائی کی شادی سے خوش ہیں؟''
''ہوں میں خوش ہوں کیونکہ ہمیں اولادوں کی خوشی میں خوش رہنا چاہیے فاران نے اچھی لڑکی سے ہی شادی کی ہے یہ میرے دل کو سکون ہے۔'' ان کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔
''ارے بھئی آپ چائے بنا رہی ہیں یا پائے بنا رہی ہیں ہیثم بھائی پوچھ رہے ہیں۔'' مہران کچن میں ایک دم سے آ گیا۔
''ہاں ہاں لے کے آ رہی ہوں۔''
''تم چائے کو چھوڑو میں بنا لوں گی تم بس مریم کے پاس چلی جاؤ۔'' انہوں نے اسے ہدایت دیں۔ وہ پھر مریم کے کھانے کے لوازمات کی ٹرے لے کر اوپر جانے لگی۔
ہیثم کی نگاہ اس پر اٹھی اسے چائے لانے کو کہا تھا وہ اوپر جا رہی تھی۔
''کہاں جا رہی ہو؟''
''یہ لے کے، فاران بھائی کے روم میں، مریم کے لیے کھانا وغیرہ ہے۔'' اس نے ٹرے کی جانب اشارہ کیا۔
''جلدی سے آؤ۔'' وہ ساتھ ہی ہدایت بھی دینے لگا پنک کاٹن کے ایمبرائیڈری کے کپڑوں میں وہ ابھی

تک اسی میک اپ میں تھی کتنی حسین لگ رہی تھی ہیشم کو اپنے نفس کی لگام کو تھامنا آج بہت مشکل لگ رہا تھا وہ بھی ان سب کے درمیان آ کے بیٹھ گیا۔

فاران نے اسے بغور دیکھا جیسے کسی بات کو جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"کیا بات ہے کچھ بات ہو گئی؟"

"نہیں...... کچھ نہیں۔" وہ جھنجھلا کے کھڑا ہو گیا۔

"اور سن جا تو اپنے روم میں اور میری والی کو بھیج۔"

"او اچھا اب سمجھا جلن ہو رہی ہے۔" اس نے معنی خیزی سے آنکھیں گھمائیں۔

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ واقعی بہت کھسیایا ہوا تھا۔

"یہ سب تیری ہی حرکتوں کا نتیجہ ہے۔"

"اچھا، اچھا بس اپنی فکر کرو بے چاری ابھی سے ڈری بیٹھی ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔" وہ اس کے قریب ہو گیا۔

"جب ہی کھانا وغیرہ کھا کے نہیں آئی ہے تمہاری محترمہ۔"

"وہ تو ہر لڑکی شادی والے دن کھا کے نہیں آتی ہے۔" فاران ایسے بولا جیسے سب کے متعلق جانتا ہو۔

"یہ تم دونوں کن جھگڑوں میں پڑے ہو۔" شاہدہ کافی دیر سے دونوں کو الجھتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

"چائے کا انتظار کر رہا ہوں وہ ابھی تک نہیں آئی۔" ہیشم جھٹ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

"چائے آ چکی ہے تم لوگ ہی لڑنے میں لگے تھے۔"

سارے لوگ ہال کمرے میں جمع تھے اور اپنی اپنی خوش گپیوں میں لگے تھے۔ نزہت سب میں چائے سرو کر رہی تھیں۔

"اٹھو تم لوگ اور اپنے اپنے کمروں میں جاؤ۔" انہوں نے حکم دیا۔

فاران سر کھجانے لگا جب کہ ہیشم پہلو بدل کے رہ گیا۔ نزہت مامی سے کب اس کی بات چیت تھی۔ کتنی دور ہو گئی تھیں اور آج انہوں نے اسے چائے دی اس پر تو حیرانگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔

"امی ابھی جا رہا ہوں ذرا چائے پی لوں۔"

"چائے اپنے ساتھ اوپر لے جاؤ بہت دیر ہو گئی ہے۔ صبح سب کو پھر کل کے فنکشن کی بھی تیاری کرنی ہے۔"

ہیشم چائے کے سپ لے رہا تھا۔

"امی کل تو اس کا بھی ولیمہ ہے۔"

"میرا اتنا پرانا ولیمہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اٹھ گیا۔

نزہت اس کی خفگی سمجھ رہی تھیں اور دیکھ رہی تھیں انہوں نے اسے بالکل فاران کی ہی طرح سمجھا تھا۔ پتا نہیں انہیں کیا ہو گیا تھا کہ ان میں فرق کرنے لگی تھیں۔

"امی! ہیشم کے ساتھ آپ نے اچھا نہیں کیا۔"

"تم اس کی فکر نہیں کرو وہ بھی میرا بیٹا ہے سنبھال لوں گی۔" ہیشم اوپر جا رہا تھا نزہت کو احساس تھا انہوں نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے۔

"تم جاؤ ورنہ تمہارے ابو ڈانٹیں گے پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے میں ان لوگوں کو بھی سونے کے لیے بھیجتی ہوں۔" وہ جلدی جلدی سب سے اٹھنے کا کہنے لگیں۔

"آج لگی ہے نا مجھے اپنی بڑی بہو اس گھر کی بڑی۔" مرتضٰی علی بہت خوش تھے۔ نزہت نے پہلے کی طرح اپنا انداز کر لیا تھا۔ بڑی بن کے سب کو لے کے چل رہی تھیں۔

"سنو! شاہدہ کل ہیثم کے روم کا بھی کرنا ہے۔"

"جی بھابھی مگر وہ ہیثم اور خوشنما......! وہ دونوں تو کبھی نہیں مانیں گے۔"

"یہ لوگ جب کمرے سے نکلیں گے تو تم اشرف سے کہہ کر کروانا وہ دو تین بندوں کو لگا دے گا جلدی کمرا سیٹ ہو جائے گا۔"

"اچھا دیکھتی ہوں کیونکہ ولیمے کے فنکشن میں بھی تو پہنچنا ہوگا۔"

شاہدہ کا ذہن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ ہیثم اور خوشنما تو کسی طرح بھی نہیں مانیں گے۔

سب ہی اٹھ کے اپنے اپنے روم میں چلے گئے تھے۔ ہیثم کب سے اس کا انتظار کر رہا تھا مگر لگتا تھا وہ جان بوجھ کے نہیں آ رہی تھی۔

"پتا نہیں کب تک یہ میرے ساتھ ایسا سلوک کرے گی۔" وہ کروٹیں بدل رہا تھا۔

زندگی میں پہلی دفعہ اسے کسی لڑکی سے پیار ہوا تھا اور پیار بھی اس لڑکی سے جو اس کی بیوی ہی تھی، کبھی اس نے دوسری طرف سوچا ہی نہیں تھا وہ خود حیران تھا کیسے وہ کسی لڑکی کا ایسا دیوانہ ہو سکتا ہے۔

کتنی بار وہ محبت کا یقین دلا چکا تھا مگر لگتا تھا وہ ابھی بھی بے اعتبار ہی تھی۔

وہ اس سے کیسے اسے مانگے کہ وہ اپنا آپ اپنے دل سمیت اس کے حوالے کر دے۔

"اس وقت جھٹ سے دروازہ کھلا تھا وہ اندر آ گئی تھی۔ اسے عشاء کی نماز بھی پڑھنی تھی۔ باقی کی نمازیں قضا پڑھنی تھیں۔ دو گھنٹے لگ کے میک اپ اترا تا وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کے پہلے بالوں کا ہیئر اسٹائل کھولنے لگی۔

ہیثم ایسے بن گیا جیسے سو رہا ہو وہ اپنے کام انجام دیتی رہی اور وہ لیٹا رہا جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

خوشنما بھی نماز وغیرہ سے فارغ ہو کے اسی حلیے میں آ کر لیٹ گئی۔ آج اسے نزہت مامی کا مخاطب کرنا بہت اچھا لگا تھا اس نے تو اپنے دل سے سب کو معاف کر دیا تھا مگر اس شخص کی جانب پہل کرتے ہوئے وہ ہچکچا رہی تھی۔

☆......☆

آج پھر ذاکر صاحب نے راشدہ کو اچھی طرح احساس دلایا تھا۔ وہ ندامت سے سر جھکا کے رہ گئی تھیں۔ رضوانہ نے کتنی اعلٰی ظرفی کا ثبوت دیا تھا ان کی ایسی باتوں کو نظر انداز کر کے اپنے بیٹے سے ان کی بیٹی کا رشتہ جوڑا تھا۔

"راشدہ! تمہیں تو ایسی عورت کو سلام کرنا چاہیے تم سب کے ایسے سلوک کی وجہ سے بھی تم سب سے اچھا برتاؤ ہی رکھتی ہیں۔ تمہاری امی نے کون سی کسر چھوڑی تھی چھوٹے بچوں کے ساتھ گھر سے نکالا اور تم نے ان بچوں کے باپ کو زبردستی اس گھر میں رکھا صرف اپنی بھاوج سے جلن اور حسد کی وجہ سے کہ ان

کے بیٹے ہوئے تھے اور تمہاری بیٹیاں۔ راشدہ میں نے تو کبھی بھی تمہیں احساس نہیں دلایا تھا کہ بیٹیاں ہی کیوں ہو رہی ہیں ارے یہ سب اوپر والے کی رضا سے ہو رہا ہوتا ہے۔ شکر ادا کرو ہماری اولاد تو ہے کچھ لوگوں کو تو یہ بھی میسر نہیں۔'' ذاکر صاحب نے آج راشدہ کے ضمیر کو اچھی طرح جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔

راشدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کیونکہ ان کا دل بھی بہت ملامت کر رہا تھا۔

''راشدہ دوسروں سے خوش ہوا کرو جلن وحسد میں خود کو تباہ نہیں کرو کیونکہ اس سے نقصان اس کا نہیں تمہارا ہوگا اور دیکھ لو تم نے جلن وحسد میں اپنی اور اپنی بیٹیوں کی شخصیت تک خراب کی یہ تو اوپر والے کا احسان ہے جو میری بیٹیاں سنبھل گئیں نوشین کو عقل آ گئی۔''

''بس کریں اور کتنا مجھے میری نظروں میں گرائیں گے میں کب سے خود سنبھال رہی ہوں۔''

''تم سنبھالتی رہو گی اس وقت تک جب تک تم بھابھی سے عتیق بھائی سے معافی نہیں مانگو گی۔''

''ہاں ٹھیک کہہ رہے ہیں مجھے بھابھی سے معافی مانگنی ہی ہوگی ورنہ میں روز مرتی رہوں گی میں کبھی بھابھی سے خوش نہیں ہوئی۔''

''تم نے عتیق بھائی کو یہاں رکھ کے اور ظلم کیا۔''

''میرے تو آگ لگی تھی کسی طرح بھی بھابھی خوش نہیں رہیں۔'' راشدہ کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے دل سے اپنے جرم کا اعتراف کرنا دل ودماغ کو سکون پہنچا رہا تھا۔

''کسی کا کچھ نہیں بگڑتا ہے نقصان اپنا ہی ہوتا ہے۔ میں نے کبھی گھر پر اور اپنی بیٹیوں پر توجہ ہی نہیں دی۔'' وہ لب کچل رہی تھیں۔

رضوانہ نے تو کبھی کسی کے ساتھ برا ہی نہیں کیا تھا جب ہی آج وہ اتنی خوش اور آسودہ تھیں صبر کا دامن کبھی نہیں چھوڑا تھا۔

ان کے بچے اتنے لائق فائق اور تمیز دار تھے اتنا عرصہ باپ کے دور رہنے کے باوجود بھی وہ اپنے باپ سے عزت سے ہی ملے تھے اور اب تو عتیق احمد کا بھی وہ بہت خیال کرنے لگے تھے۔

''راشدہ! زندگی میں درگزر سے کام لیا کرو کبھی کسی پر یہ نگاہ نہیں رکھا کرو کہ کون کیا کر رہا ہے بلکہ اپنے اوپر نگاہ رکھا کرو تم کیا کر رہی ہو اور لوگوں کے ساتھ تم کیسا برتاؤ کر رہی ہو کیونکہ دوسروں کی خامیاں نکالنا آسان ہے اپنے اوپر خامیاں برداشت نہیں، اگر تم دوسروں کی خامیوں کو اگنور کرو گی تو تمہاری لوگ خامیاں اگنور کریں گے۔'' ذاکر صاحب انہیں بڑے مدبرانہ انداز میں سمجھا رہے تھے۔ راشدہ کو بھی عقل آ گئی تھی۔

☆......☆

ولیمے کے فنکشن کا سارا انتظام ایک خوب صورت سے ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ سارے انتظامات میں اشرف علی مصروف تھے۔ ہیثم بھی ان کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس کا تھک کے برا حال تھا۔ وہ اپنی کمر سیدھی کرنا چاہ رہا تھا۔ سر میں بھی بہت درد ہو رہا تھا ایسا لگ رہا تھا اسے بخار ہو رہا ہے۔

''چھوٹی مامی کسی سے کہہ کر میرے لیے چائے اور سلائس بنوا دیں۔'' ہیثم نے غور سے نہیں دیکھا کہ کچن میں شاہدہ نہیں نزہت ہیں۔

نزہت نے چونک کے اس کے تھکے تھکے وجود کو دیکھا وہ اپنے سر کو بھی دبا رہا تھا۔

''ہیثم......!'' انہوں نے اسے پکارا۔

لگتا تھا وہ لیٹنے کے لیے ہال کمرے میں جا رہا تھا۔ گھر کے سب ہی افراد ولیمے کی تیاریوں میں لگے تھے۔

"کیا ہوا ہیشم طبیعت خراب ہے؟"

نزہت کی آواز پر فوراً ہی مڑا تھا۔ نزہت کا ایسا شہد آگیں لہجہ......! سماعت اور بصارت یقین نہیں کر رہے تھے۔

"جی بس ایسے ہی۔" وہ نارمل انداز میں بڑے صوفے پر لیٹ گیا۔

"ادھر آؤ چیک کراؤ۔" انہوں نے اس کا ماتھا چھوا واقعی اسے ہلکا سا بخار تھا۔

"تم کیوں گئے، مہران اور فاران کو بلوا لیتے۔"

"ج...... جی۔" وہ تو جیسے سکتے میں آ گیا کتنے دنوں بعد بڑی مامی اپنے پہلے جیسے لب و لہجے میں اس سے بات کر رہی تھیں۔

"اٹھو چل کے اپنے کمرے میں آرام کرو۔" انہوں نے حکم دیا۔

"میرا کمرا تو چھوٹی مامی نے پتا نہیں کیوں لاک کروا دیا ہے۔"

"ہاں وہ تمہارے کمرے کی صفائی وغیرہ کروانی ہے۔" وہ جھٹ گویا ہوئیں۔

"روز ہی صفائی ہوتی ہے آج ہی کیا ضرورت پیش آ گئی۔" وہ جھنجلایا ہوا بھی ہو رہا تھا۔

"تم بابا جان کے کمرے میں چلے جاؤ کچھ آرام کر لو گے تو رات میں فریش رہو گے مریم اور خوشنما تو پارلر گئی ہیں۔" انہوں نے بتایا۔

ہیشم کو وہ پہلے جیسی فکر کرنے والی لگیں جب بھی وہ تھکا مارا گھر آتا تھا تو وہ اسی طرح کرتی تھیں۔

"نہیں میں اپنے کمرے میں ہی بہتر فیل کروں گا۔" وہ مرتضیٰ علی کے کمرے میں جانے سے انکار کرنے لگا۔

"ارے آج بابا جان کے کمرے میں چلے جاؤ۔" وہ اسے ڈپٹ کے گویا ہوئیں۔

ہیشم انہیں یہ بتانا بھی مناسب نہیں سمجھ رہا تھا کہ اس نے اپنی تیاری بھی کرنی ہے اس نے انگلینڈ جانے کی تیاری بھی کرنی تھی اس کی روانگی تین دن بعد کی تھی۔ اس نے یہی مناسب سمجھا تھا کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ جائے گا تو خوشنما کو اس کا احساس ہونے لگے گا۔

وہ اٹھ کر جانے لگا تھا کہ نزہت نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"بیٹھو ادھر، بات سنو میری۔" وہ چونک گیا بڑی مامی کے انداز میں پہلے جیسی اپنائیت تھی۔

ہیشم تو خود بھی بہت دن سے ان سے بات کرنا چاہ رہا تھا وہ جو اس سے ناراض اور اکھڑی رہتی تھیں

"ناراض ہو بیٹا؟"

"جی......؟" اس نے حیرانگی سے انہیں دیکھا۔

وہ بڑے پیار سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی بڑے صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔

"بیٹا ماں سے کبھی ناراض نہیں ہوتا۔"

"ماں چاہے اولاد سے ناراض رہے۔" ہیشم کے لب و لہجے میں شکوہ اور خفگی در آئی۔ اسے کتنا دکھ تھا بڑی مامی کے ایسے سرد رویے سے وہ اس کی طرف دیکھتی تک نہیں تھیں۔

''ہاں ٹھیک کہہ رہے ہو فاران سے بھی میں ناراض رہی مگر وہ مجھ سے ناراض نہیں رہا۔''

''وہ آپ کا سگا بیٹا ہے آپ نے اسے معاف بھی کر دیا جب کہ میری تو کوئی غلطی بھی نہیں تھی میں نے اپنی مرضی سے شادی بھی نہیں کی نانا جان کی مرضی سے ہنسی خوشی اس لڑکی سے شادی کر لی جو انہوں نے میرے لیے منتخب کی تھی۔'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولتا ہوا نزہت کو شرمندہ کر گیا۔

''مامی! آپ نے میرے ساتھ اور میری بیوی کے ساتھ ہمیشہ طنزیہ رویہ رکھا اس کا قصور یہ کہ وہ غریب گھر کی لڑکی ہے کیا غریب لڑکیوں کی کوئی عزت نہیں ہوتی؟''

''بیٹا میں تو......؟'' نزہت سے آگے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

وہ ٹوٹا اور بکھرا ہوا تھا۔

''فاران نے کسی لڑکی کو پسند کر لیا تو اس کی بھی ذمہ داری مجھ پر......! مامی میرا تو کوئی قصور نہیں۔''

''ہشم بیٹا! بس کرو میں خود کی ہی نظروں میں گر گئی ہوں۔'' ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میں پتا نہیں کیا کیا الٹی الٹی باتیں سوچنے لگی تھی۔''

''مامی! میں تو آپ کا اپنا تھا، آپ نے پھر بھی مجھے لمحے بھر میں پرایا کر دیا تھا۔ آپ نے خوشنما کی بھی اتنی بے عزتی کی اس کا کیا قصور تھا؟'' ہشم صاف گو قسم کا بندہ تھا وہ ان سے ساری باتیں کہنا چاہتا تھا۔ ''کسی کا غریب ہونا بہت بڑا گناہ ہوتا ہے؟''

''بیٹا! مجھے معاف کر دو پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔'' انہوں نے ہشم کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''پلیز مامی! ہاتھ جوڑ کے مجھے گناہ گار نہ کریں، میں آپ کی اولاد کی طرح ہوں اور اپنی ماں کو یوں ایسے ہاتھ جوڑتا نہیں دیکھ سکتا۔'' اس نے نزہت کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

''بس کرو بیٹا میں اپنی ہی نظروں میں گر چکی ہوں۔ تم تو میرے بچے تھے پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا تم پر ہی غصہ نکالتی رہی۔ کبھی بڑا بن کے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ مجھے بابا جان اور تمہارے ماموں جان نہیں سمجھاتے احساس نہیں دلاتے تو شاید میں اپنے بچوں سے دور ہی ہو جاتی۔'' انہوں نے ہشم کے ماتھے پر پیار کیا۔

''ہم بڑوں کو بھی چاہیے بچوں کی پرابلم کو سمجھیں ان کے دوست بن کے رہیں ہر بات کو شیئر کریں۔'' نزہت کو اپنی غلطیوں کا شدت سے احساس ہو گیا تھا۔

''تم سب میرے بچے ہو دیکھنا اب تم لوگوں کو اپنی ماں سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔'' انہوں نے مسکرا کے کہا۔

''مامی میں انگلینڈ جا رہا ہوں۔''

''کیا......!'' وہ حیران رہ گئیں۔

''میرے خیال میں یہ ضروری ہے۔''

''زیادہ الٹی سیدھی کوئی بات نہیں......! ابھی شادی ہوئی ہے تمہاری، میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔'' انہوں نے ڈپٹ کے کہا تھا۔

''ارے نزہت کب تک تیاریاں چلیں گی۔'' ارتضٰی علی وہاں چلے آئے تھے۔

انہوں نے ان دونوں کو یوں خاموش دیکھا تو چونک گئے۔

''خیریت تو ہے؟''

''سب خیریت ہے اسے سمجھا رہی تھی تھوڑا آرام کرے کیسا منہ نکل آیا ہے۔'' وہ بالکل ماؤں کے انداز میں گویا ہوئی تھیں۔

''نزہت یہ تم ہی ہو؟''

''جی میں ہی ہوں اور مزید شرمندہ نہ کریں۔'' وہ جھینپ گئی تھیں۔

''ماموں جان! بڑی مامی پہلے والی مامی کی طرح بن گئی ہیں۔'' وہ خوش ہو کر بتانے لگا۔

''شکر ہے یہ غلط فہمی کے بادل تو چھٹ گئے ورنہ جانے کتنے دن اور گزر جاتے۔''

''اچھا سنو مجھے اور بھی کام ہیں۔ ہشم جلدی جاؤ تم بھی تیاری کرو۔'' وہ اس کی پشت پر تھپکی دے کے آگے بڑھ گئی تھیں۔

''ارتضٰی علی اور ہشم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے تھے۔ سب کچھ ہی اتنا اچھا ہو گیا تھا ہشم کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ بس اسے خوشنما کی فکر تھی جو ابھی تک اسے معاف نہیں کر سکی تھی۔ سب ہی کتنے خوش تھے وہ بھی اگر اس سے راضی ہو جائے تو زندگی میں رنگ ہی آ جائیں۔

نانا جان کے روم میں وہ تیار ہوا تھا۔ مریم اور خوشنما بھی تیار ہو کے آ گئی تھیں۔ ہشم نے ابھی تک خوشنما کو نہیں دیکھا تھا۔

☆......☆

ذاکر صاحب نے ان سب کو رات کے کھانے پر بلایا تھا۔ نوشین، کرن اور نوین نے کھانے پر خاصا اہتمام کیا تھا۔ ذاکر صاحب نے راشدہ کی امی کو بھی بلایا تھا۔ راشدہ نے خود کو بہت ملامت کیا تھا۔ ذاکر صاحب نے سیدھی سچی اور کھری باتیں کر کے ان کے ضمیر کو جگا دیا تھا ورنہ وہ تو سمجھ رہی تھیں کہ کبھی انہوں نے سوچا نہیں تھا کہ وہ ٹھیک نہیں کر رہی ہیں اور آج رضوانہ نے انہیں معاف کر کے اپنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا تھا اپنی ساس سے بھی وہ ہمیشہ خوشدلی سے ملتی تھیں۔ ان کے ساتھ تو سب نے ہی برا کیا تھا۔ کسی سے بھی حرف شکایت ہونٹوں پر نہیں لائی تھیں۔

''آ جائیں مامی! آپ سب کھانا لگ گیا ہے۔'' نوین ان سب کو ڈرائنگ روم میں بلانے آئی تھی۔

آدم کی مسکراتی نگاہ اٹھی ضرور تھی مگر پھر مزمل کی کھانسی نے دوسری طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''گھر میں غصے والے بنے رہتے ہیں یہاں زبردستی مسکرا کے دیکھا جا رہا ہے۔'' مزمل نے اٹھتے وقت سرگوشی میں اسے چھیڑا تھا۔

''فضول مت ہانکا کرو۔''

سب ہی بڑے کمرے میں کھانے کے لیے جا رہے تھے۔ دستر خوان پر خاصا اہتمام تھا، نوشین تو آگے بڑھ بڑھ کے میزبانی نبھا رہی تھی۔ وہاں تو وہ ہنستی مسکراتی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

''بھابھی! آپ نے مجھے دل سے معاف کر دیا ہے یا نہیں؟''

''ارے رضوانہ بار بار بول کے شرمندہ کر رہی ہو۔'' رضوانہ نے انہیں گلے سے لگا لیا۔

''تم نے کچھ کیا ہی نہیں تو کیوں معافی مانگتی ہو۔''

''بھابھی آپ جتنا ظرف تو ہمارا کسی کا بھی نہیں ہے۔'' وہ رو رہی تھیں مگر ان کے یہ آنسو ندامت اور شرمندگی کے تھے۔

عتیق احمد بھی سر جھکائے بیٹھے تھے ان کی امی کی تو ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی کہ وہ کچھ بولیں کیونکہ رضوانہ کے ساتھ زیادتی کرنے میں ہاتھ انہی کا تھا بہو اور بیٹے کو الگ کرنے والی وہی یہی تھیں ان کے بچوں کو کبھی پیار ہی نہیں دیا۔

''ارے بھئی ہم لوگ یہاں مل بیٹھنے کے لیے آئے تھے۔ یہ کیا افسردگی کا ماحول کر دیا۔'' ضمران نے ماحول کی افسردگی کو دور کرنے کو کہا۔

''ضمران بیٹا یہ معافی تلافی بہت ضروری تھی کیونکہ بھابھی نے جو اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا اس کا ہم میں سے کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔'' ذاکر صاحب نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''ہاں ذاکر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ غلط تو میں ہی کرنے والی تھی بیٹے اور بہو کو میں نے ہی الگ کیا۔'' عتیق احمد کی امی نے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

عتیق احمد نے حیرانگی سے انہیں دیکھا کیونکہ ان کی ماں نے شروع سے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ کبھی انہیں سمجھا یا نہیں تھا۔

''مجھے کسی سے کوئی شکایت یا گلہ نہیں کیونکہ میرا شوہر میرے پاس آ گیا۔ میرے بچوں کو ان کے باپ کی شفقت مل گئی میں سب بھول گئی میری ہی کہیں غلطی اور گناہ ہوں گے جو مجھے سزا ملی۔'' رضوانہ نے ان سب کی شرمندگی مٹائی۔

''نہیں بھابھی! یہ تو آپ ہم سب کو معتبر کرنے کے لیے کر رہی ہیں۔'' راشدہ کی آواز بھرا گئی۔

''رضوانہ! مجھے بھی معاف کر دینا میں ہی اچھی ماں نہیں بن سکی اور تم سب سے اچھی ماں ہو جو شوہر کے ہوتے ہوئے بھی اس کی عدم توجہی کی وجہ سے اپنے بچوں کی اچھی تربیت کی چاروں بیٹوں کو ہمیشہ اچھی باتیں ہی سکھائی ہیں۔'' ان کی ساس نے ان کی اس خوبی کو سراہا۔

''مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔'' رضوانہ خود آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

''آج لگتا ہے کسی فلم کی اینڈ کی شوٹنگ ہو رہی ہو۔'' مزمل نے شوخی سے کہا تا کہ ماحول کی تلخی اور افسردگی ختم ہو جائے۔

''ارے بھئی بس بھی کریں ہمیں بور کر رہے ہیں آپ سب۔''

''بیٹا میں نے خود آج کا دن رکھا تھا تا کہ ساری تلخیاں اور غلط فہمیاں ہم سب دور کر لیں اب جب کہ ہمارے بچے آئندہ دنوں میں نئی زندگیاں شروع کرنے والے ہیں۔'' ذاکر صاحب نے کہا۔

کرن اس دوران سب کے لیے چائے لے آئی تھی۔

آدم تو ٹی وی والے روم میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا نوین اس کے سامنے جھجک رہی تھی۔

''کیا بات ہے میری شکل بہت ڈراؤنی ہے جو چھپ رہی ہو۔'' نوین کو اس نے مخاطب کیا جو اندر والے روم میں جا رہی تھی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ رک گئی۔

''آپ کے لیے چائے لاؤں؟''

''چائے چھوڑو، ادھر آؤ۔'' آدم بیٹھے سے کھڑا ہو گیا۔

''کیا کرتے ہیں سب اندر بیٹھے ہیں۔'' وہ گرمئی شوق سے گھبرا گئی۔

''میں تمہیں کھا تھوڑی جاؤں گا، بات تو سنو۔'' وہ آگے بڑھا۔
نوین بھاگنا ہی چاہتی تھی مگر آدم کی گرفت نے اسے روک دیا۔
''ویسے تو بہت بولتی ہو آج کیا ہوا؟''
''آپ کے سامنے نہیں بول سکتی۔'' وہ پنک کاٹن کے کپڑوں میں شرمائی گھبرائی پیاری لگ رہی تھی۔
''مگر مجھے تم سے کچھ کہنا ہے اور بہت ضروری تمہارا تھینکس۔''
''تھینکس کس لیے؟'' وہ حیرانگی سے پوچھنے لگی۔
''ابو کو سمجھانے کا، جو آج وہ ہمارے پاس آگئے کیونکہ آج یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ہے کہ ہم سب یوں مل گئے۔'' آدم نے دل سے اس کی ان اچھائیوں کو سراہا تھا۔
''مجھے بھی یہ سب کرنے پر جو اکسایا آپ کے سرد اور ناگوار رویے کی وجہ سے کیونکہ آپ ہم سب سے اسی لیے اکھڑے اکھڑے رہتے تھے۔'' اس نے آدم کی آنکھوں میں دیکھا۔
''وہ تو میں بس ایسے ہی۔'' وہ خجل ہوا۔
''امی نے، نانی جان نے، ماموں جان نے آپ سب کے ساتھ غلط کیا اور انہیں جگانا بہت ضروری تھا۔'' وہ بول رہی تھی۔
پیچھے سے حباب کے کھنکارنے کی آواز پر دونوں ہی اچھل گئے۔
''واؤ......تم دونوں تو بات بھی کرتے ہو۔''
''کیوں ہم بات نہیں کر سکتے۔'' آدم جھینپ گیا۔
''میں تو یہی سمجھتی تھی تم دونوں کبھی بات ہی نہیں کرتے ہوگے۔''
''بھابھی! نوین کو بتا دیں آدم بھائی انہیں فیشن اور میک اپ کی دکان کہتے ہیں۔'' مزل نے پیچھے سے ہانک لگائی۔
''کیا!'' نوین غصے سے چونک گئی۔
''ارے وہ تو مذاق میں کہتا تھا۔'' حباب نے ہی وضاحت دی۔
''آپ بھی تو آدم خور بنے رہتے تھے۔'' نوین نے بھی حساب برابر کیا۔
زبردست قہقہہ لگا مزل اور آدم کا۔ ضمران طلحہ اور نوشین بھی آگئے تھے۔ اتنے میں رضوانہ کے جیٹھ جٹھانی اپنی فیملی کے ساتھ آگئے تھے۔ گھر میں پھر ایک رونق اور محفل سج گئی تھی۔
اندر طلحہ کے رشتے کی بھی باتیں ہو رہی تھیں مگر ابھی یہ نوجوان پارٹی کو نہیں بتایا گیا البتہ حباب کو اندر بلایا گیا تھا۔
''نوشین تم تو بھئی امریکہ فلائی کر جاؤ گی۔'' آدم نے مسکرا کے کہا۔
''میں اکیلی نہیں کرن بھی۔'' وہ مسکرا کے بولی تھی۔
''ویسے ایک بات بتاؤ تم نے میک اپ کرنا کیوں چھوڑ دیا ہے؟'' آدم چہرے پر سنجیدگی طاری کر کے گویا ہوا۔
مزل اور نوین کی ہنسی چھوٹ گئی کیونکہ وہ دونوں اس کی شرارت سمجھ گئے تھے۔
''بدتمیز شرم آنی چاہیے بڑی ہوں تم سے مذاق اڑاتے ہو۔'' اس نے آدم پر کشنز برسانے شروع

کر دیئے تھے۔ ان سب کا ہنس ہنس کر برا حال تھا۔

☆......☆

ولیمے کا فنکشن شاندار تھا جو سب سراہ رہے تھے۔ اسٹیج بھی اصلی پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ بڑی سی روش پر کارپٹ اور سائیڈوں پر پھولوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ برقی قمقموں سے پورا ہال جگمگا رہا تھا۔

نزہت اور شاہدہ مہمانوں کو ریسیو کر رہی تھیں۔ کافی لوگ مدعو تھے۔

مریم اسٹیج پر بیٹھی تھی اور اسے سب ہی گھیرے ہوئے تھے۔ خوشنما دلہن بنی سب سے مل رہی تھی۔ ابھی تک ہیثم اور اس میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی وہ دور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گولڈن اور فان کلر کا لہنگا اس پر میچنگ طلائی جیولری اور میک اپ میں وہ حسین شہزادی لگ رہی تھی۔ سب ہی تعریفیں کر رہے تھے۔

اس کے میکے سے بھی لوگ آ گئے تھے جن کو نزہت نے بڑے پرتپاک انداز میں ویلکم کہا تھا۔

رمنا تو حیران رہ گئی تھی۔

''ارے یہ ہیثم بھائی کی ممانی تو بدل ہی گئی ہیں۔ اتنے اچھے لہجے میں ہم سے بات کی ہے مجھے تو یقین ہی نہیں آیا۔'' رمنا نے ایمن سے سرگوشی میں کہا تھا۔

جاوید احمد کو مرتضیٰ علی نے بلا لیا تھا وہ لوگوں سے ان کا تعارف کروا رہے تھے۔

''آپی کدھر ہیں نظر ہی نہیں آ رہیں۔'' ایمن اسے ہی ڈھونڈنے کے لیے پوری گیدرنگ میں نگاہ دوڑانے لگی تھی۔ ارے یہ کیا ہیثم بھائی کے ساتھ کچھ لوگ ادھر ہی آ رہے تھے۔'' ایمن سنبھل کے بیٹھ گئی تھی۔

''رمنا مجھے لگ رہا ہے اشعر بھائی کی فیملی ادھر ہی آ رہی ہے۔''

''کہاں...... کہاں۔'' وہ تو گھبرا گئی۔

اتنے میں وہ لوگ واقعی ادھر ہی آ گئے تھے۔ ثمینہ سے ان سب نے سلام دعا کی تھی۔ رمنا تو گھبرائی شرمائی ہو رہی تھی۔ اشعر کی ایک پرشوخ نگاہ نے اس کا طواف کیا تھا وہ پرپل سوٹ میں لائٹ میک اپ کے ساتھ پیاری لگ رہی تھی۔ اشعر کی امی اور بھابھی بھی تھیں۔

''آنٹی یہ اشعر کی بھابھی ہیں اور یہ اسفر بھائی ہیں۔'' ہیثم نے تعارف کروایا۔

''اشعر لڑکی تو پیاری ڈھونڈی ہے۔'' بھابھی نے رمنا کی تعریف کی وہ جھینپ گئی۔ اشعر کے بھائی اور بھابھی اس کی امی سے معافیاں مانگ کے ان کے پاس ہی آ گئے تھے اور یہ اشعر کے لیے خوشی کی بات تھی اس نے ہیثم کو کال پر بتا دیا تھا۔

''ہیثم! اپنی بیگم سے تو ملوا دو۔'' بھابھی کو خوشنما سے ملنے کی بھی بے چینی تھی۔

''جی، کیوں نہیں۔'' وہ اسے بلانے کے لیے چل دیا۔ ابھی تک اس نے خوشنما سے بات نہیں کی تھی۔

وہ اسے نزہت مامی کے ساتھ نظر آ گئی تھی۔

''تمہاری امی اور بہنیں بلا رہی ہیں۔''

''وہ کدھر ہیں؟'' خوشنما انہیں ہی تلاش کر رہی تھی۔

''آؤ چلو۔''

ہیثم کو وہ اپسرا کوئی شہزادی ہی لگ رہی تھی۔ ہر ایک کی نگاہ ان پر اٹھ رہی تھی۔ ہیثم بلیک ڈنر سوٹ میں ڈیشنگ اور ڈیسنٹ لگ رہا تھا۔ مووی کیمروں کی اسکرین مختلف راہداریوں پر لگی تھیں ہر کوئی نمایاں ہو رہا

تھا۔

"یہ ہیں ہماری بیگم۔" ہیشم نے شوخی سے کہا۔ بھابھی تو گلے ہی لگ گئی تھیں ثمینہ نے بھی خوشنما کو گلے لگا کے پیار کیا۔

"آپی آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔" ایمن نے اس کے کان میں کہا تھا۔

اشعر کی امی نے بھی اسے ڈھیروں پیار کیا اور دعائیں دی تھیں۔

اتنے میں فاران نے ان دونوں کو فوٹو سیشن کے لیے بلا لیا۔

"یار! میں بالکل نہیں تم اور مریم اپنا کرواؤ۔"

"زیادہ بکواس نہیں کرو۔" فاران نے زبردستی ان دونوں کو گھیر کے ان کا بھی فوٹو سیشن کروایا۔

خوشنما پورا وقت ہی شرمائی شرمائی رہی کیونکہ رومینٹک پوز کا اس نے تو تصور بھی نہیں کیا تھا ہیشم کو اسے دیکھتے رہنا اچھا لگ رہا تھا۔ خوشنما کا چہرہ چمک رہا تھا۔

ڈنر کے بعد لوگ آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے تھے۔ مریم کی طرف سے اس کی خالہ کی فیملی ہی آئی تھی اور کوئی تو اس کا عزیز رشتے دار نہیں تھا۔ شاندار اور پر وقار تقریب کا اختتام رات گئے ہی ہوا تھا سب ہی تھکے تھکے اپنے اپنے کمروں میں جا رہے تھے۔

خوشنما کو اپنا یہ وزنی ڈریس سنبھالتے ہوئے چلنا مشکل لگ رہا تھا۔

"ہیشم بھائی! آپ بھابھی کو پکڑ کے لے جائیں دیکھیں سیڑھیاں چلنا تک مشکل ہو رہا ہے۔" جوہم سے رہا نہیں گیا تو وہ بول پڑی۔

"تمہیں اگر زیادہ خیال ہے تو تم لے جاؤ۔" وہ اپنے ہاتھ پیروں کو ڈھیلا چھوڑ کے ہال کمرے میں ہی صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

"میں چلی جاؤں گی۔" خوشنما نے جھٹ کہا وہ سمجھ رہی تھی ہیشم زبردست ناراض ہے۔

"بھابھی! آپ چلیں میں چلتی ہوں۔" اس سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

"ہاں بھئی مکھن لگاؤ پتا ہے نا اشعر کی بھابھی نے تمہیں اپنے بھائی کے لیے پسند جو کر لیا ہے۔"

"ہیشم بھائی ایسی بھی بات نہیں ہے۔" وہ جھینپ گئی۔ اشعر کی بھابھی کو جوہم پسند آ گئی تھی انہوں نے جھٹ نزہت سے کہہ بھی دیا تھا۔

"جو بھی بات ہو۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

خوشنما ہیشم کے ایسے شوخ انداز کو حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔

"اے لڑکے ادھر کیوں بیٹھا ہے اٹھو اپنے کمرے میں جاؤ۔" نزہت نے اسے ڈپٹ کے کہا۔ وہ ہڑبڑا کے رہ گیا جوہم، خوشنما کو اوپر تک چھوڑ آئی تھی۔

"وہ مامی......! جا ہی رہا تھا۔" وہ اٹھا۔

"مامی! اشعر کی بھابھی نے آپ سے جوہم کے لیے بات کی ہے؟"

"ہاں کی ہے میں نے کہا تھا جب مناسب لگے وہ آ جائیں۔" نزہت کو جوہم کی فکر تھی یہ بھی ان کی فکر دور ہوئی تھی۔

"تم جاؤ شاباش۔" وہ ہیشم کو توجہ اور پیار دے رہی تھیں جو وہ اتنے دن اس سے بے رخی برت چکی تھیں۔

سب کچھ ہی اچھا ہو گیا تھا اور ہیشم کو بھی جو ہم کی فکر تھی وہ کسی طرح تو سرخرو ہوا۔
سوچتا ہوا اندر آیا تو وہاں کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پورا بیڈ روم اصلی پھولوں سے سجا ہوا تھا۔
اسے اب سمجھ آیا تھا اسے بیڈ روم سے بے دخل کر کے کیا کیا ہو رہا تھا۔
اسے یہ سب دیکھ کر غصہ ہی آ گیا جب اس کی بیوی کو اس کا ہی خیال نہیں تو ان سب چیزوں کی بھی ضرورت کیا ہے اسے ایسا لگ رہا تھا یہ سب سجاوٹ اس کا دل جلا رہی ہو، اس نے اس وقت خود پر کنٹرول ہی رکھا کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے خوشنما اس سے اور زیادہ بدظن ہو جائے اور پھر ویسے بھی اس نے ان سب باتوں کا حل بھی تو تلاش کر لیا تھا اسے کچھ عرصے کے لیے منظر سے غائب ہونا تھا، شاید خوشنما کو اس کا خیال آ جائے، وہ ایسی زندگی سے تھک گیا تھا وہ بھی نارمل زندگی گزارنا چاہتا تھا جہاں صرف اور صرف خوشنما ہو اور وہ اس کا خیال رکھے، وہ تو کب سے محبت اور پیار کے لیے ترسا ہوا تھا اس نے پہلی دفعہ کسی کو اتنا چاہا تھا اور چاہا بھی اسے جو اس کی بیوی تھی اسے تو اس بات کی بھی حیرانی تھی جیسے وہ اس کے دل میں جگہ بنا تی گئی۔ ورنہ تو اس نے پہلی رات جو اس کے ساتھ سلوک کیا تھا وہ کوئی لڑکی بھی برداشت نہیں کرتی اور نہ ہی اس کے گھر والوں نے اسے ہمیشہ عزت ہی دی تھی اور اب تو اسے دل وجان سے عزیز رکھتے تھے۔
بس خوشنما تھی جو ابھی تک اسے معاف نہیں کر سکی تھی۔
کیسا اس کے اندر سے دل ٹوٹ گیا تھا پورا وقت فنکشن میں وہ بے دلی سے ہی رہا تھا۔ بظاہر خوشنما سب کے سامنے بہت خوش نظر آ رہی تھی ورنہ حقیقت میں وہ اس کے ساتھ کب خوش تھی۔
"کیا زندگی میری ایسی ہی بے مصرف گزرے گی۔" وہ سوچتا ہوا وارڈروب کی طرف بڑھ گیا تھا اسے اس فارمل سے ڈریس سے آزاد ہونا تھا وہ ذہنی اور جسمانی طور پر خود کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا، اس نے یہ بھی دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ستمگر کیا کر رہی ہے اور کدھر ہے پورا بیڈ ہی پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔
وہ چینج کرنے واش روم میں چلا گیا تھا۔
خوشنما نے کافی دیر تک اس کے پرسوچ چہرے کو بغور دیکھا تھا اور اسے اچھی طرح اندازہ تھا وہ اسے ہی سوچ رہا تھا۔
خوشنما کو اس کا خیال بھی آ رہا تھا وہ اپنی ساری مصنوعی ناراضی دور پھینکنا چاہتی تھی۔ اس نے بہت دن ہیشم کا امتحان لے لیا تھا۔ وہ ذرا بھی اس کے رویے سے اکتایا نہیں تھا بلکہ اسے پکا یقین تھا ایک دن وہ اسے ضرور معاف کرے گی۔
اس نے ابھی تک اپنے کپڑے چینج نہیں کیے تھے اس کا بھی دل چاہ رہا تھا ہیشم اس کے روپ کی تعریف کرے، آج اس کو بہت احساس ہو رہا تھا پورے فنکشن میں فاران اور مریم کتنے خوش تھے اور فاران کیسے اس کا خیال کر رہا تھا۔ محبت انسان کو کتنا بدل دیتی ہے۔
اور خوشنما بھی خود کو بھی تو بدلا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ وہ چاہ کر بھی ہیشم سے نفرت نہیں کر سکی تھی۔ اولین شب کی بے عزتی کے باوجود بھی وہ اسے چاہنے لگی تھی شاید اس لیے کہ ہیشم نے اپنی ساری غلطیوں کے اعتراف جو کیے تھے اور اپنی محبت کا بار بار اظہار کر کے یقین دلایا تھا۔
واش روم کا دروازہ کھٹ سے بند ہوا تو وہ اچھل گئی۔
"یہ ہے کدھر جو مجھے نظر نہیں آ رہی ہے۔" ہیشم کو اس کا خیال آیا۔

بیڈ کے اندر جھانکا وہاں بھی نہیں تھی۔
خوشنما سمجھ گئی وہ اسے ڈھونڈ رہا ہے وہ اور پردوں کی سائیڈ پر ہوگئی جہاں ٹی وی ٹرالی پر رکھا تھا۔
اب ہیشم ڈرائنگ روم کے پورشن میں آ گیا وہ اسے نظر آ ہی گئی۔
"ادھر کیوں کھڑی ہو؟" وہ اس کے ماورائی حسن میں کھونے لگا۔
"وہ میں یہ ٹھیک کر رہی تھی۔" زبردستی ٹی وی کی ٹرالی پر ہاتھ مارنے لگی۔
"جھوٹی مجھے بنا رہی ہے انا کا جھنڈا اونچا رکھے گی جھکے گے نہیں، میں بھی دیکھتا ہوں کب تک۔" وہ مڑ گیا۔
خوشنما لمبی سانس بھر کے رہ گئی۔ یعنی وہ اسے ایسے روپ میں دیکھ کر بھی نہیں چونک رہا تھا۔
وہ بیڈ سے سارے پھولوں کی لڑیوں کو ہٹانے لگا۔
"یہ کیا کر رہے ہیں؟" وہ اپنا لہنگا دونوں ہاتھوں سے سنبھالتی ہوئی آگے آئی۔
"نظر تو آ رہا ہو گا کیا کر رہا ہوں۔"
"مگر کیوں کر رہے ہیں بڑی مامی نے سجوایا تھا۔"
"غلط کمرے میں سجوا دی اسے صرف فاران کے روم میں ہی سجنا تھا، کیونکہ وہ محبت کرنے والوں کا ملن وہاں ہوا ہے یہاں تو ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے۔" اس نے سب کچھ اتار کے نیچے ڈال دیا۔ خوشنما لب کچلنے لگی وہ اس کے غصے کو سمجھ رہی تھی۔
"میں کون سا تم سے پیار کرتا ہوں۔" وہ ایزی سے سیلٹی کلر کے قمیض شلوار میں ملبوس ڈیشنگ لگ رہا تھا۔
"میں لاکھ یقین دلاتا رہوں تم میرے ساتھ یہی سلوک کرو گی، مجھے ایسی پھولوں کی سجاوٹ چاہیے بھی نہیں۔" وہ بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔
"ظالم! آج تو اتنی حسین لگ رہی ہے کہ دل کر رہا ہے صرف اپنی کروں اسے کہیں نہیں جانے دوں۔" آنکھ بند کر کے وہ حسرت بھری آہیں بھر رہا تھا۔
"میں پرسوں روانہ ہو رہا ہوں۔"
"کہاں؟" وہ چونک گئی۔
"انگلینڈ کا وزٹ ہے وہاں کچھ میٹنگز ہوں گی پتا نہیں کب واپسی ہو تم اپنے امی ابو کی طرف چلی جانا تمہیں ویسے بھی میری ضرورت تو ہے ہی نہیں اس لیے بے کار لوگوں کو چلے جانا چاہیے۔"
خوشنما تو حواس باختہ ہی ہوگئی یہ ہیشم کیا کہہ رہا تھا ایسا ردعمل وہ تو صرف تنگ کر رہی تھی۔
"میں زبردستی تمہیں باندھ کے رکھنا نہیں چاہتا تمہارا جو فیصلہ ہو مجھے بتا دینا۔" وہ بالکل سپاٹ لہجے میں بول رہا تھا اور اس کی طرف دیکھنے سے بھی اجتناب برت رہا تھا۔
"کیسا فیصلہ؟" اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ اس کے قریب بیڈ پر ہی آ گئی۔
"فیصلہ تم سمجھتی ہو اس زبردستی کے رشتے میں خود کو باندھ کے رکھنا خود کو اذیت دینا ہے۔" ہیشم کو اندازہ ہو گیا تھا اس کی دنیا ڈول گئی ہے۔
"ہاں اب لگا ہے تیر نشانے پر مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا محترمہ اتنی جلدی گھبرا جائیں گی۔" وہ اس کی

کیفیت سے محظوظ ہونے لگا۔

''پلیز لائٹ وغیرہ آف کر دینا، مجھے نیند آ رہی ہے کل مجھے ویسے ہی بہت کام ہے۔'' وہ کروٹ لے کے لیٹ گیا۔

''آپ ایسے کیسے کر سکتے ہیں میرے ساتھ۔''

''جو تم چاہتی ہو ویسا ہی کر رہا ہوں، اس میں بھی تمہیں اعتراض ہے، میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے، بے عزتی کی جانے کیا کیا مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں تو اس کی سزا ہے کہ تمہیں اور مجھے الگ ہو جانا چاہیے۔'' وہ بولے جا رہا تھا خوشنما کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

''اپنا فیصلہ صبح تک سنا دینا گڈ نائٹ۔'' وہ پھر چپ ہو گیا۔

خوشنما اس کی پشت کو دیکھے گئی۔ وہ اتنا رنجور اور ملول ہو گیا تھا کہ فیصلے کا اختیار بھی اسے سونپ دیا وہ کوئی زبردستی نہیں کر رہا تھا مگر خوشنما یہ سب نہیں چاہتی تھی وہ اسے چاہتی تھی۔

☆......☆

حسین بیگم اپنے سونے کی جیولری کا باکس بینا کو دے رہی تھیں۔

''اماں! آپ یہ کیا کر رہی ہیں؟'' بینا تو حیران تھیں۔

''رکھ لو اسے یہ میں ارومہ کے لیے دے رہی ہوں اس کی شادی پر دینا۔''

''اماں! اس پر ارومہ کا اور میرا کوئی حق نہیں ہے۔'' وہ حسین بیگم کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔

''ایسی باتیں نہیں کرو، میں نے اپنے زیور میں سے حصے بنا دیئے ہیں کچھ چیزیں اکرام کی بیٹی کی شادی کے لیے دے دی ہیں اور کچھ میں نے شہریار کے بچوں کے لیے نکال دیا ہے۔ وہ جب یہاں آئے گا میں وہ اسے دے دوں گی۔ ناہید کو بھی میں نے دے دیا ہے ایک تو وہ رہتی ہی الگ الگ ہے۔ پتا نہیں شادی کے بعد سے کیسی ہو گئی ہے۔''

''اماں! آپ اس طرح کیوں کر رہی ہیں زیورات کا تو آپ کو شوق ہے، ابا نے بھی آپ کو ہمیشہ اچھا ہی پہنایا ہے۔'' بینا تو حیران تھیں اچانک سے حسین بیگم میں ایسی تبدیلی کیونکر آئی ہے۔

''تمہارے باپ کے زمانے کے شوق تھے اور میں سمجھتی ہوں مجھے اپنے مزاج میں بردباری لانی چاہیے شہریار ٹھیک ہی کہتا ہے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔'' ان کے چہرے پر کچھ افسردگی بھی لگ رہی تھی۔

''آپ نے شہریار کی باتوں کو کیوں دل پر لے لیا ہے۔'' بینا گویا ہوئیں۔

''یہ بات نہیں ہے میں نے کچھ سوچا اور سمجھا ہے میری عمر اب ان باتوں کی نہیں ہے جوانی میں میں نے جو کیا سو کیا فلم لائن میں جانا چاہتی تھی کچھ لوگوں نے ہی خوب صورتی کا ایسا احساس دلایا کسی کو خاطر میں ہی نہیں لیا۔'' حسین بیگم نے اپنے ماضی کی باتوں کو بھی یاد رکھا ہوا تھا۔

''وہ سب تو آپ کا پہلے ہی چھوٹ گیا تھا۔'' بینا کو بھی ایسا لگا کہ حسین بیگم اسے بھی احساس دلا رہی ہیں۔ زندگی میں بردباری لاؤ اور وہ تو کب سے سنجیدہ اور خاموش ہو گئی تھیں۔ لوگوں کی ناگواری والی نگاہوں کو انہوں نے جب سے محسوس کیا تھا اور پھر ارومہ نے بھی تو رو رو کے شکوہ کر کے احساس دلایا تھا۔

''امی! اب تو میری طرف دیکھیں کیوں اپنا اور میرا نقصان کرتی ہیں۔ حباب کو بھی یہی احساس مارے ڈالتا ہے اس کی سسرال میں لوگ یہ طعنہ نہیں دیں جیسی ماں ویسی بیٹی ہے انہوں نے یہ بات تو کبھی سوچی ہی

نہیں لوگ ان کی بیٹیوں کو ان کی وجہ سے طعنے بھی دے سکتے ہیں ان کی دونوں ہی بیٹیاں اتنی حساس تھیں اس کا تو اندازہ انہیں اب ہوا تھا۔ اپنی گزشتہ زندگی میں کیا تھا نہ پہلے سے نبھاہ کیا نہ دوسرے نہ ہی تیسرے سے اور ابھی بھی اپنے ہی چکر میں رہتی تھیں۔

''نہیں وہ ایسا حوالہ نہیں بنیں گی اپنی بیٹیوں کو ایسی باتیں نہیں سننے دیں گی۔ اگر اروما ان کے ضمیر کو نہیں جھنجھوڑتی تو شاید وہ ایسی ہی زندگی گزارتی رہتیں شکر ہے انہیں جلد احساس ہو گیا تھا نماز پڑھ کے اپنے رب سے خطاؤں کی غلطیوں کی معافی مانگی تھی۔

''وہ سب بھی میری بے وقوفی تھی شریف لڑکیوں کی یہ حرکتیں ہوتی ہیں جو فلم لائن میں جانے کا سوچ رہی تھی میں۔'' وہ بولیں۔

بینا نے چونک کے پہلو بدلا۔

''اماں! ان باتوں کو چھوڑیں اور نہ ہی ڈسکس کریں آپ شکر کریں آپ کی ابا سے شادی ہوئی۔ انہوں نے آپ کو پرآسائش زندگی دی آپ کو ضرورت بھی کیا تھی فلم میں جانے کی۔''

''ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو ہر لڑکی کو آسائش چاہیے ہوتی ہے۔ میں نے آسائشوں کے لیے ایسا سوچا میری سوچ غلط ہی تھی۔'' انہیں اپنی بے وقوفیاں بھی یاد آ رہی تھیں۔

''میکے میں صرف ماں اور ایک بھائی تھا وہ بھی انڈیا میں تھا۔ ماں کا تو ایک عرصہ ہوا انتقال ہوئے۔ بھائی کا پتا ہی نہیں تھا نہ ہی وہ کبھی پلٹ کے انڈیا ہی گئی تھیں۔

''اچھا یہ ڈبہ اٹھا کے رکھ اور مجھے چائے بنا دے۔'' وہ تھکن محسوس کر رہی تھیں بینا کے بیڈ پر ہی لیٹ گئی تھیں وہ صبح سے ان کے گھر آئی ہوئی تھیں۔

''آج آپ یہیں رک جائیں۔''

''ہاں میں یہیں ہوں کل جاؤں گی۔'' وہ گویا ہوئیں۔

بینا چائے بنانے چلی گئی تھیں، اروما بھی شاید سو گئی تھی اس کے کمرے کی لائٹ آف تھی۔

بینا بار بار شکر ادا کر رہی تھیں وہ جلد سنبھل گئی تھیں وہ اپنے اور اروما کے ساتھ زیادتی ہی کر رہی تھیں اور شکر تھا حباب کی سسرال اچھی تھی سب نے اسے عزت سے رکھا ہوا تھا۔

انہیں اروما کی فکر تھی اس کا بھی کہیں اچھی جگہ رشتہ ہو جائے تو وہ شکر ادا کریں۔ اکرام کا زین اروما سے ایک سال چھوٹا تھا ورنہ وہ تو چاہتی تھیں اپنے بہن بھائی میں ہی اس کا رشتہ ہو جائے تو اچھا ہے۔ بینا خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھیں یہ تبدیلی ان میں ہی نہیں حسین بیگم میں بھی آ چکی تھی اپنی غلطی کا اعتراف کر کے انسان کتنا ہلکا محسوس کرتا ہے۔

دوسرے دن ہی رضوانہ، حباب اور ضمران کے ساتھ چلی آئی تھیں حسین بیگم اپنے گھر جانے کی تیاری کر رہی تھیں ان لوگوں کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ پھر رضوانہ نے اپنا مدعا بھی بیان کر دیا تھا۔

حسین بیگم اور بینا تو ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگیں جیسے انہیں یقین نہیں آیا ہو۔

''بینا بہن! یہ میری خوش نصیبی ہو گی کہ آپ کی دوسری بیٹی بھی ہمارے گھر کی بہو بنے۔'' بینا کی انجانے میں کی گئیں دعائیں اس طرح مستجاب ہوں گی وہ اوپر والے کا شکر ادا کرنے لگیں۔

''دیکھیے آپ انکار تو بالکل نہیں کر سکتی ہیں کیونکہ حباب کا پتا ہے وہ آپ کو بتاتی ہو گی ہمارے گھر کا۔''

ضمران نے حباب کی جانب تائیدی دیکھا۔

"ارے کچھ غلط تو نہیں بتاتی تھیں۔"

"کیا ہو گیا ہے ایسی کوئی الٹی باتیں نہیں کرتی میں سب کو پتا ہے میں سسرال میں بہت خوش ہوں۔" حباب نے جھٹ وضاحت دی۔

"آنٹی! پھر اسی بات پر آپ کو طلحہ کا رشتہ قبول کرنا پڑے گا۔" ضمران کو زیادہ ہی جلدی تھی رضوانہ مسکرانے لگیں۔

"مگر وہ میں......"

"بینا! اس میں سوچنے کی کیا بات ہے بچے سارے ہمارے دیکھے ہوئے ہیں پھر ہماری حباب وہاں بیاہ کے گئی ہے وہ خوش ہے رضوانہ اسے قدر سے رکھ رہی ہیں۔" دونوں بہنیں ایک دوسرے کا خیال تو کریں گی۔"

"آپ سوچ لیں ہم زبردستی نہیں کر رہے لیکن ہماری یہ خواہش اور خوشی ہے آپ کی دوسری بیٹی بھی ہمارے گھر آئے۔" رضوانہ نے سہولت سے کہا۔

"امی! آنٹی کی انکار کی گنجائش ہی نہیں بنتی حباب یہ مٹھائی کا ڈبہ کھولو اور ہم سب کا منہ میٹھا کرواؤ۔" ضمران نے تو گویا انہیں آگے سے کچھ بولنے ہی نہیں دیا۔ حباب نے سب کا ہی منہ میٹھا کروایا۔

بینا کو انکار کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔

حسین بیگم کو بھی لگا جیسے ایک فکر تھی وہ بھی ختم ہوئی۔

حباب ارومہ کو لے آئی تھی وہ حیران پریشان شرمائی شرمائی اور گھبرائی ان سب کے درمیان تھی۔ رضوانہ نے اس کا بھی منہ میٹھا کروایا اور ہاتھ میں چند ہزار کے نوٹ رکھے۔

"بینا! بہن آج سے یہ بھی ہماری بیٹی ہوئی۔"

"طلحہ کے ایم بی اے کے دو سال ہیں ہم چار سال کا ٹائم رکھتے ہیں طلحہ بھی اسٹیبلش ہو جائے گا اور ارومہ کا بی اے بھی کمپلیٹ ہو جائے گا۔"

"جی جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" بینا نے رضامندی دے دی تھی۔

"بھئی بہت بہت مبارک ہو مجھے تو بہت خوشی ہے۔" حسین بیگم بہت خوش تھیں۔

بینا نے ان سب کے لیے چائے کے ساتھ ریفریشمنٹ کا بھی انتظام کیا۔

ارومہ تو اندر بھاگ لی تھی حباب اسے چھیڑے جا رہی تھی۔ حباب کو ارومہ کی بھی فکر تھی اپنی بہن سے وہ بہت محبت کرتی تھی اسے یہ خوشی تھی وہ اس کے ہی سسرال میں آ رہی تھی اسے پتا تھا شہریار سنے گا تو بہت خوش ہو گا۔

☆......☆

اشعر کی بھابی دوسرے دن ہی شام میں چلی آئی تھیں۔ اپنے بھائی کو بھی ساتھ لائی تھیں۔ انہیں جو ہم اتنی پسند آئی تھی نزہت سے ہاں کروا کے ہی گئی تھیں مگر اس دوران ہیشم کا کچھ پتا نہیں تھا وہ صبح سے ہی کہیں نکلا ہوا تھا۔ شام بھی گزر رہی تھی کتنی کالز کر چکی تھی اس کا سیل بھی سوئچ آف جا رہا تھا۔ رات سے وہ انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ اس سے بالکل ہی وہ بائیکاٹ کر کے جا رہا تھا۔ وہ ایسا تو بالکل نہیں چاہتی تھی۔

"کہاں چلے گئے ہیں کیا کروں؟" نازک نرم و ملائم گورے گورے ہاتھوں میں حنائی رنگ اور کھل کے اس کے ہاتھوں کو خوب صورت بنا رہا تھا۔ پنک کاٹن کے دھاگوں کی ایمبرائیڈری والے لباس میں پریشان

پریشان کب سے نزہت کی نظروں میں تھی۔

''خوشنما بیٹا کیا بات ہے۔'' وہ اسے بغور دیکھنے لگیں۔

''ہیشم صبح سے گئے ہوئے ہیں آئے ہی نہیں کوئی رابطہ بھی نہیں ہو رہا ہے۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''کچھ بتا کے بھی نہیں گیا۔'' انہیں بھی تشویش ہوئی۔

''صبح جلدی میں تھے میں نے پوچھا بھی کہنے لگے آجاؤں گا جلدی۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا تم پریشان نہیں ہو میں فاران سے کہتی ہوں شاید اسے کچھ پتا ہو سکتا ہے کہیں ضروری کام سے گیا ہو۔'' وہ خوشنما کی باتوں سے اندازہ لگا چکی تھیں۔ ہیشم نے اسے اپنے جانے کا شاید نہیں بتایا ہے وہ اسی سلسلے میں کہیں نکلا ہوگا۔

''تم پریشان نہیں ہو، جاؤ ذرا مریم کو دیکھ لو وہ فاران کے کسی دوست کے گھر ڈنر پر جا رہی ہے تم کپڑوں کو سلیکٹ کرنے میں مدد کر دو۔'' وہ اس کا دھیان بٹانے کو بولیں۔

وہ سر ہلاتی ہوئی ان کے حکم کی تعمیل کے لیے چلی گئی مگر اس کا ذہن و دل الجھا ہوا تھا نانا جان سے بھی کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

وہ مریم کے کپڑوں کی سلیکشن کروا کے خود پھر اپنے بیڈروم میں آ گئی۔

وہ اشعر کو بھی کال کر کے اس کا پوچھ چکی تھی جب کہ اشعر اپنی بھابی کے ساتھ شام میں ہی گھر آیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بھی وہ کئی دفع کال کر کے پوچھ چکی تھی۔ وہ ہیشم کے غصے کو خوب اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ وہ اسے کسی طرح بھی جانے نہیں دینا چاہتی تھی چاہے اس کے لیے اس کے آگے اپنا آپ جھکانا ہی کیوں نہ پڑ جائے، پھر میاں و بیوی میں انا تو ہوتی ہی نہیں ہے۔

وہ تو محض ہیشم کو تنگ کر رہی تھی۔ اسے تو اندازہ نہیں تھا کہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

مغرب کی اذانوں کی آواز آ رہی تھی، وہ وضو کرنے اٹھ گئی نماز پڑھ کے اس نے خوب دعائیں مانگیں برے برے خیالات کو جھٹک رہی تھی۔

بڑے ماموں اور چھوٹے ماموں سے بھی وہ کچھ نہیں پوچھ سکی تھی، ورنہ وہ سب سے زیادہ شاکی ہوتے مہران سے چپکے سے کہہ چکی تھی کہ ہیشم کا وہی کچھ پتا لگائے۔

موبائل کو وہ بغور دیکھ رہی تھی۔ لبوں پر درود شریف اور آیۃ الکرسی کا ورد کر رہی تھی اور غائبانہ ہیشم پر پھونک رہی تھی، اس کی سلامتی اور واپسی کے لیے۔

امی کے گھر سے بھی رمنا کی کال آئی تو اس نے ان لوگوں کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا کچھ پتہ نہیں امی اور ابو خود یہاں آ جاتے اور ابو کی تو ویسے بھی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی، وہ اسی وجہ سے انہیں اور مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اتنی بھی سزا اسے نہیں دینی چاہیے تھی جب کہ وہ کتنی بار اس سے معافیاں مانگ چکا تھا۔ ازالہ کرنا چاہا تھا وہ کون ہوتی ہے اسے سزا دینے والی اور معاف نہ کرنے والی اللہ کے آگے پانچ دفعہ جھک کے اس کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتی ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ تو در گزر کرنے والوں اور گناہ کرنے والوں کو بھی معاف کر دیتا ہے۔ وہ کون ہوتی ہے اس کے کاموں میں مداخلت کرنے والی۔ اللہ کو تو وہ ناراض کر رہی تھی مجازی خدا جو اس سے ناراض تھا اسے ناراض پر ناراض کیے جا رہی تھی۔

ارے اسے تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے عزت سے اس گھر میں واپس بلایا تھا جس نے اس کی بے عزتی کی تھی وہ کتنی عزت دیتا تھا اور دوسروں سے بھی کروانا جانتا تھا اس کی خاطر بڑی مامی کی وجہ سے وہ دوسرے گھر تک میں شفٹ ہونے کو تیار تھا۔ اس لیے کہ بڑی مامی خوشنما سے حقارت سے پیش آتی تھیں۔ وہ تو اپنے سارے فرائض دل سے ہی ادا کر رہا تھا۔

اور وہ کیا کر رہی تھی اس کے ساتھ اگنور اور طنز کتنا برا کر رہی تھی اس کی ہر ہر ضرورت کا کتنا خیال رکھتا ہے ارے وہ جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا ہر آسائش اس نے دی ہوئی تھی کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس کے ماں باپ کی کتنی عزت کرتا تھا اور وہ جواب میں اسے کیا دے رہی تھی سوائے سرد مہری کے وہ تو شروع سے ماں و باپ کی محبت و شفقت تک سے محروم رہا، نانا نے اسے دل سے لگائے رکھا اس گھر کے لوگوں نے اس کا خیال رکھا۔

وہ تو اس کی اپنی تھی اس کے ساتھ ہر وقت رہنے والی اس کے دل کے قریب جتنی بھی اسے محبت دیتی کم تھا جب کہ وہ اپنی انا تک چھوڑ کے اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

”کہیں ایسا نہیں ہو وہ چلا جائے اور وہ خود کو مجرم ہی سمجھتی رہے وہ ہے، تو اس کی عزت ہے اور اس کی زندگی میں بھی رنگ ہیں۔“

”نہیں میں نہیں جانے دوں گی۔“ وہ بیٹھے سے کھڑی ہوگئی آٹھ بج رہے تھے دل ایسا لگ رہا تھا بند ہوگیا ہو۔

بیڈ روم میں گلاب اور موتیے کی مختلف پھولوں کی بھینی بھینی مہک بسی ہوئی تھی۔ خوشنما کے کل کا برائیڈل لباس بھی صوفے پر پڑا تھا۔

”بھابھی! بھابھی.....“ ماہ رخ کی آواز پر وہ چونک گئی۔

”آجاؤ۔“ جلدی سے آنسو پونچھے۔

”ہیشم بھائی آگئے ہیں۔“

”اچھا آتی ہوں۔“ خود کو نارمل کیا۔

تشکر بھرا سانس لیا پھر اپنا منہ دھونے واش روم میں گھس گئی رو رو کے آنکھوں میں جلن ہوگئی تھی۔ موٹی موٹی سوجھی آنکھیں اس کے دل کا فسانہ کہہ رہی تھیں۔ واش روم سے کافی دیر بعد نکلی تھی۔

دیکھا تو ہیشم وارڈ روب میں گھسا جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ ہیشم نے مڑ کے اسے دیکھا دونوں کی نگاہوں کا تصادم ہوا۔

”ہوں..... یعنی محترمہ روئی بھی ہیں اور چہرے سے فکر مندی کے آثار بھی نظر آرہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے یہ جھٹکا کام کر گیا بیوی تو قدموں میں آہی جائے گی۔“ فاران کی کال اور مہران کی کال نے اسے بہت کچھ بتایا تھا۔ بڑی مامی نے تو نیچے اچھی خاصی کھینچائی کر دی تھی۔ شکر تھا نانا جان کے علم میں نہیں تھا ورنہ تو وہ تو اس کی گوشمالی کر دیتے۔

”کہاں تھے آپ صبح سے۔“ وہ تو پھٹ پڑی۔

ہیشم حیرانگی سے اسے دیکھنے لگا وہ اتنے غصے سے اس سے تو کبھی نہیں پوچھتی مگر اسے یہ سب اچھا لگا خوشنما کے لب و لہجے اور انداز میں اپنائیت لگی جو بیویاں فکر کرتی ہیں وہ بھی سب تو چاہتا تھا۔

”تمہیں کب سے میری فکر ہونے لگی۔ تمہاری بلا سے میں جاؤں بھاڑ میں۔“ وارڈ روب میں پھر کچھ

تلاش کرنے لگا۔

''ایسی فضول حرکت کر کے آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔''

''کیسی فضول حرکت کر دی اب میں نے۔'' دھڑ سے وارڈ روب بند کی اور اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ اس سے فاصلے پر کھڑی تھی وہ چند قدموں سے فاصلہ تمام کر کے قریب ہی آ گیا۔ نکھرا نکھرا سراپا دھل کے اور پیارا لگ رہا تھا۔ ہاتھوں اور پیروں میں حنائی رنگ تو الگ ہی چھب دکھا رہا تھا۔

''کاش...... کل کی رات تم یوں ضائع نہیں کرتیں۔'' وہ بس ٹھنڈی آہ بھر کے سوچنے لگا۔

''بغیر بتائے آپ صبح سے گئے ہوئے تھے۔ کوئی فون کالز بھی نہیں کی نا ہی آپ کا سیل آن تھا۔'' وہ بہت غصے میں بول رہی تھی۔

''میرے سیل کی چارجنگ کم تھی اس لیے کال پک نہیں ہو رہی تھی۔ چارجنگ پوری کی تو پھر تو فاران کی مہران کی اشعر کی سب کی ہی کالز آتی گئیں۔ اشعر نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تم نے اسے بھی دو دفعہ کال کی تھی۔''

''آپ نے پھر بھی مجھے کال بیک نہیں کی۔''

''تمہیں میری پرواہ ہی کب ہے کیا کرتا تمہیں بتا کے۔'' وہ اسے سلگا کے پھر اپنے کاموں میں لگ کے یہ تاثر دینے لگا جیسے اب اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

''آپ ایسے کیسے کہہ سکتے ہیں صبح سے میں کتنی پریشان ہوں۔'' اس کے سرد رویے اور روکھے پن سے رونا ہی آنے لگا۔ اس کی ذمہ دار بھی تو وہ خود ہے اسے ہی یہ سب ٹھیک بھی کرنا ہے۔

''پریشان تو تم اس لیے ہو گی کہ کہیں میں تمہارا فیصلہ سنے بغیر تمہیں یہاں لٹکا کے نہ چلا جاؤں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں مجھے کوئی فیصلہ نہیں کرنا۔''

''تمہاری شکل دیکھ کر مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا تم سے کوئی فیصلہ تو ہونا نہیں ہے بعد میں پھر مجھے کوستی رہو گی۔ اس لیے فیصلہ اب مجھے ہی کرنا ہے۔'' اس نے لہجے میں ذرا سختی رکھی جان بوجھ کے تا کہ وہ ڈرے۔

''آپ میری مرضی کے خلاف کیسے فیصلہ کر سکتے ہیں۔'' اس کی تو دنیا ہی ڈول گئی وہ ایسا کوئی بھی فیصلہ کبھی چاہتی ہی نہیں تھی اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اس سے الگ ہو جائے۔''

''تمہاری مرضی کے مطابق ہی فیصلہ ہو گا۔'' وہ مسکراہٹ چھپا کے اس کے بالکل قریب ہوا، خوشنما نے لب بھینچ کے دو قدم پیچھے کیے۔

''میں نے نیچے سب کو بتا دیا اپنے فیصلے کے بارے میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں، کیونکہ تم پر مزید کوئی ظلم تو ہونا ہی نہیں چاہیے کیونکہ میرا اچھلا ریکارڈ ویسے ہی تمہاری نظر میں خراب ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ تمہیں یہاں سے نکال کے ہی کچھ ہو سکتا ہے میری اور تمہاری زندگی اس طرح تو بالکل نہیں چل سکتی۔''

''کک...... کیا مطلب ہے؟'' اس کا دم خشک ہونے لگا۔

ہیثم کی آنکھیں کیوں اسے مسکراتی ہوئی تمسخر اڑاتی ہوئی لگ رہی تھیں۔

''مطلب کا سارا ٹائم گزر گیا کیونکہ بات صحیح اور صاف ہے۔ تم اپنا سامان پیک کرو جو جو ضروری رکھنا ہو صرف وہی رکھنا زیادہ کچھ یہاں سے لے جانے کی کوشش بھی نہیں کرنا۔'' وہ ذو معنی لہجے میں بول رہا تھا۔

''آپ ایسے کیسے مجھے یہاں سے نکال سکتے ہیں۔ میری اور آپ کی باقاعدہ شادی ہوئی ہے کوئی بھاگ کے نہیں آئی ہوں جو میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں۔'' اس کے تو چودہ طبق ہی روشن ہو گئے لہجے اور

آواز کو مضبوط بناتے بولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تم پھر کیا چاہتی ہو یہ بتادو۔" وہ پشت پھیرے مسکراہٹ روکنے کی کوشش کرنے لگا اس لیے خوشنما کے سارے رنگ ہی اڑ گئے وہ جس طرح کی ذومعنی باتیں کر رہا تھا۔

"ہر بات میں بتاؤں اور سب نے آپ کا یہ فیصلہ کیسے مان لیا۔ میں ابھی بات کرتی ہوں جا کے۔" وہ تیزی سے جانے لگی۔ ہیثم نے اس کا بازو اپنی گرفت میں لے کے اپنے سے اتنا قریب کرلیا کہ خوشنما کے دل کی دھڑکن واضح سنائی دے رہی تھی۔

"آپ نے میرا مذاق بنا کے رکھا ہوا ہے۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"اچھا، اچھا الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے مذاق تو محترمہ آپ نے بنا کے رکھا ہوا ہے ایک بندہ معافیاں مانگ مانگ کے اپنی محبت کا یقین دلا دلا کے اداس ہوگیا ہے تمہیں میری حالت پر جب بھی رحم نہیں آرہا اور الٹا تم کہہ رہی ہو میں نے مذاق بنا کے رکھا ہوا ہے۔" اس نے اسے شانوں سے تھام کے اپنے سامنے کیا۔

خوشنما کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں کہہ تو وہ بالکل ٹھیک ہی رہا تھا۔

"سن لو مجھے جھکنے میں پھر بھی عار نہیں تمہیں اشعر کے آفس میں دیکھا تو جانے کیوں تمہاری طرف کھنچتا چلا گیا اور پھر اپنے آفس میں لے آیا تم آہستہ آہستہ مجھ پر قابض ہوتی گئیں۔ جب ہی میں تم سے اکتایا نہیں کیونکہ محبت و پیار میں اکتاہٹ اور غصہ کی کوئی جگہ ہی نہیں ہوتی مگر تم نے مجھے سوائے غصے طنز اور سردمہری کے دیا کیا ہے۔" وہ بول رہا تھا خوشنما کو شرمندگی ہی ہو رہی تھی ابھی بھی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ کیسے اعتراف کرے اس کی محبت کا وہ اس کے بغیر تو ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔

"جب کہ فیصلے کا اختیار بھی تم پر چھوڑا تم سے ہوا نہیں جب کہ میں جانتا ہوں تمہارا فیصلہ کیا ہوگا۔ تم زبان سے بولو گی تھوڑی ہی اس لیے میں فیصلہ بھی خود کر رہا ہوں تمہیں یہاں سے لے جا کے۔"

"پلیز ایسا ظلم نہیں کریں مجھے کہیں نہیں جانا یہیں رہنا ہے آپ کے پاس نہیں رہ سکتی آپ کے بغیر۔" ہیثم کو تو حیرانگی کا جھٹکا لگا۔ حیرت و انبساط سے اسے دیکھے گیا اسے تو کب سے اندازہ تھا خوشنما منہ سے اعتراف نہیں کر رہی ہے اس لیے اسے ایسی باتوں کا جھٹکا ضروری تھا۔

"تمہیں بدنامی سے ڈر ہو رہا ہوگا۔"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے میں آپ سے کبھی نفرت کر ہی نہیں سکتی بس غصہ تھا اور آپ نے بدلہ لینا تھا ایک لڑکی کو اولین شب اس کا شوہر یوں چلی کٹی اور جانے کیا بولے کیسے گوارہ کرتی۔"

"تم نے سوچا کہ بے وقوف ہے ہر وقت میرے لیے پاگل ہے اسے ایسے ہی ٹارچر کرتی رہوں گی۔"

"نہیں بالکل بھی نہیں۔" وہ اس کے سینے سے لگ گئی۔ ہیثم پر شادی مرگ طاری ہوگیا ایسا لگا اس کے ہاتھ ہفت اقلیم آگیا ہو۔

"پتا ہے تم نے میرے اتنے خوب صورت دن برباد کیے ہیں تمہیں بھی سزا ملنی چاہیے تمہیں یہاں سے جانا ہوگا۔"

"نہیں اتنی بڑی سزا......! مجھے ڈیوارس نہیں دیں مجھے باندھی بنا کے رکھ لیں۔ میرے ساتھ جو بھی سلوک کریں گے میں اف تک نہیں کروں گی۔" مضبوطی سے وہ ہیثم کو دبوچے ہوئے تھی جیسے وہ ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔

"لاحول ولا قوۃ ڈیوارس اتنا گھٹیا لگتا ہوں۔" وہ اس کی سوچ کو پہلے ہی جان چکا تھا وہ کیا سمجھ رہی ہے

فیصلے اور نکالنے کو اسے ہنسی بھی آ رہی تھی خوشنما کے حواس باختہ چہرے کو دیکھ کر۔
''آپ باتیں ہی ایسی کر رہے ہیں مجھے ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' اس نے نگاہ بھی چرائی مگر ہشم سے دور نہیں ہوئی۔
''ڈیئر اس تو خیر نہیں دے رہا اور نہ کبھی تم ایسی بات کی توقع بھی نہیں کرنا۔'' اس نے لہجے میں مضبوطی رکھ کے اسے جتایا۔
''تمہیں باندھی بنا کے رکھ لیں گے جو بھی میں سلوک کروں گا تم اف تک نہیں کرو گی، پھر تم جانتی ہی ہو باندھی کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔'' وہ معنی خیزی سے مسکرانے لگا۔ خوشنما کے گھبراہٹ میں پسینے چھوٹ گئے۔ وہ اس سے دور ہوئی مگر ہشم کی گرفت اس کے بازو پر مضبوط تھی۔
''وہ......وہ میں نے تو......'' الفاظ بھی نہیں بن رہے تھے۔
''وہ......وہ......کیا......!'' اس نے خوشنما کے داہنے رخسار پر پیار کی مہر ثبت کی وہ چھوئی موئی سی ہوگئی۔
''کہاں گئی تمہاری پراعتمادی، بہت بڑھ بڑھ کے بولتی تھیں۔''
''پلیز سوری۔'' وہ واقعی دل سے شرمندہ تھی۔
''یہ سوری وری کا ٹائم گیا جلدی سے پیکنگ کرو۔''
''پھر وہی بات معاف کر دیں۔'' وہ ہاتھ جوڑنے لگی۔
''خوشنما! میں اپنے ہنی مون ٹرپ کے لیے پیکنگ کرنے کو کہہ رہا ہوں۔ زیادہ کچھ پیک نہیں کرنا جس چیز کی ضرورت ہوگی وہاں سے دلا دوں گا۔'' وہ جلدی جلدی بول رہا تھا خوشنما کو تو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔
''آپ تو انگلینڈ جانے والے تھے۔'' اس نے حیرانگی سے پھر پوچھا۔
''انگلینڈ کی کہانی تو یہ ہوئی کہ نانا جان اور بڑی مامی نے کہا کہ ابھی پوسٹ پونڈ کر دو کیونکہ میرا ٹرپ چھ ماہ کا تھا۔ وہ کہنے لگیں فاران اور مریم ہنی مون پر جا رہے ہیں، تم اور خوشنما بھی جاؤ۔'' اس نے ساری بات اسے سمجھا دی۔
''رہا انگلینڈ جانا ہنی مون سے واپس آجائیں پھر کچھ ماہ بعد ہم دونوں ساتھ جائیں گے کیونکہ اکیلے تو میرا دل نہیں لگے گا۔'' ہشم اس کے دونوں ہاتھ پریم سے تھام کے نشیلے لہجے میں گویا ہوا۔
''آپ بہت اچھے ہیں۔ میں نے آپ کو کتنا زچ کیا پھر بھی آپ مجھ سے بے زار نہیں ہوتے تھے۔'' وہ ہشم کی اس خوبی کی معترف ہوگئی تھی۔
''دل و جان سے تم سے رشتہ جو جوڑ لیا ہے اور جن سے دل سے رشتے جوڑے جاتے ہیں ان سے بے زار نہیں ہوا جاتا۔'' اس نے بڑے گمبھیر لہجے میں بڑے جذب سے کہا۔
''میں شاید آپ کو سمجھ نہیں سکی تھی۔ آپ کو جانے کیا کیا نہیں کہا۔''
''ہر لڑکی کا یہ فطری عمل ہوتا ہے تمہاری جگہ اگر کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو وہ بھی یہی کرتی میں نے کون سا تمہارے ساتھ اچھا کیا تھا۔'' اس نے اس کے نرم ملائم ہاتھوں کو اپنے پیار کی گرمی سے دبایا تھا۔
''اچھا بھئی ان سب باتوں کو چھوڑو۔''
''کیسے چھوڑوں ان سب باتوں کو کل میں اتنے اہتمام سے آپ کے لیے تیار ہوئی تھی آپ نے ذرا بھی توجہ نہیں دی اور رات میں بھی مجھ سے الٹی سیدھی باتیں کر کے سو گئے پوری رات اور آج پورا دن میں

انگاروں پر لوٹی ہوں۔" وہ شکوہ کرنے لگی۔

"کل میری نگاہیں تم سے ہٹنے کو تیار نہیں تھیں۔ اتنی حسین شہزادی لگ رہی تھیں یہ میں ہی جانتا ہوں کیسے اپنے اندر کے جذبات کو ڈانٹ ڈپٹ کے سلایا تھا۔" وہ مسکرا کے بولا۔ خوشنما جھینپ گئی۔

"جلدی سے تھوڑی سی اپنی اور میری پیکنگ کرلو۔ کل دوپہر تین بجے کی اسلام آباد کی فلائٹ ہے۔"

"آپ نے سب اتنی جلدی جلدی کرلیا مجھے امی کو بھی تو بتانا ہوگا۔"

"انہیں میں ساری تفصیل دے کے آیا ہوں کہہ رہی تھیں رات کو ملنے آئیں گی۔"

خوشنما نے متحیر زدہ ہو کے کھلے منہ کے ساتھ ہشم کے چہرے کو دیکھا وہ تو اس کے دل کی ہر بات پہلے سے جان لیتا ہے کتنی سچی اور دل سے محبت کرتا ہے وہ اوپر والے کا شکر ادا کیے جارہی تھی شوہر اسے قدر کرنے والا ملا تھا۔

"ساری پیکنگ جلدی سے نمٹاؤ رات کو ہم دونوں صرف اپنی باتیں کریں گے۔" آنکھوں میں نشہ اور لہجے میں ترنگ لیے اس کے کان میں سرگوشی کرنے لگا۔

وہ شرم سے مسکرادی اور ہشم کے شانے سے لگ گئی۔

"مجھے ڈھیر سارے بچے چاہئیں تاکہ تمہیں الٹا سیدھا سوچنے کا ٹائم نہیں ملے۔"

"کیا ڈھیر سارے......" وہ تو اچھل کے الگ ہوگئی۔

"مجھے تو اپنے ماں باپ کا سایہ نہیں ملا اپنے بچوں کو دیکھ کر پیار کرتے محسوس کرلوں گا کیسے میرے ماں وباپ مجھے دیکھ کر خوش ہوتے۔" ہشم کو اپنے ماں وباپ کی کمی بہت شدت سے محسوس ہورہی تھی۔

"آپ نے اپنے ماں وباپ کو کبھی دیکھا ہی نہیں۔"

"چھوٹا تھا، نانا جان نے اور ان سب نے ہی مجھے پالا اور رکھا ہے۔" اس نے بتایا۔

"چھوڑو ان باتوں کو ورنہ میری طبیعت اداس ہوجائے گی۔"

"ہوں۔" خوشنما نے سر ہلایا۔

"میری یہ بھی فکر دور ہوئی جو ہم کا بھی رشتہ لگ گیا۔"

"آپ کو سب کی اتنی فکر رہتی ہے یا ابھی ہونے لگی ہے۔"

"میں شروع سے سب کی فکر کرتا ہوں اور اب تمہاری مجھے ہر وقت فکر اور خیال رہتا ہے تمہیں میری ذات سے تکلیف نہ ہو۔" وہ ذرا سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"میں بھی خیال رکھوں گی میری ذات سے آپ کو بھی کوئی شکایت نہیں ہو۔" اس نے یقین دلایا۔

"میں نے یہ تہیہ کیا ہوا تھا میں تمہیں تمہاری رضا سے ہی مانگوں گا کیونکہ رضامندی سے زندگی زیادہ خوب صورت ہوجاتی ہے۔" وہ جذب سے بول رہا تھا۔

"ہوں۔" اس نے بھی تائیدی سر ہلایا۔

ساری دھند چھٹ گئی تھی ہر چیز دھل کے نکھر گئی تھی۔ وہ اپنی زندگی اور شریک سفر پر جتنا بھی ناز کرتی کم تھا مگر اسے یہ سب اوپر والے کی رضا سے ہی ملا تھا اور پروالا اپنے بندوں کا اچھا ہی سوچتا ہے۔

"اے میرے رب! ساری لڑکیوں کو قدر کرنے اور محبت کرنے والا شریک سفر دے، آمین۔" اس نے دل میں دعا کی تھی۔

......☆ختم شد☆......

اقراء چنا

مکمل ناول

تنہائیوں کے شہر میں

''ہم پھر کب ملیں گے؟'' اس نے معصومیت بھری گول گول آنکھوں سے اپنے پہلو میں بیٹھی اس مہربان شخصیت کی جانب دیکھا۔



''شاید...... بہت ٹائم کے بعد۔'' تھوڑا وقت سوچنے کے بعد اس نے ہاتھ پھیلا کر جواب دیا۔
''میں آپ کو بہت مس کروں گی بھیا!'' اس کی گول گول کالی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ اسے اس قدر دکھی دیکھ کر بے قرار ہوا اپنی گڑیا جیسی بہن سے جدائی پر وہ بھی اندر ہی اندر رو رہا تھا لیکن اس کے سامنے خود کو نڈر دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔
''پاپا مجھے بہت دور لے کر جا رہے ہیں جہاں سے اتنا جلدی آنا آسان نہیں ہے میری گڑیا! پر میں پوری پوری کوشش کروں گا کہ میں اپنی گڑیا سے ملنے آسکوں۔'' یہ ایک نو سالہ بھائی کا اپنی پانچ سالہ بہن سے وعدہ تھا۔ ابصار کا وہ ہی نرم میٹھا لہجہ جو اس کو ہمیشہ مطمئن کر دیتا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔
''پاپا آپ کو کہاں لے کر جا رہے ہیں بھیا؟'' ایک معصوم سی مسکراہٹ تھی اس کے چہرے پر۔ وہ اس کے عین سامنے کھڑی تھی۔
''دبئی......'' وہ اداسی سے بولا۔



''دبئی بہت دور ہے؟''

''ہاں بہت دور۔'' آسمان پر چاند مکمل تھا جو کہ پورے ماحول کو روشن کیے ہوا تھا مگر ان دو معصوم ننھے پرندوں کی کہانی ادھوری ہونے جارہی تھی۔ چاند بھی انہیں چپکے چپکے دیکھ کر اداس ہو رہا تھا۔

''یہ میرا ہے، یہ مجھے دو، زین کے بچے۔'' وہ چونک کر ماضی سے حال میں لوٹی تھی۔ نسرین باجی کے دونوں بچے آپس میں لڑ رہے تھے، زین کے پیچھے انعم بھاگ رہی تھی۔ وہ چوکھٹ پر بیٹھی ان دونوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بھٹک جایا کرتی تھی، اس کی زندگی کا خاص حصہ اس بھیا اسے جدائی دے گیا تھا۔ جس سے دور رہنے کا کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ وہ پندرہ سال گزر جانے کے بعد بھی نہیں لوٹے تھے۔ تو کیا ''دبئی سے پاکستان'' کا سفر اتنا زیادہ تھا وہ اکثر سوچا کرتی تھی۔

☆......☆

''کس سے ملنے آئی ہو؟'' ہمیشہ کی طرح صمد نے اس کا راستہ روکا تھا۔ اس نے ناگواریت سے اسے دیکھا۔

''جب اس سوال کا جواب معلوم ہے تو پھر پوچھنے کی کیا تک ہے؟'' اس نے ابرو اچکا کر طنز کیا۔

''کیوں کہ میں چاہتا ہوں کہ کبھی تمہارے منہ سے یہ ہی نکل جائے کہ عبدالصمد میں تمہارے لیے آئی ہوں۔'' وہ اپنے مخصوص شوخ انداز میں بولا۔

''ایسا نہیں ہوگا۔ یہاں میں صرف دادا، دادی سے ملنے کے لیے آتی ہوں۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ میں تم سے ملنے آؤں۔'' وہ اپنے شولڈر کٹ بال ٹھیک کر کے بولی۔

''دادا......دادی جیسے بورنگ لوگوں سے ملنے سے بہتر ہے کہ آپ نئے جدید دور کے اس ہینڈسم نوجوان سے کچھ پل گفتگو کرلیں۔'' وہ موڈ میں ہوتا تو اکثر اسے زچ کرنے کی کوشش کرتا، اسے اچھا لگتا تھا۔ رابیل کے مرجھائے چہرے پر کچھ پل کے لیے مسکراہٹ سجانا، رشتے میں وہ اس کا تایازاد تھا، دونوں کے گھر برابر میں تھے۔ وہ دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا، بہنیں دونوں میرڈ تھیں، دادا، دادی بھی اپنے بڑے بیٹے کے گھر میں رہتے تھے۔

''مجھے ان پرانے زمانے کے لوگوں کے ساتھ بہت مزہ آتا ہے۔'' اس نے دانت چبا کر جواب دیا۔

''آزادی سے بھی پہلے کے زمانے کے ہیں یہ دونوں اور قسمت دیکھو، ابھی تک صحیح سلامت اپنے پیروں پر کھڑے ہیں، جس دور میں وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے بیل گاڑیوں کا استعمال کرتے تھے۔ وہیں اب وہ موبائل اور کمپیوٹر کے دور میں بھی بڑی شان سے جی رہے ہیں۔ واہ کیا بات ہے۔'' وہ ہمیشہ دادا اور دادی کے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال کرتا تھا اور رابیل بھی اس کی باتوں پر غصہ ہو جاتی تو کبھی ہنس پڑتی۔ اس وقت بھی وہ اس کی جانب پشت کیے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

''ہنسنا ہی ہے تو چھپ کر کیوں؟'' وہ اس کے سامنے آگیا۔

''صمد! تم سیدھی لائن پر آجاؤ، ورنہ پٹو گے میرے ہاتھوں۔'' وہ کھنکتی ہوئی ہنسی کے دوران بول رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر تم اسی طرح ہنستی رہو تو میں پٹنے کے لیے بھی تیار ہوں۔

''ہٹو! مجھے جانے دو، میں کھیر لائی ہوں ان دونوں بزرگوں کے لیے۔'' وہ اسے سامنے سے ہٹ جانے کا حکم دے رہی تھی، جو یوں ہی اس کی راہ میں حائل ہو جاتا تھا۔

''پہلے ہی ان دونوں کو شوگر ہے تم انہیں یہ کھیر کھلا کر اوپر کی ٹکٹ کٹوانا چاہتی ہو کیا۔'' وہ بعض نہیں آرہا تھا۔

''یہ تمہارے سر پر پٹخ دوں گی اور تمہارے اوپر کی ٹکٹ کٹ جائے گی۔'' اس کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ منہ پھلا کر بولی۔ وہ زیر لب مسکراتا رہا، ان دونوں گھرانوں میں دادا اور دادی کے علاوہ ایک وہ صمد ہی تھا جس کے ساتھ وہ تھوڑا ہنس بول لیتی تھی۔ وہ اکثر اس کے بوجھل دل کو کچھ دیر کے لیے خوش کر دیتا تھا۔
دادا اور دادی اس کی عین توقع کے مطابق اپنی اپنی کرسی سنبھالے آزادی کے دور کے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کے آگے بیٹھے تھے وہ مسکراتی ہوئی ان دونوں کے قریب گئی۔

☆......☆

وہ تپتی ہوئی دوپہر میں سفید یونیفارم میں کندھوں پر بیگ لٹکائے گھر میں داخل ہوئی۔ ہال روم کے اندر کا منظر دیکھ کر دل بجھ سا گیا۔ ماما محمد شفیع کے ہمراہ صوفے پر براجمان تھیں اور ان کے اردگرد ان کے دو بچے، ہانیہ اور عماد تھے۔ عماد ماما کو اپنا رزلٹ دکھا رہا تھا اور ماما اس کی پیشانی چوم رہی تھیں جب کہ ہانیہ ماما کے گلے کا ہار بنی ہوئی تھی اور محمد شفیع بھی اس خوشگوار منظر میں شامل تھے۔ زندگی میں ایک ماں کا ہی خالص رشتہ اس کے حصے میں آیا تھا اور وہ بھی بانٹ لیا گیا تھا۔ جب بھی وہ ان افراد کو ماما کے قریب دیکھتی، ذہنی انتشار کا شکار ہو جایا کرتی تھی اور جی چاہتا ہر شے کو تہس نہس کر دے۔ چیخ چیخ کر پوری دنیا سے کہہ دے کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟ وہ پیر پٹختی ہوئی واپس باہر کی جانب مڑ گئی، لان میں پہلے اس نے بیگ کندھے سے اتار پھینکا اور پھر خود بھی غصے سے نرم اور ہلکی گیلی گھاس پر بیٹھ گئی۔ غائب دماغی سے گھاس نوچتی رہی۔ احسن بغور اسے دیکھ رہا تھا، وہ مالی کو ہدایت دے رہا تھا۔ وہ رابیل کو اس کے بچپن سے دیکھتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ بچپن سے ہی ایسی تھی عمر کے کسی حصے میں اس نے رابیل کے رویے میں تبدیلی نہیں دیکھی تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ ماما کے ساتھ کسی اور کو برداشت نہیں کر پاتی تھی۔
دھوپ سے اس کے سرخ ہوتے ہوئے گال تمتما رہے تھے۔ وہ ہمت مجتمع کرتے ہوئے اس کے پاس آیا۔ وہ اس معصوم سی لڑکی کے تمام دکھوں کو چننا چاہتا تھا جو ہر وقت خود سے الجھی رہتی تھی۔ وہ اسے دل سے اپنی بہن مانتا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اسے کبھی بھائی کا درجہ نہیں دے گی کیوں کہ وہ بھی محمد شفیع کا بیٹا تھا اور رابیل تو محمد شفیع اور ان کی تینوں اولاد سے سخت اختلافات رکھتی تھی۔
''کیا پریشانی ہے؟'' پریشانی وہ اس کی جانتا تھا مگر بات کے آغاز کے لیے کچھ تو پوچھنا تھا۔
''کچھ نہیں۔'' انداز دوٹوک تھا۔
''بہت عرصے سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ الجھی رہتی ہو، پریشان رہتی ہو۔ اپنا سمجھ کر مجھے بتاؤ کیا پتا دل کا بوجھ مجھ بتانے سے کچھ اچھا فیل کرو۔'' وہ اس کی گول گول آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ کتنی اداس اور بوجھل تھیں۔
''میں کیوں اپنی پریشانی آپ سے شیئر کروں؟'' وہ ڈھیٹ بنی ہوئی تھی۔
''میں بھی تو بھائی ہوں نا تمہارا۔'' وہ جانتا تھا کہ بھائی کا لفظ بھی اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا اور اس لفظ کی اہمیت اس نے صرف ایک ہی شخص کو دی تھی۔ رابیل نے پہلی بار احسن کو دیکھا وہ اس سے نگاہیں چرانے لگا۔ وہ دونوں بہت کم مخاطب ہوا کرتے تھے۔ بلکہ وہ ماما کے علاوہ اس گھر میں کسی سے بھی مخاطب ہونا پسند نہیں کرتی تھی۔ ماما اسے بہت سمجھایا کرتی تھیں کہ وہ دونوں اب محمد شفیع اور ان کے بچوں کی زندگی میں شامل ہو چکی ہیں، بہتر ہے کہ رابیل بھی انہیں قبول کر لے لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ اس نے ماما کی کسی ہدایت پر غور نہیں کیا۔

سمجھداری کی حدود میں تو وہ بہت بعد میں داخل ہوئی۔ جب کچی عمر تھی حافظہ اتنا مضبوط نہ تھا، تب بھی اس نے اس بات کو اہمیت نہ دی۔

''کب تک ابصار کا انتظار کرتی رہوگی۔'' وہ سرد مہری سے بولا۔

''جب تک یہ زندگی ہے۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

''چھوٹی سی باتوں کو تم نے اس قدر دل پر لیا ہے کہ تمہیں تمہارے نظریئے کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔''

''یہ ضد نہیں ہے۔ میرا حق چھینا گیا ہے۔ بچپن میں ہی باپ سے علیحدگی، بھائی سے دوری، ماما کا دوسرا نکاح اور پھر ماما کا تقسیم ہو جانا۔'' اس کی آنکھوں میں کچھ چبھنے لگا اور احسن کو لگا وہ اسے اکسانے میں تھوڑا تھوڑا کامیاب ہو گیا ہے۔

''تقسیم نہیں کیا گیا جو پہلے تمہارا تھا وہ اب بھی تمہارا ہے۔'' وہ نرمی سے بولا۔ رابیل خاموش رہی۔ شاید اور بولتی تو رو پڑتی اور وہ خود کا یہ بھرم توڑنا نہیں چاہتی تھی۔

''رابیل! تم بہت بھولی ہو، پر تم بہت خوش قسمت بھی ہو، تم شکوے مت کرو، دکھی تو وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جن سے ان کے قریبی رشتے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں اور ان لوگوں میں عمار میں اور ہانیہ بھی شامل ہیں۔'' وہ اپنی امی کے لیے بول رہا تھا۔

''تم تو خوش قسمت ہو کہ تم جنہیں اتنا پیار کرتی ہو وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں۔'' وہ اُسے حقیقت دکھانا چاہ رہا تھا۔

وہ بغور اسے سن رہی تھی اور احسن کو سننا اسے اچھا بھی لگ رہا تھا۔ چند ثانیے وہ سوچنے پر بھی مجبور ہو گئی تھی لیکن اچانک اس نے پیدا ہونے والے خیال کو جھٹکا، وہ اس کی جانب مڑی آنسوؤں کو پی گئی۔

''میں نے جو کھویا ہے، اس کا کوئی ازالہ نہیں کر سکتا نا، پھر میں کیوں کسی کو معاف کر دوں، یہ سب دل سے نکالنا اتنا آسان نہیں، میں یوں ڈھیٹ بن کر زندگی گزارنے میں ہی مطمئن ہوں۔'' وہ دوٹوک لہجے میں کہہ کر اٹھ گئی اور وہ پریشانی میں ہونٹ بھینچے اسے دور جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

☆......☆

اس کے پاس سب کچھ تھا، اس کی کہانی مکمل تھی اس کی تصویر مکمل تھی۔ ایک شفیق باپ کا سایہ اس کے سر پر تھا۔ ایک ماں کی مکمل توجہ کی مرکز بھی وہ اور ہمہ وقت بے پناہ محبت کرنے والا بھائی تھا اس کے ساتھ۔ ہر روز کی طرح اس وقت بھی وہ مکمل زندگی سے مزین اس تصویر کا فریم ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی۔ وہ تصویر اس کی سالگرہ کی تھی۔ جس میں وہ ماما پاپا اور بھیا تھے۔ چاروں چہرے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں وہ سنہری بالوں والی گڑیا تھی جو بھیا ہی نے اسے گفٹ کی تھی جو کہ اتنے سال گزرنے کے بعد بھی آج بھی اسی حالت میں موجود تھی۔ سب اتنے خوش تھے تو پھر کس کی نظر لگ گئی انہیں، وہ ایک خوب صورت خوشیوں کا محل یوں زرد زرد کیوں ہو گیا؟

رفعت بہت دیر سے آئی اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی مگر پھر بھی اس کا انہماک نہیں ٹوٹا تھا اس کی توجہ کا مرکز وہ تصویر ہی بنی ہوئی تھی۔

''ماما کیا آپ فری ہیں؟'' اس کی سماعتوں نے ہانیہ کی آواز سنی جو دروازے کی دہلیز پر کھڑی ماما سے مخاطب تھی۔

"ہاں بیٹا! آجاؤ۔" ماما کا وہ ہی ممتا بھرا لہجہ تھا جو وہ ہمیشہ اپنے تمام بچوں کے لیے استعمال کیا کرتی تھیں اور رابیل کے اندر تک آگ لگ کر خاک ہو جایا کرتی تھی۔ ہانیہ ماما کے پاس آگئی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ وہ کچھ وقت ان کے ساتھ گزارنا چاہتی ہے۔ اس نے ماما کے گرد بازو حمائل کر رکھے تھے۔ اس کی برداشت ختم ہو رہی تھی۔ اس نے تصویر کا فریم رکھا اور تیزی سے ان دونوں کی جانب آئی۔

"ہانیہ! مجھے ماما سے بات کرنی ہے۔ تم پلیز بعد میں ان سے مل لینا۔" وہ سرد مہری سے اس سے مخاطب تھی۔ ہانیہ کے چہرے پر چھائی مسکراہٹ یکسر غائب ہوئی۔

"بیٹا! بیٹھنے دو اسے بھی اور تم بھی آجاؤ میرے پاس۔" ماما نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھایا۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھیں کہ رابیل کو یہ سب اچھا نہیں لگتا۔

"ہانیہ! تم گئی نہیں ابھی تک۔" اس نے طنزیہ کہا۔ وہ سر ہلاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ رفعت نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ آخر کو وہ اتنی پتھر دل کیوں ہوتی جا رہی تھی وہ چاہتی کیا تھی کیا اسے یہ سب کر کے تسکین ملتی تھی؟ ایسے میں وہ رابیل کے چہرے پر سکون دیکھتی تھیں اور آنکھوں سے وہ جتا دیتی تھی کہ "دیکھیں! آپ صرف میری ہیں۔"

☆......☆

ہر گزرتے دن کی طرح اس روز بھی دن خاصا گرم تھا جانے اتنی گرمی کیوں ٹوٹ پڑی تھی، اب تو پہلے کی طرح اتنی بارشیں بھی نہیں ہو رہی تھیں، گھٹن تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ بیرونی دروازے تک آئی تھی۔ ملازمہ نے اسے اطلاع دی تھی کہ کوئی دروازے پر اس سے ملنے آیا تھا۔ اس نے دروازہ وا کیا دروازے کے اس پار دو وجیہہ نوجوان مسکراتے ہوئے چہروں کے ساتھ کھڑے تھے۔

"جی کیا کام ہے؟" انداز روکھا تھا۔

"جی، خود پہچانیے۔" سفید رنگ کی ٹی شرٹ والے شخص نے ضرورت سے زیادہ مسکراتے ہوئے کہا۔ اس نے آنکھیں میچ کر اسے اور پھر دوسرے والے کو بغور دیکھا۔ کہیں تو کچھ تھا اس نے دماغ پر زور دیا دائیں گال کے تھوڑا نیچے وہ سیاہ داغ رابیل کیسے بھلا سکتی تھی۔

"آپ...... آپ ابصار احمد ہیں؟" حیرت و خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ وہ دونوں ہی اس کی حالت پر محظوظ ہو رہے تھے۔

"بالکل میری گڑیا۔" وہ ہی میٹھا لہجہ تھا۔ ابصار نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور رابیل کو لگا یہ گول دنیا سمٹ کر اس کے قدموں میں آگئی ہو، وہ تپتا ہوا موسم ایک خوشگوار موسم میں بدل گیا ہو۔ اس کے آس پاس رم جھم برسات ہو رہی ہو اور تپتے ہوئے صحرا میں برسوں کی پیاسی اس رم جھم برسات میں بھیگ رہی ہو اور اس کا دل تمنا کر رہا تھا کہ وہ اپنی دل کی خوشی کی انتہا پوری دنیا کو بتلائے کہ وہ ناامید نہیں ہوئی۔ اس کی امید جیت گئی۔

ابصار اندر داخل ہوا تو وہ اس کے سینے سے جا لگی۔ آنکھوں میں آنسو ٹمٹمانے لگے۔ یقیناً وہ آنسو خوشی کی نشاندہی کر رہے تھے اور عائش ان دونوں بہن بھائیوں کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"کیسی ہو تم؟" ابصار نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے محبت سے لبریز لہجے میں پوچھا۔

"کیسی ہو سکتی ہوں اپنے بھیا کے بغیر......؟"

"بہت مشکل سے تمہارے اس گھر کا ایڈریس معلوم کر کے آیا ہوں۔ بھیا بھی تمہیں بہت مس کرتے ہیں۔" وہ اس

کی پیشانی چوم کر بولا۔
"اچھا! اندر تو آیئے۔" وہ اسے اندر کی جانب لے جانے لگی تو عائش بھی اندر داخل ہوا۔
"آپ کہاں......!" اس نے پوری آنکھیں نکالیں۔
"ہوں......اتنی گرمی میں باہر تو نہیں رک سکتا۔" اس کی لاتعلقی پر وہ نیم غصے سے بولا۔
"تو گاڑی میں بیٹھ جائیں۔" وہ ہٹ دھرم ہوئی۔
"کیوں گاڑی میں بیٹھوں؟"
"ڈرائیور جو ہو۔" وہ سر جھٹک کر بولی۔
"رابیل! یہ میرا دوست ہے اندر آنے دو اسے۔" ابصار نرمی سے بولا۔ رابیل نے منہ چڑاتے ہوئے اس کے لیے راستہ چھوڑا۔ وہ ماما کو بلند آواز میں پکارتی ہوئی ابصار کے پاس لے آئی۔ رفعت کی بھی نگاہیں ابصار کو دیکھنے کے لیے ترس گئی تھیں۔ اسے خود سے جدا کرنے کا فیصلہ اس کا خود کا تھا لیکن رات بھر وہ اس کے لیے رویا کرتی تھی۔ لپک کر اسے گلے سے لگایا۔ ابصار کے اعصابوں میں کوئی جنبش نہ آئی۔ اس نے خود کو مضبوط کرلیا تھا بالکل ایک پتھر کی مانند ماں کے رشتے سے اس کا یقین جو ٹوٹ گیا تھا، اس کے بعد رابیل اس کو اپنے روم میں لے آئی تھی۔
"بھیا! میں آپ کے لیے مینگو جوس لے کر آتی ہوں۔ آپ کو بہت پسند ہے ناں؟" وہ اٹھنے لگی۔
"نہیں گڑیا رہنے دو، اب میں نہیں پیتا۔" اس نے اسے اپنے پاس بٹھایا۔
پھر وہ اٹھی اور وہ تمام چیزیں لے کر آئی جو وہ ہر سال ابصار کی سالگرہ کے موقع پر بطور گفٹ لیا کرتی تھی۔ جن میں رسٹ واچ، شرٹس، ڈائریاں وغیرہ شامل تھیں۔
"یہ سب آپ کے لیے ہیں۔" وہ جوش میں چہک کر بولی۔
"ابھی فی الحال اپنے پاس رکھو۔ بعد میں لے جاؤں گا۔" وہ مسکرایا۔ عائش دلچسپی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔
"اچھا! تو آپ کب دبئی سے آئے؟" اس نے پوچھا۔ رفعت اس سب کے دوران خاموش بیٹھی تھیں۔ انہوں نے ابصار کی بے رخی محسوس کرلی تھی۔
"دو دن پہلے۔" اس نے مختصراً جواب دیا۔
"ابھی واپس تو نہیں جائیں گے ناں؟" اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے ہاتھ تھام لیے۔
"ابھی کچھ ٹائم ادھر ہوں۔ ہم بزنس کے حوالے سے آئے ہیں۔"
"بزنس کے لیے؟ مجھ سے ملنے نہیں۔" اس کا چہرہ بجھ گیا۔
"یقیناً تم سے بھی ملنے۔" ابصار نے ہلکے سے اسے چپت لگائی۔
"پاپا ٹھیک ہیں؟" انگلیاں آپس میں مروڑتے ہوئے پوچھا وہ چاروں نفوس خاموش ہوگئے۔ رفعت نے نگاہیں چرائیں۔
"آں......ہاں......ٹھیک ہیں وہ۔" اس نے کن اکھیوں سے رفعت کو دیکھا۔
"آپ مجھے کب اپنے پاس لے جائیں گے؟" اسے ہمیشہ ایسا ہی لگتا تھا کہ جب بھیا آئیں گے تو اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ کیونکہ ان کی کتنی خواہش تھی کہ وہ اسے سب سے چرا کر اپنے ساتھ لے جائیں۔ اس وقت وہ مجبور تھا اب وہ سوچتی تھی کہ اب تو بھیا ضرور لے جائیں گے۔ وہ کیسے بھی کر کے ماما کو راضی کرلیں گے۔ اس کے اس طرح

سوال کرنے پر ابصار کے چہرے کے تمام رنگ اڑ گئے تھے۔ ماما اور عائش نے چونک کر رابیل کو دیکھا۔ وہ ہر تاثر سے بے نیاز یک ٹک ابصار کو دیکھ رہی تھی وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

"میری گڑیا! یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ تم اپنی ماما کا سہارا ہو۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو میں بہت پہلے ہی تمہیں لے جا چکا ہوتا۔" اس نے اسے نرمی سے سمجھایا۔

"پر مجھے اب آپ کے ساتھ ہی تو رہنا ہے۔" اس نے ابصار کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

رفعت کا جی چاہا اسے جھنجھوڑ کر پوچھے کہ تمہارے بغیر میرا کیا ہوگا۔ میرے جینے کی وجہ تو صرف تم ہو وہ زہر کا گھونٹ پی کر رہ گئیں۔

"ہمیں پہلے ہی بانٹ لیا گیا تھا۔" وہ افسردگی سے بولا۔ ماضی کی یادیں تازہ ہو رہی تھیں۔

"یہ کیا بھئی تم دونوں کے علاوہ یہاں دو لوگ اور بھی موجود ہیں۔" عائش نے درمیان میں دخل اندازی کرنا ضروری سمجھا، وہ ابصار کی زندگی کے ہر راز سے واقف تھا۔ رفعت کے چہرے کے تاثرات اس سے چھپ نہ سکے تھے۔

شام ہوتے ہی ابصار جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ رابیل اور رفعت نے اسے بہت کہا کہ وہ یہیں رہ سکتا ہے مگر اس نے معذرت کر لی اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وہ دونوں روانہ ہو گئے۔

☆......☆

ابصار نے اسے فون پر اطلاع دی تھی کہ وہ آج کے دن کہیں باہر جائیں گے۔ وہ ریڈی ہو جائے۔ ماما سے اجازت لے کر وہ خوشی سے تیار ہوئی تھی۔ روم ڈور ناک ہونے پر اس نے مڑ کر دیکھا، دروازے کے درمیان میں عائش بلیک ڈریس پینٹ اور لائٹ بلیو شرٹ میں ملبوس مسکراتا ہوا کھڑا تھا۔

"بھیا کہاں ہیں؟" اس نے اس کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا۔

"وہ نیچے ہمارا ویٹ کر رہا ہے۔ آپ کو لینے ہم آئے ہیں۔" وہ سر کو خم دے کر بولا۔

"اچھا پھر چلو۔" وہ آگے بڑھنے لگی۔

"رابیل! کیا تم مجھ سے دوستی کرو گی؟" اس نے ہاتھ بڑھایا۔ اس کی اس غیر سنجیدہ حرکت پر وہ چونکی۔

"نہیں۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔ اسے بھیا کے اس دوست پر غصہ بھی آیا جو کہ اتنے کم وقت میں اتنا زیادہ فری ہو رہا تھا۔

"اچھا! دوستی نہیں کرنی تو ہم ساتھ کھیل تو سکتے ہیں ناں؟" وہ سینے پر بازو لپیٹے اطمینان سے بولا۔ اس کے آخری جملے پر وہ حقیقتاً چونکی اور کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ یہ ہی جملہ اس نے پہلے کبھی بھی سنا تھا۔ پہلے بہت پہلے...... بچپن میں...... جب وہ ایک دن بھیا کے ساتھ لان میں کھیل رہی تھی اور بھیا کا ایک ہم عمر دوست اس کے پاس آیا تھا۔

"رابیل کیا تم مجھ سے دوستی کرو گی۔" عائش نے اس گول مٹول دو چٹیوں والی لڑکی کے آگے ہاتھ بڑھایا تھا۔

"نہیں! ماما منع کرتی ہیں بوائز سے دوستی نہیں کرنی۔" اس نے صاف گوئی سے جواب دیا تھا۔

"اچھا دوستی نہیں کر سکتیں تو ہم ساتھ کھیل تو سکتے ہیں ناں؟" انداز میں معصومیت سموئے وہ اس لڑکی کو قائل کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" ایٹ لسٹ وہ مان گئی تھی۔

"تم بھیا کے بچپن کے دوست ہو عائش۔" وہ ہنس رہی تھی۔ وہ بالکل بھی تو نہیں بدلی تھی۔ عام لڑکیوں سے بالکل

جدا لگتی تھی۔ شولڈر کٹ بال، ہیلتھی جسامت، گوری رنگت اور سرخ ہوتے گال اور سب سے زیادہ پرکشش اس کی آنکھیں۔ بالکل گول گول اور ایکدم سیاہ اور ان میں بلا کی معصومیت۔

''تم تو مجھے بھول گئی تھیں مگر مجھے تم یاد ہو۔'' وہ بھی ہنسنے لگا۔

''تم اب تک بھیا کے ساتھ ہو، کیا دوستی ہے۔'' اس نے سراہا۔

وہ دونوں باتیں کرتے کرتے بیرونی گیٹ سے باہر آ گئے تھے۔ جہاں ابصار گاڑی میں بیٹھا ان کا منتظر تھا اور وہ شام بہت پرلطف اور خوشگوار تھی۔ وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ جتنا بھی وقت ان تینوں نے ساتھ میں گزارہ وہ بہت حسین اور یادگار تھا۔ رات کے نو بجے وہ واپس گھر آئی تھی۔ گاڑی سے اتری تو عبدالصمد نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

''تم کہاں تھیں؟ کب سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔'' نیم روشنی میں گاڑی میں بیٹھے دونوں نفوس اس لڑکے کو ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہے تھے۔

''بھیا کے ساتھ باہر گئی تھی۔ چلو میں ملواتی ہوں تم اس دن بھی گھر سے غائب تھے۔'' وہ اسے لیے گاڑی تک آئی اور تینوں کا آپس میں تعارف کروایا۔ ابصار کا انداز تو نارمل تھا لیکن عائش کو عبدالصمد کا یوں رابیل سے اتنا بے تکلف ہونا کھلنے لگا۔

''اب چلو، مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' وہ اسے تیزی سے لیے بیرونی گیٹ عبور کر گیا۔ عائش نے پرسوچ انداز سے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔

''کیا بات کرنی ہے تمہیں؟'' اسے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے وہ بے زاری سے بولی۔

''تم اس ریشم کو جانتی ہو نا، جس کا گھر گلی کے نکڑ پر ہے۔'' وہ بے قرار تھا اسے داستان سنانے کے لیے۔

''ہاں جسے تم ہر وقت فون کرتے تھے۔'' اس نے مکھی اڑائی۔ جیسے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

''ہاں فون اسی کی طرف سے آتے تھے مجھے۔ وہ ہی پیچھے پڑی تھی میرے۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟'' اسے اس کی کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''اس کی شادی طے ہو گئی ہے۔'' وہ افسردگی سے گویا ہوا۔

''تو......تم رکوا دو۔ اپنے والدین کو اس کے گھر بھجواؤ۔ اگر نہیں تو بھگا لاؤ۔'' اس نے سنجیدگی سے حل پیش کیا۔

''نہیں شادی تو اس سے نہیں کرنی۔ وہ تو کوئی اسپیشل ہو گی۔'' اس نے بال کھجائے۔ رابیل نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

''تو پھر۔''

''تو پھر اس سے جان چھوٹی میری۔'' وہ ہلکا پھلکا ہو کر ہنسنے لگا۔ وہ ہمیشہ اسے ایسی بے کار باتوں میں الجھا دیا کرتا تھا۔

''تم بہت الو ہو۔'' اسے غصہ آیا۔ وہ کتنی فالتو باتوں کے پیچھے کتنا وقت برباد کرتا تھا۔

''مزہ آتا ہے۔'' اس نے انگڑائی لینے والے انداز میں ہاتھ اونچے کیے۔

''تم ایک دن میرے ہاتھوں قتل ہو گے۔'' اسے دھکا دے کر وہ آگے بڑھ گئی۔

☆......☆

''السلام علیکم۔'' کوریڈور میں محمد شفیع ان سے ٹکرا گئے تھے۔ عائش نے انہیں پرتپاک انداز میں سلام پیش کیا تھا۔ انہوں نے بغور ان دونوں کو دیکھ کر سنجیدگی سے سلام کا جواب دیا۔

''انکل! ہم رابیل سے ملنے آئے ہیں۔'' جواز بھی عائش نے پیش کیا۔ ابصار کے تاثر سپاٹ تھے۔

''ہاں......وہ اپنے روم میں ہوگی۔'' انہوں نے اس کے روم کی جانب اشارہ کیا تو عائش ان سے ایکسکلیوز کرتا ہوا ابصار کے ہمراہ رابیل کے روم کی جانب بڑھ گیا۔

''میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ سنڈے کو رہنے دو، وہ گھر پر ہوں گے۔'' ابصار نے عائش کو آڑے ہاتھوں لیا۔ عائش کو ہوٹل کے روم میں گھٹن ہو رہی تھی وہ ابصار کو منت سماجت کر کے وہاں لے کر آیا تھا۔ عائش، رابیل کو پہلے ہی اطلاع دے چکا تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر چہک اٹھی۔

''بھیا! ٹیرس پر آجائیں۔ آپ کے لیے ایک چھوٹا سا سرپرائز ہے۔'' لکڑی کے گول میز پر چائے کے ساتھ ڈھیر سارے لوازمات سجائے ہوئے تھے۔ ان کی خوشبو ہی عائش کے پیٹ میں کھلبلی مچا رہی تھی۔ وہ تینوں چیئرز پر براجمان ہوگئے۔

''کیسا لگا؟'' اس نے ابصار سے پوچھا۔

''بہت اچھا۔'' اس نے امپریس ہونے والے انداز میں کہا۔ عائش تو شروع ہو چکا تھا جب کہ ابصار اور رابیل باتوں میں مصروف تھے۔ ابصار کا فون رنگ کرنے لگا۔ اس نے فون نکال کر ریسیو کیا۔ پھر اس نے فون بند کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''رابیل! ضروری کال ہے۔ مجھے جانا پڑے گا۔'' وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

''نہیں بھیا! آپ اس طرح سے کیسے چلے جائیں گے انہیں منع کر دیں۔'' افسردہ ہوگئی۔

''جانا تو میں بھی نہیں چاہتا مگر بہت ضروری ہے۔'' انہوں نے پیار سے پچکارا۔

''پلیز بھیا! تھوڑی دیر۔'' آنکھوں میں کس قدر التجا تھی۔

''پلیز سمجھا کرو گڑیا۔'' وہ مجبور تھا اس نے ابصار کی مجبوری سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''تمہیں چلنا ہے؟'' ابصار نے عائش کو مخاطب کیا۔ اس نے سر نفی میں ہلایا۔ وہ رابیل کا چہرہ پڑھ چکا تھا۔ وہ بہت افسردہ ہوگئی تھی۔ وہ اسے ابصار والی خوشی تو نہیں دے سکتا تھا مگر اس کا بوجھ گھٹانے کے لیے کوشش تو کر سکتا تھا۔ ابصار چلا گیا۔ وہ افسردہ سی غائب دماغی سے بیٹھی رہی۔

''کیا یہ سب تم نے خود بنایا ہے؟'' اس نے مختلف لوازمات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ اس نے سر نفی میں ہلایا۔

''اس کا مطلب تمہیں کھانا پکانا نہیں آتا؟''

''نہیں! یہ سب ماما نے بنایا ہے۔ مجھے کچھ بھی نہیں آتا۔ چائے کافی بھی نہیں۔''

''مجھے بھی کچھ نہیں آتا۔ ہاں مگر ابصار کافی کچھ بنا لیتا ہے۔'' ابصار کے ذکر پر اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''کیا کیا؟''

''اسے انڈا ابالنا آتا ہے، چائے اور کافی بنا لیتا ہے اور آملیٹ جب کہ اسے بریانی، نہاری، چکن قورمہ، مٹن کڑاہی، کھیر......'' وہ انگلیوں پر گنوا رہا تھا۔ رابیل کے کان کھڑے ہوگئے۔

''وہ یہ سب بنا لیتے ہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں یہ سب ہی تو نہیں بنا سکتا نا۔'' وہ ہنسنے لگا۔ وہ بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گئی تھی۔

''ویسے تم اپنے بھیا کے پاس دبئی میں رہنا چاہتی ہو؟'' وہ سنجیدہ ہوا۔ رابیل نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

''میرا گھر ابصار کے گھر کے قریب ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا تمہارا گھر ان کے گھر کے قریب ہے۔'' اس کی آنکھیں چمکیں۔

''ہاں۔''

''ان کے گھر پر کون کون رہتا ہے؟'' اسے اپنے مطلب کا موضوع ہاتھ لگ گیا تھا۔

''ابصار...... اس کے پاپا اور...... دو ملازم۔''

''اور کوئی نہیں؟'' اسے تجسس ہوا۔

''اور کوئی نہیں ابصار نے بھی ابھی تک شادی نہیں کی۔'' اس نے سوچتے ہوئے بتایا۔

''نہیں میرا مطلب...... پاپا نے دوسری شادی نہیں کی۔'' اسے ہمیشہ لگتا تھا کہ پاپا نے بھی شادی کر لی ہوگی۔

''نہیں تو۔'' عائش کو اس کی بات عجیب لگی۔ وہ سوچوں میں گم ہو گئی۔

''پاپا مجھے یاد نہیں کرتے؟ میرا بہت دل کرتا ہے ان سے بات کرنے کا۔ کیا تم میری ان سے بات کروا دو گے؟'' وہ التجائیہ لہجے میں بولی۔ عائش نے اسے بغور دیکھا اور پھر سر ہلا دیا۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ابصار کا گھر میرے گھر کے بالکل قریب ہے تو اگر آپ میرے گھر آنا چاہیں......''

''آپ کے گھر؟ کیوں؟''

''سمجھ جاؤ خود۔'' وہ مصنوعی شرمایا اور جب اس کی بات کا مطلب رابیل کو سمجھ میں آیا تو اس نے منہ چڑایا۔

''چلو اب جاؤ تم بھی واپس، بہت زیادہ بولنے لگے ہو۔'' اس کی باتوں سے عجیب سا احساس جاگ رہا تھا۔ دھڑکنوں میں دھیمی دھیمی ترنم بج رہی تھی۔

''ٹھیک ہے جا رہا ہوں مگر پھر بھی اس بارے میں ضرور سوچنا۔'' وہ جاتے ہوئے معنی خیزی سے بولا۔ اس کے جانے کے بعد وہ بھی کھل کر ہنس دی، زندگی ایکدم ہی رخ بدل رہی تھی۔

☆......☆

وہ بہت دیر سے اس کا منتظر کھڑا تھا۔ وہ کالج گیٹ سے نکل کر سیدھی اس کے پاس آئی تھی۔ سفید یونیفارم میں شولڈر کٹ بالوں کی ٹیل پونی باندھے، وہ بہت سادہ اور معصوم لگ رہی تھی۔ عائش نے اس کے لیے گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گزشتہ شب اس نے رابیل کو فون کال کی تھی کہ وہ اس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے مگر ابصار کی غیر موجودگی میں۔ وہ مان گئی تھی۔

''طبیعت کیسی ہے؟'' اس کے خاموش وجود کو ایک نگاہ دیکھ کر اس نے استفسار کیا۔

''بالکل ٹھیک ہوں۔'' سر سیٹ کی پشت سے ٹکائے ہوئے جواب دیا۔ اس نے گاڑی ریسٹورنٹ پر روکی۔

''ہم گاڑی میں بیٹھ کر بھی بات کر سکتے ہیں۔'' اس نے ریسٹورنٹ میں جانے سے اعتراض کیا۔

''ٹھیک ہے۔ جیسا تمہیں بہتر لگے۔'' اس نے کندھے اچکا کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''رابیل! تم دوسری لڑکیوں سے ذرا ہٹ کر ہو۔'' وہ ڈیش بورڈ پر نگاہیں جماتے ہوئے بولا۔

''مطلب؟'' رائیل نے اپنی صحت کی طرف دیکھا۔

اوہ ہو، غلط مت سمجھو، میرا مطلب تھا کہ مجھے اچھی لگتی ہو تم۔'' اس کے بگڑتے تاثرات کو دیکھ کر وہ تصحیح کرنے لگا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی شرمانے لگی۔ پھر اس نے رخ موڑ لیا۔ مبادہ وہ عائش اس کا چہرہ نہ پڑھ لے۔ ''تم بہت معصوم ہو اور بھولی بھی دنیا کی اصل پہچان نہیں ہے ابھی تم میں۔ تمہیں بس خود سے غرض ہے۔ مجھے یہ سب اچھا لگتا ہے۔'' وہ اپنے سچے دلی جذبات بیان کر رہا تھا۔ اس کے لفظوں میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ اسے ایسا ہی لگنے لگا تھا کہ رائیل ہی وہ لڑکی ہے جسے وہ اپنی ہمسفر بنا سکتا ہے اور اس کے ساتھ خوش رہ سکتا ہے۔

''اور سب سے زیادہ جو مجھے تم میں پسند ہے اور جو مجھے اسیر کر دیتا ہے۔'' زیرلب مسکراتے ہوئے اس کے رخ موڑے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

''وہ کیا؟'' وہ یکدم مڑی تھی۔ اس کی تمام تر حسیات الرٹ ہو چکی تھیں۔ وہ عائش سے اس کے دل کی بات سننا چاہتی تھی۔ اتنے کم وقت میں اس نے اس پر کیا جادو کیا تھا کہ وہ اس کے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے بہت کم وقت میں رائیل کو مکمل اپنا بنا لیا تھا۔

''تمہاری آنکھیں۔'' وہ جھٹ بولا۔ پلکوں کی بھری جھالر جھک گئی۔

''میں بہت جلد اپنے والدین کو پاکستان بھجواؤں گا تمہاری ماما سے بات کرنے کے لیے۔'' وہ حتمی انداز میں بولا۔

''بات کرنے کیوں؟''

''تاکہ پھر تم ہمیشہ کے لیے میرے گھر آسکو۔'' وہ جز بز ہوئی۔

''میں تمہارے گھر کیوں آؤں گی۔ میں تو اپنے بھیا کے گھر جاؤں گی۔'' وہ فخریہ بولی۔

''ارے......'' اس نے آنکھیں دکھائیں تو وہ شرم کی لالی اوڑھے ہنسنے لگی۔ پھر اس نے اپنے کوٹ کی پاکٹ سے ایک گولڈ رنگ نکالی۔

''کیا میں یہ تمہیں پہنانے کا حق رکھتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''پہنا تو سکتے ہو لیکن یہ رشتے معمولی نہیں ہوتے۔ یہ حق تو ہمارے بڑوں کو حاصل ہے۔'' اس نے سلجھے ہوئے لہجے میں سمجھایا۔

''مجھے بس تمہارا جواب چاہیے۔'' وہ بضد ہوا۔

''میرا جواب تو تمہیں معلوم ہو ہی چکا ہے میں بس چاہتی ہوں کہ یہ رنگ تم مجھے دنیا کے سامنے پہناؤ۔ یوں اکیلے میں نہیں۔''

''میرے لیے یہ اہمیت رکھتا ہے کہ تم راضی ہو، باقی دوسروں کو منانا اتنا مشکل نہیں، میں بہت جلد تمہیں یہ سب کے سامنے پہناؤں گا۔'' وہ پُریقین لہجے میں بول رہا تھا اور رائیل کو محسوس ہو رہا تھا کہ خوشیاں اس کے قدموں میں ہیں۔ بس انہیں سمیٹنے کی دیر تھی۔ اسے خود پر رشک ہو رہا تھا۔ اسے اپنا پن مل رہا تھا۔ عائش کی اس قدر اہمیت دینا اسے فخر کا باعث لگ رہا تھا۔ وہ مسکرانے لگی۔ وہ عائش سنگ آسمان میں اڑنے لگی۔

☆......☆

''کیا بات ہے عائش؟ نمبر کیوں آف آرہا ہے تمہارا بھی اور بھیا کا بھی؟'' اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ عائش کے بارے میں بھیا کو بتا دے گی۔ وہ صبح سے ٹرائی کر رہی تھی مگر ان دونوں کے نمبر بند آرہے تھے۔ وہ پریشان تھی کہ کال

آ گئی تھی اس نے عجلت میں فون کان سے لگایا۔ عائش کی آواز سن کر اس کی جان میں جان آئی۔
"رابیل ہم واپس دبئی آ گئے ہیں۔" مخاطب نہایت سستی سے بول رہا تھا۔ رابیل کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔
"یہ کیا مذاق ہے عائش۔" اس کا چہرہ اتر گیا۔
"کوئی مذاق نہیں ہے رابیل سوسوری، اس میں میرا قصور نہیں ہے۔ مجھے ابصار نے خدا کا واسطہ دے رکھا تھا کہ میں واپس جانے کا ذکر نہ کروں۔" وہ اس کی افسردگی بھانپ گیا تھا۔ وہ خوب سمجھ سکتا تھا۔
"بھیا نے ایسا کیوں کیا؟" اسے بہت حیرت ہو رہی تھی۔
"وہ کہہ رہا تھا کہ تم بہت اداس ہو جاؤ گی اور اسے جانے سے روکو گی۔" واقعی میں اگر ابصار جانے کی بات کرتا تو وہ اس کی رکاوٹ بنتی۔
"اس بات سے زیادہ دکھ مجھے ان کے نہ بتانے سے ہوا ہے۔ بھیا مجھ سے مل کر بھی نہیں گئے۔" اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔
"پلیز رابیل! کنٹرول یور سیلف، میں تمہارے ساتھ ہوں اور میں ابصار کو سمجھاؤں گا۔ بہت جلد ہم دوبارہ پاکستان آئیں گے۔" وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔ وہ رابیل کے دل میں ابصار کے لیے سچے جذبات دیکھ چکا تھا مگر بہت جلد محسوس کر چکا تھا کہ ابصار کو رابیل سے وہ محبت نہیں رہی جو وہ اس سے بچپن میں کرتا تھا۔ رابیل پر جان چھڑکنے والا ابصار بدل گیا تھا۔ وہ آج کا ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ اسے کسی سے غرض نہیں تھی سوائے اپنے کام سے اگر رابیل سے لگاؤ تھا بھی تو ایک حد تک۔
"تم پلیز...... پلیز مجھے بھیا کا نمبر دو۔ مجھے ان سے بات کرنی ہے۔" وہ رونے سے خود کو روک رہی تھی اور سب ٹھیک ہے کا ورد کر رہی تھی۔

☆......☆

"ہیلو...... ہیلو بھیا! میں رابیل بات کر رہی ہوں۔" بہت بار فون کرنے کے بعد اس نے فون کال ریسیو کی تھی اور فون ریسیو ہوتے ہی وہ بول پڑی تھی۔
"ہاں رابیل کیسی ہو؟" وہ مصروف انداز میں بولا۔
"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟ فون ریسیو کیوں نہیں کر رہے تھے؟" وہ پریشانی سے بے حال تھی۔ یہ کیسی منزل پر وہ آ کر کھڑی ہو گئی تھی کہ ایک خواب کی طرح بھیا اس کے پاس آ گئے اور پھر یوں اچانک چھوڑ کر چلے گئے۔
"میں بہت بزی تھا گڑیا۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔
"اپنا بہت خیال رکھا کریں اور حد سے زیادہ کام مت کیا کریں۔" اسے ابصار پر پیار آنے لگا۔ وہ دھیما مسکرا دیا۔
"بھیا! آپ پاکستان کب آئیں گے؟"
"آنے کی کوشش کروں گا۔" اس کی آواز میں ٹھہراؤ آ گیا۔
"آپ اس طرح بتائے بغیر چلے گئے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ مجھے کیسا لگے گا۔" وہ دلار سے شکایت کرنے لگی۔
"بس اچانک جانا پڑا۔"
"میں نے جو گفٹ آپ کے لیے خریدے تھے وہ بھی آپ نہیں لے گئے۔"
"ٹھیک ہے جب دوبارہ آؤں گا تو لے جاؤں گا۔" رابیل کو شاید ابھی تک اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ ابصار کے لیے یہ

سب چیزیں بے معنی تھیں۔ اس کے لیے رابیل کے خریدے گئے سستے گفٹ کوئی اہمیت نہیں رکھتے وہ تو ابھی بھی بچپن کے انہی دنوں میں قید تھی وہ تو باہر ہی نہ نکل پائی تھی کہ سب کچھ فوراً قبول کر سکے۔

''اور ماما بھی آپ کے چلے جانے پر شکوہ کر رہی تھیں۔''

''وہ کیوں شکوہ کر رہی تھیں؟ ان کے پاس تم ہو ناں، مجھے تو وہ بچپن میں ہی خود سے جدا کر چکی تھیں۔'' وہ بہت تلخ ہو گیا۔ وہ اتنے تلخ الفاظ پہلی بار سن رہی تھی۔ اسے ابصار کے دکھ کا بہت اچھی طرح سے احساس تھا۔

''میں سمجھ سکتی ہوں بھیا۔'' وہ منہ میں ناخن چبانے لگی۔

''ٹھیک ہے گڑیا! میں تھوڑا بزی ہوں، اپنا خیال رکھنا پھر بات کریں گے۔'' اس نے کال ڈسکنکٹ کر دی تھی۔ رابیل کے دل سے بہت بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

☆......☆

''رابیل!'' وہ راہداری سے گزر رہی تھی کہ محمد شفیع نے اسے اپنے روم سے پکارا۔ رابیل نے مڑ کر ان کی جانب دیکھا۔ وہ بیڈ پر لیٹے کراہ رہے تھے۔ وہ گزشتہ دو دنوں سے بیمار تھے۔

''ذرا اپنی ماما کو تو بلانا۔'' وہ سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے کبھی بھی برداشت نہیں ہوا تھا کہ ماما، محمد شفیع کے ساتھ بیٹھیں۔ ان سے باتیں کریں یا ان کی خدمت کریں محمد شفیع شدید تکلیف میں مبتلا تھے مگر وہ اپنا دل اتنا پتھر کا بنا چکی تھی کہ اسے ان کی تکلیف سے بھی کوئی تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ہونٹ بھینچ کر وہاں سے چل دی۔

تمام افراد ڈائننگ ٹیبل پر ناشتا کر رہے تھے۔ ماما بھی وہاں موجود تھیں۔ وہ روز کی طرح اپنی مخصوص کرسی پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس وقت ہر طرف مکمل خاموشی تھی۔ ہر فرد خاموشی کے ساتھ ناشتا کر رہا تھا۔ ماما نے اسے بھی ناشتا سرو کیا کہ ملازمہ تیزی سے ماما کی جانب آئیں۔

''وہ...... شفیع صاحب کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔'' ملازمہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ماما فکرمندانہ انداز میں بڑے بڑے ڈگ اٹھاتی ہوئی ان کے روم کی جانب دوڑیں۔ اس نے زہر کا گھونٹ بھرا احسن بھی ماما کے پیچھے پیچھے گیا تھا۔ وہ ناشتا شروع کر چکی تھی جب ماما طیش میں اس کی جانب آئی تھیں ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''تمہارے پاپا نے جب تمہیں کہا کہ مجھے بلا کر آؤ تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' وہ اس کے سر پر کھڑی تھیں۔ وہ رابیل کی اس طرح ہٹ دھرمی سے نالاں ہو چکی تھیں۔

''وہ میرے پاپا نہیں ہیں۔'' وہ ہونٹ بھینچ کر بولی۔ اس نے کبھی بھی یہ بات قبول نہیں کی تھی کہ محمد شفیع اس کے پاپا ہیں۔ اس کی نگاہ میں اس کا ایک ہی باپ تھا جن سے اس کی ماما کی علیحدگی ہو چکی تھی۔

''تم اتنی پتھر دل کیسے ہو سکتی ہو؟ انسانیت بھی نہیں رہی تمہارے اندر۔'' انہوں نے رابیل کو بہت بری طرح جھنجھوڑا تھا۔ وہ اذیت کی انتہا پر تھیں۔ رابیل کی ہوائیاں اڑ گئی تھیں۔ اس کی نرم طبیعت ماما ہمیشہ پیار دینے والی آج سب کے سامنے اسے رسوا کر رہی تھیں۔ محمد شفیع کی خاطر اسے اذیت دے رہی تھیں۔

''ہاں! نہیں ہے مجھ میں انسانیت۔ پتھر ہے دل میرا، آپ کی طرح اتنا بڑا دریا دل نہیں ہے میرا کہ دوسروں کا بوجھ بھی اپنے سر اٹھاؤں۔'' وہ بدتمیزی پر اتر آئی تھی۔ رفعت سے اس کی اس قدر بدتمیزی برداشت نہیں ہو پا رہی تھی۔

''رابیل! خاموش ہو جاؤ ورنہ میں بہت کچھ بول جاؤں گی۔'' وہ اشتعال میں شہادت کی انگلی دکھا کر بولیں۔ عمار، احسن اور ہانیہ ساکت کھڑے تھے۔

"آپ ہمیشہ مجھے ہی چپ کرواتی آئی ہیں اپنی بیٹی کو ایک آزاد زندگی جینے کا حق بھی نہیں دلا پائیں آپ اور اب بھی چپ ہونے کے لیے بول رہی ہیں۔" وہ پھٹ پڑی تھی۔

"اگر اسی طرح آپ پاپا کے ساتھ سمجھوتا کرتیں تو آج سب کچھ ٹھیک ہوتا، میری شخصیت میں یہ ادھورا پن نہ ہوتا، میں احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوتی، میرے بھیا میرے ساتھ ہوتے مگر سب ختم کر دیا آپ کی انا نے۔ محض اپنی ضد اور انا کو او نچا رکھنے کے لیے محمد شفیع کے ساتھ بھی تو سمجھوتا کر رہی ہیں نا، ان کے تین بچوں کی پرورش بھی تو کر رہی ہیں ناں؟" وہ رنجیدہ تھی۔ زار و قطار رو رہی تھی۔ رفعت ساکت و جامد کھڑی تھیں وہ ہمیشہ کٹتی ہوئی آئی تھی، اس وقت اسے موقع ملا تھا اپنے دل کا ہر غبار نکالنے کو۔

"میں اس سب کے لیے آپ کو معاف نہیں کروں گی۔" وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ عمار اور ہانیہ سہم گئے تھے۔ اتنا بڑا تماشا پہلی بار ان کے گھر میں ہوا تھا۔ رفعت نے اس کے ہاتھ چہرے سے ہٹا کر ایک زور دار طمانچہ اسے رسید کیا۔ وہ بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

کتنا برا ہو گیا تھا یہ سب وہ ماں بیٹی ایک دوسرے پر محبت لٹانے والیاں، آج ایک دوسرے کے مخالف کھڑی تھیں۔ اپنے سینے پر الگ الگ درد چھپائے رفعت طیش میں اور کچھ کرتی اس سے پہلے احسن درمیان میں آ گیا۔

"پلیز امی! بات ختم کریں۔ پلیز غصہ مت کریں۔" وہ رفعت سے التجا کر رہا تھا۔

"رابیل پلیز! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" احسن نے نرمی سے اسے کہا۔ اسے رابیل پر انتہا کا ترس آ رہا تھا وہ مکمل ہونے کے بعد بھی ادھوری تھی۔ وہ سسکتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور خود کو اندر بند کر دیا۔ اس دکھ کے زخم کو بھرنے میں وقت چاہیے تھا۔ وہ بری طرح سے گھائل ہو چکی تھی بیڈ پر اوندھے منہ لیٹے ان گنت آنسو بہائے۔

وہ پانچ سال کی تھی جب اس کے ننھے سے ذہن پر بہت بھاری بات ڈال دی گئی تھی کہ وہ اب اس گھر میں سب مل کر نہیں رہ سکتے۔ ماما اب پاپا کے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا ماما اور پاپا کے درمیان اختلافات دیکھے تھے۔ ماما کو ہمیشہ پاپا سے شکایتیں رہتی تھیں وہ گھر لیٹ آتے ہیں گھر کو اور بچوں کو وقت نہیں دیتے لیکن اس نے ہمیشہ پاپا کو صفائی دیتے سنا تھا کہ میں یہ ساری محنت بچوں کے لیے ہی تو کر رہا ہوں اس کے باوجود ماما ایک نا سنتیں وہ خفا خفا رہتیں، وہ اکثر پاپا کو بے بس پاتی تھی۔

وہ اکثر بھیا سے پوچھتی تھی۔ وہ صاف ٹال دیا کرتے تھے۔ ابصار اس سے چار سال بڑا تھا اور وہ اس سے خاصا سمجھدار تھا۔ وہ سب باتیں سمجھتا تھا وہ رابیل کے ننھے دماغ کے بوجھ کو بڑی صفائی کے ساتھ مٹا دیتا تھا۔

آخر بات بہت بڑھ گئی۔ ماما روز روز کی بحث سے تنگ آ گئیں۔ انہوں نے پاپا سے علیحدگی کا مطالبہ کیا۔ پاپا نے ہر کوشش کی بچوں کے واسطے دیئے مگر وہ اپنی ہی بات پر اڑی رہیں۔ وہ اس قدر نا پسند ہو گئیں تھیں کہ وہ اپنے بڑے بیٹے سے بھی دست بردار ہو جانا چاہتی تھیں۔ رابیل ان کے پاس رہے گی اور ابصار پاپا کے پاس یہ فیصلہ بھی رفعت کا تھا۔ وہ بہت کٹھور ہو گئی تھیں اور شاید تقدیر میں بھی یہ ہی لکھا تھا۔ پاپا بھیا کو لے کر دبئی چلے گئے اور وہ ماما کے ساتھ نانا اور نانی کے گھر آ گئی۔ جہاں نانا اور نانی کے علاوہ دو ماموں اور دو ممانیاں اور ان کے پانچ بچے تھے۔

ان دنوں وہ بہت رنجیدہ تھی۔ اس لیے وہ وہاں کسی اور بچے سے اٹیچ نہ ہو پائی تھی۔ تین ماہ بعد ہی ان دونوں کا وجود ممانیوں کو کھلنے لگا تھا۔ تب نانا اور نانی نے رفعت کو سمجھایا کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ تنہا زندگی بسر کرنا بہت مشکل ہے۔ جس کا اندازہ خود رفعت کو بھی ہو گیا تھا۔ وہ بہت منمنائی مگر پھر تقدیر نے انہیں محمد شفیع کے گھر کی جانب موڑا۔ ان کے تین

چھوٹے بچے تھے۔ ان کی پہلی بیوی وفات پا چکی تھیں اور ان کے خاندان والے ان کی دوسری شادی کروانا چاہ رہے تھے۔ یوں رفعت کی زندگی میں وہ چار نفوس شامل ہو گئے اور پھر اس کی وہ پہلے والی ضد ختم ہو گئی۔ ضد اور انا جیسے لفظوں کا دامن چھوٹ گیا۔ اس کا یہ ہی آخری ٹھکانا تھا اور اس کی بیٹی کا مستقبل۔ اس نے تسلیم کر لیا تھا انہوں نے سمجھوتا کر لیا تھا۔

انہوں نے محمد شفیع کے تینوں بچوں کو دل سے قبول کیا اور سچی نیت سے انہیں اپنایا۔ تینوں بچے بہت اچھے اور سلجھے ہوئے تھے۔ محمد شفیع بھی ایک اچھے انسان تھے لیکن رابیل ان کو وہ مرتبہ نہ دے پائی۔ کیونکہ محمد شفیع نے اس پر پہلی نظر ہی سرد مہری سے ڈالی تھی۔ کیا ہوتا اگر وہ پیار سے اس کو پچکارتے۔ محبت تو پتھر کو بھی موم بنا دیتی ہے۔ رفعت نے بھی تو ان کے تینوں بچوں کو پیار سے اپنایا تھا۔

یہ وہ ہی دن تھا کہ رابیل کے دل و دماغ نے انہیں بطور باپ قبول ہی نہ کیا۔ وہ ان سے گھبراتی تھی۔ انہوں نے کبھی اس کے سر پر پیار سے ہاتھ نہیں پھیرا تھا۔ یہ بات دل ہی دل میں رفعت نے بھی تسلیم کی تھی۔ یہ بات رابیل کے دل میں خلاء پیدا کر گئی تھی۔ وقت گزرنے کے بعد بھی وہ اسی مقام پر کھڑی تھی۔ وہ کبھی آگے بڑھ ہی نہ پائی تھی۔ کبھی کبھی معمولی ضد میں انسانی انائیں بھی زندگیاں بدل دیتی ہے۔

☆......☆

جب دل سے بوجھ کچھ ہلکا ہوا اس نے سیل فون اٹھایا۔ وہ شدت سے ابصار کو یاد کر رہی تھی۔ وہ پچھلے کچھ دنوں سے اس کی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا اور اس کی وجہ عائش نے اس کا بے حد مصروف ہونا بتایا تھا۔

وہ دن رات ابصار کے لیے فکر مند تھی۔ اس وقت بھی غیر شعوری طور پر اس کے ہاتھ موبائل فون کے بٹن پر روانی سے چل رہے تھے۔ نمبر ڈائل کر کے اس نے فون کان سے لگایا۔ ایک وہ ہی تھا جس کے آگے وہ اپنے دل کا ہر راز، ہر غم رکھ سکتی تھی۔ کافی بیلز جانے کے بعد کال ریسیو کی گئی۔ مخاطب کی آواز بہت بوجھل تھی۔

"بھیا! کیسے ہیں آپ؟" کسی اپنے کی آواز سن کر اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"میں ٹھیک ہوں رابیل تم کیسی ہو؟" انہوں نے نیم غنودگی کے عالم میں پوچھا اسے فوراً اندازہ ہو گیا تھا۔

"بھیا! آپ سو رہے تھے؟" اسے شرمندگی کا احساس ہونے لگا کہ اس نے ابصار کی نیند خراب کر دی۔

"ہاں!" بہت تھکا ہوا لہجہ تھا۔

"ٹھیک ہے آپ آرام کریں میں بعد میں بات کروں گی۔" وہ نرمی سے بولی۔ ابصار نے "ٹھیک ہے" بول کر کال ڈسکنیکٹ کر دی اور وہ یک ٹک فون کو دیکھتی رہی۔ وہ بھیا کی بوجھل آواز سمجھ گئی تھی لیکن وہ اس کی آواز میں در آنے والی نمی محسوس نہیں کر پائے تھے۔

دو نم موتی آنکھوں سے ٹپک پڑے تھے۔ پھر اس نے عائش کا نمبر ڈائل کیا۔ بیل بجتی رہی مگر اگلی جانب سے ریسیو نہیں کی گئی۔

یہ وقت کے اتنے خوب صورت ساتھی پردیس جا کر آسمانوں میں کہیں اس طرح کیوں کھو جاتے ہیں اس نے سرد سانس کے ساتھ حسرت سے سوچا۔ دیر تک وہ موبائل فون کو گھورتی رہی کہ کچھ وقت بعد اس کے فون پر کال بیل ہونے لگی۔ اسکرین پر عائش کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے بنا تاخیر کیے فون ریسیو کیا۔

"کیسی ہو؟" وہ اپنی عادت کے برخلاف سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ بھی نرم ہو گئی۔

''سوری میں مما کے روم میں تھا اور میرا فون میرے روم میں تھا۔ اس لیے تمہاری کال ریسیو نہ کر پایا۔'' اس نے وجہ فوراً بیان کر دی اور وہ خود بھی جانتی تھی کہ کوئی ایسی وجہ ضرور ہوگی جو اس نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ چلتی ہوئی ٹیرس پر آ گئی۔

''رابیل میں نے لیٹ اس لیے کال کی کیونکہ میں تمہیں کال بیک کرتا اس سے پہلے ابصار نے مجھے اپنے پاس بلا لیا ارجنٹ۔'' وہ بہت سنجیدگی سے اور دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔

''اچھا! تم بھیا کے پاس گئے تھے۔ میں نے بھی کال کی تھی مگر بات نہیں ہو پائی۔ وہ آرام کر رہے تھے۔'' وہ فضا میں لمبی سانس لے رہی تھی گھٹن میں کچھ کمی آ رہی تھی۔

''میری بات دھیان سے سنو رابیل! میں بہت اپ سیٹ ہوں تمہارے لیے۔'' وہ افسردگی سے بول رہا تھا۔ وہ ان حالات سے افسردہ تھا جو ابصار نے پیدا کر دیئے تھے۔

وہ ٹہلتے ہوئے رک گئی۔ اتنا سنجیدہ اس نے عائش کو کبھی نہیں پایا تھا۔

''ابصار نے مجھے اس لیے بلایا تھا کہ میں تمہیں سمجھا سکوں کہ......'' وہ رک گیا۔ خود میں ہمت و حوصلہ مجتمع کر رہا تھا۔ وہ اس طرح اس معصوم لڑکی کا دل کیسے توڑ سکتا تھا۔ یہ کیسا کام اسے ابصار نے تھما دیا تھا۔

''کیا سمجھا سکو؟'' وہ سپاٹ تاثر لیے پوچھ رہی تھی۔

''وہ ابصار اب بالکل الگ ہے اس ابصار سے جو تمہارے ساتھ بچپن میں ہوا کرتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی شخصیت سے وہ لچک ختم ہو گئی ہے۔ وہ تم سے محبت تو کرتا ہے مگر تمہاری طرح نہیں، اس کی زندگی بزنس سے شروع ہوتی ہے اور بزنس پر ختم ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کو بہت مشکل سے ٹائم دے پاتا ہے اور تم اسے بار بار فون کرتی ہو۔ اس نے صاف صاف لفظوں میں کہا ہے کہ وہ ڈسٹرب ہوتا ہے۔'' عائش نے اس کی سماعتوں پر دھماکا کیا۔ وہ بے یقینی کی حالت میں سر نفی میں ہلانے لگی۔

''یہ بہت ہی دکھ والی بات ہے تمہارے لیے۔ مجھے تمہیں یہ سب کہتے ہوئے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ وہ تمہیں براہ راست منع نہیں کرنا چاہتا تھا اسی لیے آج مجھے بلا کر یہ کام میرے ہاتھوں تھما دیا۔ میں بھی بہت حیران تھا۔ میں نے اسے سمجھانے کی بھی بہت کوشش کی وہ نہیں سمجھا بہت ضدی ہے۔''

وہ عائش کی آواز میں گھلے دکھ کو واضح محسوس کر رہی تھی لیکن وہ اپنے دکھ کا کیا کرتی۔ اتنا حسین خواب کوئی آنکھوں میں سجا کر اب نوچنے جا رہا تھا۔

بھیا! جو نام ہی کافی تھا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرنے کے لیے۔ آج وہ ان پر بھی بوجھ بن گئی تھی۔

''مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا عائش! میں ایک بار ان سے بات کرنا چاہتی ہوں پلیز۔'' وہ بے اختیار ہو کر رو پڑی۔

''کاش...... میرے ہاتھوں میں ہوتا۔ اب تو اس نے نمبر بھی بند کر دیا ہے اور مجھے بھی اپنی دوستی کے واسطے دیئے ہیں۔'' وہ مجبور تھا۔

''رابیل! بہتر ہے تم اسی بات سے اندازہ لگا لو اور پیچھے ہٹ جاؤ۔ خود کو سمجھاؤ پلیز۔'' وہ اس کی سسکیاں سن رہا تھا۔

''پلیز مت رو، ان لوگوں کے لیے آنسو مت بہاؤ جن کو ان کی قدر نہیں۔ تم گھبراؤ نہیں میں اب بھی تمہارا وہی مہربان ساتھی ہوں، تم ہمیشہ ہر مدد مجھ سے لے سکتی ہو۔'' وہ اسے حوصلہ دے رہا تھا۔

''میں بہت جذباتی ہو گیا تھا جس وجہ سے میں نے ابصار کے سامنے اپنے دل کی بات بھی رکھ دی۔ پہلے وہ خوب

حیران ہوا پھر اس نے مجھے یہ فیصلہ لینے سے سختی سے منع کیا۔ وہ نہیں چاہتا کہ تم دبئی آؤ۔" وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔
"مگر تم فکر مت کرو۔ میں بہت جلد اپنے پیرنٹس کو پاکستان بھیجوں گا۔" وہ اپنی بات پر اب بھی قائم تھا۔ اس نے فون سوئچ آف کر دیا تھا۔

شام کے سائے لہرا رہے تھے۔ زردی مائل سورج دھیمی رفتار سے اونچے اونچے پہاڑوں کی اوٹ میں منہ چھپا رہا تھا۔ وہ دن اس کے لیے بہت درد بھرا تھا۔ اس کے لیے بہت سی حقیقتوں کو قبول کرنا بہت مشکل تھا۔
عائش کا ہر لفظ سچا تھا۔ وہ خود بھی تو بھیا سے بات کرتے ہوئے محسوس کرتی تھی کہ وہ دل سے بات نہیں کرتے۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر وہ فون بند کر دیتے تھے۔ وہ دیوار سے ٹیک لگاتی ہوئی نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ وہ کھلے آسمان کے نیچے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

☆......☆

کئی گھنٹے گزر گئے تھے۔ وہ وہیں ٹیرس کی دیوار سے ٹیک لگائے جھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ رات کے جانے کس پہر میں اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ صبح آنکھوں پر سورج کی نرم نرم شعاعیں اس کے چہرے کو چھونے لگیں تو اس نے غنودگی سے آنکھیں کھول کر غائب دماغی سے چاروں جانب دیکھا۔ دماغ پر زور دینے پر اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اعصاب نہایت تھکان سے چور ہو رہے تھے۔ رونے کی وجہ سے اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ چلنے میں کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر اٹھی اور کمرے میں آ گئی۔ وال کلاک صبح کے ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی۔
وہ یک ٹک سوچنے لگی کہ اسے اب خود کی ذات کو مزید بکھیرنے نہیں دینا، وہ خود کو مضبوط ڈور سے باندھ دینا چاہتی تھی۔ وہ بہت بھاگی تھی اس اڑتی ہوئی پتنگ کے پیچھے وہ خود کو بہت خوار کر چکی تھی۔ تھکان کے باوجود اس نے امید نہیں ہاری تھی مگر اب وہ اڑتی ہوئی پتنگ بہت پروان چڑھ چکی تھی۔ وہ واپس اس کے پاس پہلے کی طرح لوٹ کر نہیں آ سکتی تھی کسی بھی قیمت پر۔
اس کی آنکھیں درد سے بوجھل اور خشک ہو چکی تھیں۔ اس نے آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے زوردار چھینٹے مارے، چہرہ پونچھ کر اور اپنی حالت درست کر کے وہ ہال روم میں چلی آئی جہاں ڈائننگ ٹیبل پر تمام گھر کے افراد (علاوہ محمد شفیع) کے موجود تھے۔ سبھی نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ وہ بالکل نارمل انداز میں ان کے سامنے اپنی مخصوص جگہ پر آ بیٹھی۔ غصہ ہونے کے باوجود رفعت نے اس کے آگے اس کا ناشتا رکھا۔ اس وقت بالکل خاموشی تھی ہر فرد اپنے اپنے ناشتے پر جھکا تھا۔ ماما کی سرخ ہوتی آنکھیں وہ دیکھ چکی تھی۔ وہ بھی یقیناً اس کی طرح رات بھر روتی رہی تھیں۔ اس نے بہت زہر خند الفاظوں کا استعمال کیا تھا۔ اس نے بہت شدت سے محسوس کیا تھا وہ ان کے لیے اپنے دل میں درد محسوس کر رہی تھی۔ وہ ان سے معافی کی طلب گار تھی۔ اس سب کے لیے اسے تنہائی کا موقع درکار تھا۔ فی الوقت وہ چپ رہی۔
ناشتے کے بعد تمام افراد اپنی اپنی منزل کو چل دیے۔ وہ لان میں چلی آئی۔ غائب دماغی سے لہلاتے ہوئے کیاریوں میں لگے پھولوں کو تکنے لگی۔
"رابیل تم یہاں بیٹھی ہو؟ شکر ہے تم یہاں مل گئیں۔" صمد اس کی جانب آیا۔ اس کی محویت ٹوٹی اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ مسکراتی ہوئی شکل کے ساتھ کھڑا تھا۔
"اب کیا ہو گیا؟" وہ بے زاریت سے بولی۔ اس وقت ویسے بھی وہ تنہا رہنا چاہتی تھی۔

''کم آن! تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔ اٹھو چلو۔'' احسن اسے صبح ہونے والے تمام حالاتوں سے آگاہ کر چکا تھا اور صمد جانتا تھا کہ اس سب کے بعد وہ بہت اداس ہوگی۔ اسی غرض سے وہ اس کے پاس آیا تھا۔

''کیسا سرپرائز؟'' عام حالات ہوتے تو وہ شاید خوش بھی ہوتی اور اس کی گول گول آنکھیں چمک اٹھتیں لیکن اس وقت یہ سب چیزیں اس کے لیے بے معنی تھیں۔

''چلو تو ایک بار۔'' وہ کسی بھی صورت اسے لیے بنا وہاں سے جانے کو تیار نہ تھا۔ وہ ڈھیلے ڈھیلے قدم اٹھاتی ہوئی اس کے گھر میں داخل ہوئی۔ وہ اسے اپنے چھوٹے سے لان میں لے آیا اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھے جب صمد نے اس کی آنکھوں کے اوپر رکھے اپنے ہاتھ ہٹائے اور رابیل کی آنکھوں نے سامنے کا منظر دیکھا تو خوشی خود بخود اس کے چہرے اور آنکھوں کا احاطہ کرنے لگی۔

نیم کے تناور درخت میں جھولا لگا ہوا تھا جو کہ دو مضبوط رسیوں سے بندھا ہوا تھا۔ ان دونوں رسیوں پر گیندے کے پھول لپٹے ہوئے تھے۔ جن کی مہک پورے ماحول کو بہت خوش گوار اور تروتازہ بنا رہی تھی۔ وہ منظر بالکل ایک خواب کی مانند تھا۔

''کیسا لگا؟'' اس نے ابرو اچکا کر فخریہ پوچھا۔ جواباً وہ مسکرائی۔

''بہت خوب صورت ہے یہ صمد! آئی لائیک اٹ۔'' وہ چمکتی آنکھوں سے گیندے کے پھولوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

''تم بیٹھنا نہیں چاہوگی اس پر؟'' وہ اس کے پاس آیا۔

''ضرور۔'' وہ الفاظوں کو خاصا کھینچ کر بولی۔ وہ مسکراتی ہوئی اس جھولے پر آ بیٹھی۔ صمد اس کے عقب میں آ گیا اور جھولے کو پیچھے کی جانب کھینچ کر آگے کی جانب دھکیلا۔ جھولے کی تیز لہر سے وہ ہوا میں تیرنے لگی۔ دل جیسے ہر تکلیف سے ان لمحوں میں ہر فکر سے آزاد ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

''صمد تم نے کیا سوچ کر یہ جھولا میرے لیے بنایا؟'' اس نے ہوا میں لہراتے ہوئے پوچھا۔ لہجہ اور آواز دونوں شوخ ہو رہے تھے۔

''تم نے ایک بار مارکیٹ میں پینٹنگ میں بنے ہوئے اس طرح کے جھولے کی بہت تعریف کی تھی، تم اسے حسرت سے دیکھ رہی تھیں اس کے بعد میں بہت وقت سے سوچ رہا تھا کہ تمہاری وہ حسرت پوری کردوں مگر مصروفیات کی وجہ سے نہیں کر پا رہا تھا۔ جیسے ہی مجھے فری وقت میسر آیا میں نے یہ آپ کے لیے ارینج کر دیا اور وہ بھی خود اپنے ہاتھوں سے۔'' اس نے تفصیل سے بتایا۔ جھولا اسی روانی سے ہوا میں لہرا رہا تھا۔

''مگر کیوں؟ اتنی محنت میرے لیے؟'' وہ ہر جملے کے ساتھ گردن موڑ کر پشت پر کھڑے اس مہربان شخص کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''تمہاری خوشی کے لیے رابیل! صرف تمہارے لیے۔'' وہ جذباتیت سے بولا۔ رابیل کی خوشی تھم گئی۔

''تم کتنی اچھی طرح لڑکیوں کو پٹا لیتے ہو۔'' وہ اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ اس سے امپریس ہو رہی ہے۔

''بالکل نہیں۔ یہ سب میں نے کبھی کسی کے لیے نہیں کیا۔ یہ بہت اسپیشل ہے اور یہ صرف اسپیشلی تمہارے لیے۔'' اسے رابیل کا یوں کہنا برا لگا تھا۔ جھولے کی رفتار کم ہوتی گئی۔ صمد کے ہاتھ تھم گئے تو وہ مڑ کر اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''رابیل میں جانتا ہوں گزشتہ دن تمہارے لیے بہت مشکل گزرا۔ تم بہت اداس ہو، مجھے احسن نے سب کچھ بتا دیا

تھا۔" وہ شرمندہ سی خاموش رہی۔

"لیکن میں تمہیں اداس کیسے ہونے دیتا۔ یہ ایک چھوٹی سی کوشش تھی تمہیں اس اداسی سے کچھ وقت دور رکھنے کی۔" اس نے مضبوطی سے جھولے کی دونوں رسیوں کو تھام رکھا تھا۔ رابیل کا سر جھک گیا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں اس سب کے لیے۔ مجھے ماما سے اس طرح سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔" وہ صمد سے آنکھیں نہیں ملا پا رہی تھی۔

"تم سمجھو! رفعت چاچی کہیں بھی غلط نہیں ہیں جو غلطی انہوں نے ماضی میں کی تھی وہ اب دوبارہ نہیں کرنا چاہتیں۔ اسی لیے انہوں نے چاچا کے بچوں کو اپنا لیا، اگر وہ یہاں بھی بے جا ضدیں کرتیں ان کے بچوں کو نہ اپناتیں تو تمہارا آج وقت بہت مشکل سے گزرتا، وہ ہمیشہ سے تمہاری محافظ رہیں، تمہیں ایک اچھی زندگی دینے کے لیے انہوں نے بہت سی ذمہ داریاں خود پر سوار کرلیں وہ جو بھی کر رہی ہیں تمہارے لیے اور تمہارے بہن بھائی بھی سب اچھے ہیں۔ وہ تمہیں دل سے اپنا سمجھتے ہیں۔ تم بھی پلیز دل سے انہیں اپناؤ۔" وہ بہت اپنائیت سے سمجھا رہا تھا۔

"پلیز تم چاچی سے معافی مانگ لینا کیونکہ ماں جیسی اور کوئی ہستی نہیں ہے۔" وہ بہت سنجیدگی سے نرم لہجے میں گویا تھا۔ اسے صمد کو سننا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ تو اسے ہمیشہ ایک بے کار اور بے وقوف انسان سمجھتی تھی لیکن آج وہ سب سے زیادہ اس کے قریب تھا۔ جب اسے سب سے زیادہ ضرورت تھی کسی کی تب وہ اس کے پاس تھا۔

"تم بہت اچھے ہو عبدالصمد۔" اس نے بے اختیار صمد کا ہاتھ تھاما۔ وہ ایسی ہی تھی بالکل صاف دل جو ٹھیک لگتا وہ ہی کرتی۔ ہمیشہ اپنے دل کی سنتی۔ اسے دوسروں سے، دوسروں کی سوچ سے کوئی غرض نہیں تھی۔ صمد نے بغور اس کے ہاتھ میں تھامے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔

"تم بھی بہت پیاری ہو۔" وہ ہونٹ بھینچ کر بولا۔ وہ جھولے سے اٹھ گئی۔ اس کی گول گول آنکھیں خوشی و اطمینان سے چمکدار لگیں۔

☆......☆

"اس کے دل میں بہت غبار بھرا ہوا ہے۔ تم نے اس دن اس کو دیکھا، وہ کس طرح رو رہی تھی۔" وہ گھر میں داخل ہوئی تھی جب اس نے لان سے آتی ہوئی آواز سنی، لان بیرونی گیٹ کے دائیں جانب تھا اس نے مڑ کر اس جانب دیکھا احسن، ہانیہ کے ساتھ گھاس پر بیٹھا اس سے مخاطب تھا۔

"وہ اکیلے میں بھی تو ان سے بات کر سکتی تھی۔" ہانیہ کو رفعت کے لیے دل سے دکھ تھا اور اسے رابیل کی تمام باتیں ناخوشگوار گزری تھیں۔

رابیل کی جانب ان دونوں کی پشت تھی۔ وہ مجبور ہو گئی تھی اس طرح کی غیر اخلاقی حرکت کرنے کے لیے کیونکہ اس وقت ذکر اس کا ہو رہا تھا اور یہ اس کا انسانی تجسس فطری عمل تھا۔ وہ وہیں جامد کھڑی ہو گئی۔

"اور آپ نے دیکھا وہ کس طریقے سے ماما سے بات کر رہی تھی۔ میں نے ماما کو بہت دکھی دیکھا ہے اس کی وجہ سے۔ ماما انہیں سب سے زیادہ چاہتی ہیں مجھے ان کے لیے بہت دکھ ہے۔ شاید رابیل آپی کو احساس نہیں ہے کہ ماں کیا ہوتی ہے۔" ہانیہ بہت افسردہ تھی۔

"ہانیہ! مجھے بہت ترس آتا ہے رابیل پر۔ تم نے شاید اسے کبھی غور سے نہیں دیکھا۔ اس نے بہت کچھ کھویا ہے۔ بہت چھوٹی سی عمر میں اور جو کمی اس کی عہدِ طفولیت میں رہ گئی تھی وہ آج بھی اسے ویسے ہی محسوس کرتی ہے۔ وہ اسی

مقام پر کھڑی ہے کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ وہ کہیں نہ کہیں سمجھتی ہے کہ یہ ماما کی ضد کی وجہ سے ہوا اگر ماما کمپرومائز کرتیں تو آج میرے پاس سب کچھ ہوتا، میں ایک مکمل زندگی گزار رہی ہوتی اور وہ اسی سوچ کے مطابق سب کرتی ہے۔ وہ اسی نکتہ نظر کو لے کر چلتی ہے۔ اسی لیے اس نے کبھی بھی پاپا اور ہمیں قبول نہیں کیا۔'' وہ ساکت کھڑی اپنی ہی زندگی کے کھلتے ہوئے ورق سن رہی تھی۔ احسن نے کتنے اچھے طریقے سے اسے جان لیا تھا کیا وہ اس پر اتنی نظر رکھتا تھا؟

''ہوسکتا ہے آپ کا تجربہ درست ہو۔'' ہانیہ اتفاق کرتے ہوئے بولی۔

''اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ وہ کچھ ہمارے قریب آجائے تاکہ ہم اسے اس تکلیف سے دور کرسکیں اور میں دل سے اسے خوش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ دل کی بالکل بھی بری نہیں ہے۔'' وہ بہت سنجیدہ تھا۔

رابیل کو بہت اچنبھا ہوا تھا، ایک کشمکش سی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ بہت مشکل سے اپنا دماغ درست کر کے آئی تھی اور پھر احسن اور ہانیہ کے مابین ہونے والی گفتگو نے اسے مزید الجھن میں ڈال دیا تھا، اس کا دماغ گڈمڈ ہونے لگا تھا۔ اس کے لیے اصل میں فکر مند ہونے والا کون سا انسان تھا؟ اسے خوشیاں دینے کے لیے کون سا شخص خواہش مند تھا؟ کون زیادہ اچھا بھائی تھا؟ ابصار...... احسن...... ابصار...... احسن اس نے سر تھام لیا۔

☆......☆

وہ مصمم ارادہ کرچکی تھی کہ اب وہ کبھی بھی ماما سے کوئی شکوہ نہیں کرے گی اور اب اپنا دل صاف کرلے گی۔ کیونکہ آج تک ماما نے جو بھی کیا تھا اسی کے بہتر مستقبل کے لیے کیا تھا اس نے خود بھی تہیہ کرلیا تھا کہ وہ ماضی کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے گی۔

وہ ماما کے روم میں داخل ہوئی۔ وہ وہیں موجود تھیں۔ وہ الماری کھولے کھڑی تھیں۔ اس کی آمد کو انہوں نے یکسر نظر انداز کیا۔

''سوری ماما۔'' اس نے دونوں کان کو ہاتھ لگایا۔ رفعت نے اس وقت بھی اس کی موجودگی کو نظر انداز کیا اور اپنے کام میں مصروف رہیں۔ پر اتنا ضرور ہوا تھا کہ ان کے چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے۔ دکھ، اذیت، افسوس کے۔

''پلیز ماما۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ رفعت نے سرد سانس بھر کر اسے غصے سے دیکھا۔ شرمندگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

''میں، تم میں اپنی بیٹی کا عکس کھو چکی ہوں رابیل! بہت اذیت دی ہے تم نے مجھے۔'' وہ سرد مہری سے گویا ہوئیں۔ وہ تڑپ اٹھی۔ اس نے ہمیشہ ماما سے خود کے لیے میٹھے الفاظ سنے تھے۔ آج اس قدر سرد مہری اور لاتعلقی......! وہ خود رونے لگی۔

''آپ میرا سب کچھ ہیں ماما! میں کوئی ضد نہیں کروں گی اب، مجھے سب سمجھ آگیا ہے پلیز ایک بار معاف کردیں۔'' اندر سے رفعت بھی رو رہی تھیں۔

انہوں نے زندگی میں بہت اتار چڑھاؤ دیکھے تو من پسند شادی ہونے کے بعد بھی شوہر کی توجہ نہ ملی۔ وہ ہمیشہ ان کی توجہ کی طلب گار رہی۔ دو پھول جیسے جان سے بھی پیارے بچے تھے۔ انہوں نے ضد میں آکر ان کو تقسیم کردیا۔ یہ ان کا خدا ہی جانتا تھا کہ وہ اپنے ابصار کے لیے کتنا تڑپا کرتی تھیں، ان کے پاس صرف رابیل تھی جوان کی زندگی تھی۔ وہ اس کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو ہمیشہ نظر انداز کردیتی تھیں لیکن اس روز رابیل نے حد کردی تھی۔ اس نے بہت گہرا زخم دیا

تھا۔اس کے باوجود بھی ماں کا دل تھا اولاد کے آنسوؤں کو دیکھ کر پگھل رہا تھا۔
"تم وعدہ کرو" انہیں جیسے اس کے لفظوں پر یقین نہ تھا۔ رابیل نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ماما کے ہاتھوں کو دبایا۔ رفعت نے اسے گلے لگا لیا۔ وہ بھی تو اسی کی طرح بے حس رہی تھیں۔ رابیل سے دوری بالکل بھی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ ماما نے اسے دل سے معاف کر دیا تھا۔ اس کے دل کو سکون ملا تھا۔ بے چین روح کو قرار ملا تھا۔

☆......☆

"آج میٹھا کس خوشی میں بنایا ہے؟" احسن نے رابیل کے ہاتھوں میں کھیر کی ٹرے دیکھی تو چہک کر بولا۔
"بھیا! ضروری تو نہیں کہ خوشی ہو تو میٹھا بنایا جائے بلکہ میٹھا بنانا چاہیے تاکہ خوشی چل کر خود بخود آئے۔" وہ نہایت اچھے موڈ میں تھی۔ اس نے ٹیبل پر ٹرے رکھی اور پھر سب کو سرو کی۔
یہ چھ ماہ گزر جانے کے بعد والی رابیل تھی، جو بہت ہنس مکھ اور خوش مزاج ہو گئی تھی، اس نے احسن اور ہانیہ کے مابین ہونے والی جو گفتگو سنی تھی اس کے بعد اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ جن رشتوں کو بے معنی سمجھتی ہے وہ اصل میں اس کے لیے کتنی فکر کرتے ہیں۔
ابصار کے رویے پر وہ بہت ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے ایک ساتھ ڈھیر سارے آنسو بہا دیے تھے مگر ان آنسوؤں نے اس کے دل پر جمی تہہ کو بالکل صاف کر دیا تھا۔
اس کے بعد ایک روشن صبح ہوئی، اس روشن صبح کے ساتھ ہی اس نے نئے اور روشن فیصلے کیے۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ بہت غلط تھی اور اس نے زندگی غلط فہمیوں میں گزار دی تھی۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھی لیکن پھر بھی ابھی آگے جانے کتنی زندگی تھی۔ اس کے پاس موقع تھا کہ وہ صحیح راہ پکڑ لے۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا۔
ابصار اس کے بہت پاس ہو کر بھی بہت دور ہو گیا تھا اور احسن جو اس کے اتنے قریب تھا جس کا اسے احساس تک نہ تھا، وہ اس کے لیے اتنے مخلص جذبات رکھتا تھا۔ اس کے لیے متفکر تھا، اس کی ہر بے رخی کو نظر انداز کیے اس کی ذات کا تجزیہ کر چکا تھا۔
تو پھر بہتر بھائی کون تھا؟ ابصار...... احسن...... نے اس کی نظر میں دل میں بلند مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔
اور جہاں تک ایک ہمسفر منتخب کرنے کا فیصلہ تھا تو اس نے اس بارے میں بہت سوچا۔
کیا وہ ماما سے اتنا دور جا کر خوش رہ سکتی تھی؟ کیا وہ کم گو لڑکی پرائے لوگوں کے درمیان مطمئن ہو کر رہ سکتی تھی؟ اس سب کے بعد ابصار کا سامنا کرنا جب کہ ابصار نے رابیل سے بے زار ہو کر اسے ٹھکرا دیا تھا۔ عائش کے ساتھ زندگی گزارنے کے یہ تمام خیالات وہ کیسے جھٹک سکتی تھی۔ یہ تمام پہلو بہت گہرے سنجیدہ تھے اسے ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا تھا۔
عائش کے علاوہ ایک اور چہرہ بھی اسے نظر آ رہا تھا جو اس کے لیے شاید عائش سے بھی بہتر تھا۔ وہ وہی تھا جو بچپن سے اس کے آس پاس تھا۔ ہمیشہ اس کا اداس چہرہ مسکراہٹ سے سجا رہتا تھا جو اوٹ پٹانگ حرکتیں کر کے اور اپنی ہی ذات کو مذاق بنا کر اسے ہنساتا تھا جس کے پاس بہت ساری دولت نہیں تھی مگر وہ اپنے انداز سے لاکھوں کی خوشیاں خرید کر دیتا تھا۔
اس نے بہت سوچ سمجھ کر صمد کو چن لیا تھا، اسے صمد، عائش کے مقابلے میں ہر طرح سے بہتر لگا۔ وہ اسے بچپن سے

جانتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی عادات سے خوب واقف تھے۔ وہ صمد کے ساتھ رہ کر اپنی ماما اور اپنے ہم آشناؤں کے ساتھ رہ سکتی تھی۔ نئے سرے سے زندگی بسر کر سکتی تھی۔

اسے صمد سے پیار نہیں تھا مگر اس کی اچھائیوں نے اسے اس کے قریب جانے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ اس کا فیصلہ بالکل درست تھا، وہ اس کے ساتھ اب بہت خوش تھی۔ اس کی شخصیت نکھر رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اس نے اپنے تمام قریب تر رشتوں کو دل سے اپنایا تھا۔

عائش اس سے کسی طرح دست برداری نہیں چاہتا تھا۔ رابیل نے اسے آخری بار فون کر کے اپنے تمام فیصلوں کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ وہ اسے بہت سمجھا رہا تھا کہ ایسا نہ کرو، رابیل اپنے فیصلوں پر اٹل تھی۔ اس نے اپنی نئی راہ چن لی تھی۔ اس نے عائش سے دو ٹوک بات کی تھی۔

''صمد! میں سوچ رہا ہوں اس سنڈے کو ہم پوری فیملی کہیں پکنک کے لیے چلیں۔ ویسے تو ایک دوسرے کو ٹائم نہیں دے پاتے، اس بہانے سب ساتھ میں وقت بھی گزاریں گے۔'' احسن خاص طور پر یہ ہی مشورہ کرنے ان کے یہاں آیا تھا۔

''احسن! یہ تو بہت کمال کی بات کر دی تم نے، ہم تو تیار ہیں۔'' صمد اب بھی ایسے موقعوں کے لیے ایکسائیٹڈ ہو جاتا تھا۔

گھر کے بزرگوں نے انہیں جانے کی تو اجازت دے دی مگر خود جانے سے صاف انکار کر دیا، ان کے انکار کے باوجود صمد اور رابیل ان کے پیچھے پڑ گئے۔ آخر زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے استفادہ اسی طرح تو لیا جاتا ہے۔

دادا، دادی اور محمد شفیع کے علاوہ تمام اہل خانہ پکنک پر جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ وہ سب بہت ایکسائٹڈ تھے۔

''رابیل! میں اپنی چابیاں چاچی کے روم میں بھول آیا ہوں۔ ذرہ لے آنا۔'' صمد ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ وہ سر ہلاتی ہوئی ماما کے روم میں آئی۔ گاڑی کی چابیاں ڈریسنگ ٹیبل پر مل گئی تھیں۔ اس نے چابیاں اٹھائیں اور پلٹی اس کی سرسری نگاہ ماما کے تکیے کے نیچے پڑی۔

وہ دوبارہ اس طرف پلٹی اور ماما کے بیڈ پر رکھے تکیے کے نیچے سے فریم نکالا چونکنا اس کا فکری عمل تھا۔

یہ پاپا، ماما، ابصار اور رابیل کی بہت پرانی تصویر تھی۔ شاید ماما اب بھی پاپا اور بھائی کو بہت مس کرتی تھیں وہ فریم واپس دراز میں رکھنا بھول گئی تھیں۔

لاشعوری طور پر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر فریم کے شیشے پر گرتے رہے۔ اسے عائش کی کہی ہوئی ایک بات یاد آ گئی تھی جو اس نے رابیل کو آخری بار بات کرتے ہوئے سنائی تھی کہ پاپا کا کچھ سال پہلے انتقال ہو چکا ہے اور ان کے جانے کے بعد ہی ابصار کی طبیعت میں ایسا بدلاؤ آ گیا ہے اس نے یہ خبر اپنے دل میں ہی فنا کر لی تھی۔ کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

پاپا اب بھی ماما اور باقی دوسرے لوگوں کے لیے زندہ تھے۔ اصل حقیقت کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ کبھی ماما پر یہ انکشاف کر کے انہیں تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔ یہ اس کا خود سے وعدہ تھا۔

''رابیل آ بھی جاؤ۔'' احسن روم کی طرف اسے بلاتا ہوا آ رہا تھا۔ اس نے عجلت میں وہ تصویر کا فریم ماما کے دراز میں چھپا کر رکھا اور آنسو صاف کرتی ہوئی احسن اور صمد کی جانب مڑ گئی۔

......☆......

ناولٹ

سرِ فصیلِ سکوتِ جاناں

''یاہو۔ دیکھا میں نے کہا تھا نا کہ مجھے ''نسخہ ہائے وفا'' یہیں سے ہی ملے گا۔ نشاء پرویز کچھ کہے اور وہ ہونہ ہو سکتا ہے بھلا، مانتی ہونا مجھے۔''
''نسخہ ہائے وفا'' کو دیکھتے ہی اس نے ایک نعرہ



بلند کیا اور جوش سے بولتے ہوئے جیسے ہی مڑی اپنے پیچھے ماہین کے بجائے ایک اجنبی شخص کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ چھ فٹ پانچ انچ قد، گندمی رنگت، اسکائی بلیو کلر کی شرٹ اور جینز پہنے ایک ہاتھ میں سن گلاسز اٹھائے اپنی براؤن آنکھوں میں دلچسپی کے رنگ لیے وہ مسکرا رہا تھا۔ نشاء ایک دم سٹپٹا کر رہ گئی پھر سنبھل کر بولی۔

''آئی ایم سوری مجھے مس انڈراسٹینڈنگ ہو گئی تھی مجھے لگا کہ میری فرینڈ میرے پیچھے کھڑی ہے۔''

''نو اٹس او کے۔ ویسے مس انڈراسٹینڈنگ نہیں کافی اچھی انڈراسٹینڈنگ ہوئی ہے ہماری۔''

''کیا مطلب۔'' اس نے کچھ الجھ کر اس اجنبی کو دیکھا تو وہ مسکرا کر مزید بولا۔

''اصل میں، میں بھی اس کتاب کو ہی خریدنے آیا تھا میرے دوست کی برتھ ڈے ہے تو اس کے لیے اسے کتابیں بہت پسند ہیں۔ شاید آپ کو بھی۔''

''ایکسکیوزمی آئی ہیو ٹو گو ناؤ (مجھے جانا ہے)۔''

وہ اسے مزید بولنے کا موقع دیئے بغیر تیزی سے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی جہاں ماہین ایک بینچ پر بیٹھی بور ہوئی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔



تم یہاں پر کیا کر رہی ہو مجھے لگا کہ تم میرے ساتھ کھڑی ہو۔"

"کیا یار نشاء! پورے دو گھنٹے سے تم مجھے اپنے ساتھ لیے ہر بک سینٹر پر گھوم رہی ہو۔ میں تھک گئی تھی اسی لیے یہاں پر آ کر بیٹھ گئی، بک مل گئی نا؟" وہ حسب معمول لمبا جواب دے کر بولی تو اس نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا تو ماہین کاؤنٹر پر پیسے دے کر اس کے ساتھ چلی آئی۔

"پلیز جلدی چلو، امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔"

وہ مختصر کہہ کر گاڑی کی ونڈ اسکرین کے باہر دیکھنے لگی تھی۔ اس کی نظر اپنی کار میں بیٹھتے اس اجنبی پر پڑی، جو چہرے اور ڈریسنگ سے ہی کافی امیر لگتا تھا۔ اجنبی کی نظر بھی اس پر پڑی اور پہلے کی طرح اس کے لب مسکرا اٹھے نشاء نے بے اختیار ماہین کو دیکھا جو ڈرائیور کو جلدی چلنے کا کہہ رہی تھی۔

☆......☆

دوسرے دن وہ حسب معمول جلدی اٹھ گئی۔ نماز پڑھ کر وہ باہر آئی تو حسب معمول نشاء روز کی طرح اپنے سامنے کپڑوں کے ڈھیر پھیلائے مشین پر جھکی انہیں سینے میں مصروف تھی۔ تریشہ کچن میں بیٹھی پھونکنی اٹھائے آگ سلگانے کے چکر میں بری طرح کھانس رہی تھی اور عریشہ بڑے سے صحن میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ سامنے پیپل کے بڑے سے درخت کے نیچے پڑی چھینگا چارپائی پر ابا، عدنان اور عامر چائے اور پاپے سے ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔ تبھی اماں کی نظر اس پر پڑی تو نرمی سے بولیں۔

"ارے نشاء! کالج نہیں جائے گی کیا؟"

"نہیں اماں! میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"ارے کیسی ناشکری لڑکی ہے نشاء تو۔ پہلے مری جاتی تھی کہ اماں مجھے کالج جانا ہے، پھر اس بھلی مانس لڑکی ماہین نے تجھے داخلہ لے کر دیا وہ تیرا سارا خرچا اٹھاتی ہے۔ تو، تو کالج میں پڑھنے جاتی ہے ورنہ تیرے ابے کے پاس کے کھوکھے اور میرے کام کرنے سے تو کہاں داخلہ لے سکتی تھی اور اب تو آئے دن چھٹی کر کے بیٹھ جاتی ہے۔ چل میرے ساتھ میں تجھے کالج چھوڑتی جاؤں گی۔"

"اچھا اماں تو رک میں آتی ہوں۔"

تسلیم بیگم کے غصے سے کہنے پر وہ سر پر پاؤں رکھ کر اندر بھاگی، کالج یونیفارم پہن کر اس نے منہ دھویا اور اوپر سے بالوں میں کنگھا پھیر کر اس نے بیگ اٹھایا اور اماں کے پاس چلی آئی جو چادر پہنے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ پیچھے سے تریشہ نے اسے پکارا کہ نشاء ناشتہ تو کر کے جاؤ مگر وہ ان سنی کیے اماں کے ساتھ کالج چلی آئی ایک تو صبح سے اس کا موڈ خراب تھا۔ دوسرا ماہین بھی کالج نہیں آئی تھی۔ تین پریڈ لے کر اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور پیدل ہی گھر کے راستے پر چل پڑی۔ کالج سے اس کے گھر کا فاصلہ پندرہ منٹ کی مسافت پر تھا۔ اماں کام پر جانے سے پہلے روز اسے کالج چھوڑ جاتی تھیں۔ چلتے چلتے اس کی نظر سامنے سے گزرتی اس کار پر پڑی جس میں تقریباً اس کی ہی ہم عمر کچھ لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ بے فکری سے قہقہے لگاتیں ایک دوسرے پر پاپ کارن پھینکتی وہ لڑکیاں اسے اس دنیا سے بہت اجنبی سی لگی تھیں۔ احساسِ کمتری ایک دم بڑھا تھا اس کا دل چاہا کہ وہ یہاں سے کہیں دور چلی جائے جہاں نشاء پرویز کو نہ جانتا ہو جہاں کوئی دکھ نہ ہو جہاں کوئی غربت نہ ہو۔ وہ اس دنیا سے ایکدم روپوش ہو جانا چاہتی تھی مگر ہر خواہش پوری تھوڑی ہوتی ہے اس کے قدموں نے مزید چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ پاس ہی موجود ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اسے کوئی پروا نہیں تھی کون اسے دیکھ رہا ہے کون جا رہا ہے کون رک رہا ہے اسے ایسے لگ رہا تھا کہ اس کے دکھ میں یہ درخت زمین آسمان اور کائنات کا ذرہ ذرہ رو رہا ہے

ماتم کر رہا ہے اس نے اپنے ہاتھوں سے سر اٹھا کر حیرت سے اس درخت کو دیکھا زمین کو آسمان کو وہ حیرت سے دیکھنے لگی۔

آخر کیا رشتہ تھا ان سب کا نشاء پرویز سے؟

کیا احساس کمتری کا رشتہ تھا؟

یہ اس کے ساتھ کیوں ماتم کر رہے تھے؟

کیا وہ ایسی تھی کہ اس کے دکھ پر محرومی پر کوئی روئے؟

وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی اس کی سسکیاں ہچکیوں میں بدلنے لگیں تبھی ایک نرمی بھری آواز اس کے آس پاس گونجی اسے ایسا لگا کہ وہ اس آواز کو پہچانتی ہے اسے جانتی ہے آواز ایک بار پھر گونجی۔

''آپ ٹھیک تو ہیں؟'' اس نے حیرت سے سر اٹھا دیکھا وہ فکرمندی سے اسے دیکھ رہا تھا اس کے کوئی جواب نہ دینے پر وہ سوال بدل کر بولا تھا۔

''آئیں میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دوں۔''

''گھر......'' اس نے حیرت سے لفظ گھر کو دہرایا تھا اور اگلے ہی پل اسے اپنا گھر یاد آ گیا تھا تو وہ نم آواز میں بولی۔

''میں یہاں پر اس لیے نہیں بیٹھی تھی کہ آپ یا کوئی اجنبی شخص مجھے لفٹ دے۔''

''آپ سیدھے سوال کا سیدھا جواب کیوں نہیں دیتیں۔'' اب کے وہ جھنجھلا کر بولا تھا۔

''میں چلی جاؤں گی پاس میں ہے میرا گھر۔'' وہ کہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی اور اگلے ہی پل لڑکھڑا کر بیٹھ گئی۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اس سے اٹھا تک نہیں جا رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر تک گھٹنوں کے بل بیٹھی رہی تھی۔ اجنبی نے دکھ سے اس پاگل سی لڑکی کو دیکھا تھا پھر نرمی سے بولا۔

''اچھا آئیں نشاء! میں آپ کو سہارا دے دیتا ہوں چلنے میں۔''

''ماہین کہتی ہے کہ کبھی کسی کا سہارا نہیں لینا چاہیے کیا پتا سہارا دینے والے کا کب موڈ بدلے اور وہ آپ کو چھوڑ کر آگے چل پڑے اور آپ منہ کے بل گر پڑیں۔ میں چلی جاؤں گی مسٹر۔''

''فشار......فشار چوہدری نام ہے میرا اور جہاں تک آپ کو چھوڑنے کی بات ہے آئی مین کہ...... خیر چلیں اٹھیں اب سب دیکھ رہے ہیں۔''

وہ کھڑا ہو کر اپنا ہاتھ بڑھا کر بولا تو نشاء نے کوئی جواب دیے بغیر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا کیونکہ اب اس سے بالکل بھی بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُسے آہستہ سے تھینک یو کہہ کر وہ دھیرے دھیرے چلتی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی جب کہ فشار چوہدری پرسوچ انداز میں اس کی پشت کو دیکھ کر رہ گیا۔

☆......☆

گھر آتے ہی وہ درخت کے نیچے پڑی چارپائی پر ڈھے سی گئی اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ صدیوں کی مسافت طے کر آئی ہو۔ پرتن دھوتی تریشہ بھاگ کر اس کے لیے پانی لے آئی تھی جسے وہ ایک ہی سانس میں ختم کر گئی تھی صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس وقت اسے بے حد بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کچن میں چلی آئی کچن بھی کیا تھا۔ صحن کے ایک طرف چار دیواری دے کر اس کے اوپر لکڑیوں کی چھت بنا دی گئی تھی اور زمین پر ہی مٹی کا چولہا بنا ہوا تھا ان کے گھر گیس کی سہولت بالکل نہیں تھی۔ بجلی بھی نام کو ہی تھی ان کے کمرے میں صرف رات کو ہی پنکھا چلا کرتا تھا اور سب کے سونے کے بعد اماں اٹھ کر اسے بھی بند کر دیتی تھیں۔ ساری رات پنکھا چلنے دینا ان کے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی عیاشی تھی اور بلب کے نام پر ان کے کمرے میں صرف اماں ایک دیا جلا دیتی تھیں جس میں تیل سے زیادہ پانی ڈالا جاتا تھا وہ چار بہنیں تھیں۔ سب سے

بڑی نشاط تھی پھر وہ اس کے بعد تریشہ اور عریشہ تھی اور اس کے دو بھائی عدنان اور عامر تھے جو ابا کے ساتھ پان کے کھوکھے پر بیٹھتے تھے۔ نشاط نے میڈل کیا تھا تریشہ پانچویں میں تھی اور عریشہ ساتویں میں۔ وہ خود فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی ان تینوں کی اسکول فیس ماہین ہی دیتی تھی۔ ماہین تین بہنیں تھیں ایک کی شادی ہو چکی تھی اور دوسری سے نشاء کی ایک دو بار ہی ملاقات ہوئی تھی اور اس کے تین بھائی تھے جو کہ باہر سیٹل تھے۔ اس کی ماں سوشل ورکر تھی اور باپ ایک مشہور بزنس مین۔ سب اپنی اپنی زندگیوں میں کھو کر ماہین کو بالکل ہی بھول چکے تھے وہ ماں باپ کے پیار کی ترسی ہوئی لڑکی تھی اور اسی تنہائی نے اسے نشاء کے بے حد قریب کر دیا تھا۔

اس نے بے دلی سے پتیلی کا ڈھکن اٹھایا تو اس میں پڑی بے رنگ دال کو دیکھ کر اس کی ساری بھوک اڑ گئی۔ ان کے گھر دال بھی جو بنتی تھی دال کو ابال کر اس پر نمک مرچ ڈال کر ہی اس سے روٹی کھائی جاتی تھی۔ کتنی عجیب زندگی تھی اس کی ہر نعمت سے محروم ہر آرائش سے دور اور یہ ہی بات جب دوسرے دن اس نے کالج میں ماہین سے کی۔ وہ دکھ سے اسے دیکھ کر رہ گئی پھر سمجھاتے ہوئے بولی۔

''میں تمہیں کیسے سمجھاؤں نشاء میری جان! امیر وہ شخص نہیں ہوتا جس کے پاس دولت ہوتی ہے جو بہترین کپڑے پہنتا ہے جو بہتر سے بہتر کھاتا ہے وہ جس کے پاس بینک بیلنس ہو تم کیا جانو کہ امیر تو وہ انسان ہوتا ہے جس کے پاس باپ کی شفقت ہوتی ہے ماں کی ممتا بھری گود ہوتی ہے امیر وہ ہوتا ہے جس کے پاس بہن کی محبت ہوتی ہے، بھائیوں کا اس کی ذات پر کیا جانے والا یقین ہوتا ہے۔ خالی خولی اچھے کپڑوں اور پیسوں سے کوئی بھی امیر نہیں ہوتا۔''

اس کی بات پر اس نے جل کر جواب دیا تھا تلخی اس کے ہر انداز سے اپنی ذات سے نفرت جھلک رہی تھی۔

''ماہین! تم تو یہ سب کچھ بہت آسانی سے کہہ سکتی ہو کیونکہ تم میرے اس دو کمروں کے گھر میں نہیں رہتیں جہاں انسان ہوا تک کے لیے ترستا ہے تم اس ٹین چھت والے کمرے میں اس ٹوٹی ہوئی چارپائی پر نہیں سوتی جس کا پنکھا صرف چکر کھاتا ہے، ہوا نہیں دیتا۔ تمہیں کبھی ایک ایک چیز کے لیے ترسنا نہیں پڑا، تمہیں کبھی اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو قربان نہیں کرنا پڑا، اس لیے تم یہ ساری باتیں اتنے آرام سے کہہ رہی ہو۔''

''میں دوبارہ کہوں گی نشاء! دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی یونو جب تمہاری دولت کی ہوس بڑھنے لگے تو اپنے سے کمتر کو دیکھ لیا کرو۔''

''مجھ سے کمتر بھی کوئی ہوگا ماہین۔'' وہ تلخی سے مسکرا کر بولی تو اب کی بار ماہین جھنجلا کر بولی تھی۔

''ایسا شخص احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نشاء تو وہ کبھی خود کو جینے نہیں دیتا اور جو احساسِ برتری میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ دوسروں کو جینے نہیں دیتا۔''

''یونو ماہین! کبھی کبھی میرا دل شدت سے چاہتا ہے کہ تم سے تمہاری قسمت چرالوں اور تمہیں میں اپنی قسمت دے دوں تاکہ تمہیں احساس ہو کہ غریبی کیا ہوتی ہے۔''

اس کی بات پر ماہین نے ایک نظر اسے دیکھا تھا پھر حسرت سے بولی بھی تو کیا۔

''اگر ایسا ممکن ہوتا نا نشاء تو قسم سے میں اپنی قسمت خود تمہیں دے دیتی اور تم سے خوشی خوشی تمہاری قسمت لے لیتی۔ تم نہیں جانتیں یہ امیر لوگوں کی دنیا بڑی بناوٹی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے احساسات جذبات تک بھی بناوٹی ہوتے ہیں اور یہ ہی بناوٹ انہیں اپنے خدا سے دور کر دیتی ہے۔'' نشاء نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ پریڈ کی بیل بجی تو وہ اس کے ساتھ اٹھ کر کلاس کی طرف بڑھ گئی خالی

دماغ کے ساتھ۔

☆......☆

سب کچھ معمول کی طرح چل رہا تھا وہ صبح کو کالج جاتی شام کو اماں کے ساتھ مل کر کام میں ہاتھ بٹایا کرتی، ماہین سے جی بھر کر باتیں کرتی مگر ان سب میں ایک تبدیلی ضرور آئی تھی اور وہ یہ کہ صبح کو جب وہ کالج کے لیے اپنے گھر سے اماں کے ساتھ نکلتی تو درخت کے تنے سے ٹیک لگائے فشار چوہدری اسے کھڑا ملتا تھا۔ نجانے کیوں اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ فشار چوہدری صرف اس کے لیے ہی دھوپ میں کھڑا ہوتا ہے اسے دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی تھی۔ شاید وہ اسے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کیا؟ وہ خود حیران تھی کہ وہ فشار چوہدری کے بارے میں اتنا کیوں سوچ رہی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کیا وہ اس سے متاثر ہو رہی ہے؟ یہ وہ سوال تھے جنہیں وہ ہر روز خود سے کرتی تھی مگر پھر اگلے ہی پل جواب سنے بغیر اپنے دل کو ڈانٹنے بیٹھ جاتی۔ ایک دن اتفاق سے اماں کو بخار نے گھیر لیا تو وہ اکیلی کالج کے لیے گھر سے چلی آئی اور حسب معمول وہ جیسے ہی فٹ پاتھ کے سائیڈ پر لگے درخت کے قریب پہنچی فشار چوہدری اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا پھر نرمی سے بولا۔

''السلام علیکم نشاء! کیسی ہیں آپ؟''

''وعلیکم السلام۔'' اس نے صرف سلام کا جواب دیتے خود کو سنا تھا۔

''مجھے آپ سے ایک بہت ہی ضروری بات کرنی ہے کیا آپ؟''

''ون منٹ، اب کیا میں ہر راہ چلتے شخص سے باتیں کرتی پھروں گی۔'' وہ اب کے کچھ تلخ ہوئی تھی تو وہ جلدی سے بولا کہ کہیں وہ اس کی بات سننے سے ہی انکار کردے۔

''میں اپنی سسٹر اور امی کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔''

''پر کیوں؟''

اس کی سادگی پر اس کا دل چاہا کہ اپنا سر کسی دیوار پر دے مارے مگر وہاں کوئی دیوار نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو روڈ کے پار تھی اب اگر وہ دوڑ کر اس کر کے دیوار سے جا کر اپنا سر بھی مار دے تو اسے یقین تھا کہ نشاء پرویز بے نیازی سے گزر جائے گی اور وہ یا تو وہیں پر مر جائے گا یا پھر پاگل ہو جائے گا اسی لیے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور نرمی سے بولا۔

''آپ کے رشتے کے لیے اور کیوں؟''

''کیوں کیا وہ کوئی میرج بیورو کے آنر ہیں۔''

اسے لطف آ رہا تھا فشار چوہدری کو غصہ دلانے میں کیونکہ اس نے کہیں پر پڑھا تھا کہ آپ جاننا چاہتے ہیں کہ کوئی شخص کیسا ہے تو اسے صرف ایک بار غصے میں دیکھ لیں آپ کو خود پتا چل جائے گا۔ اب وہ اتنی بھی بچی نہیں تھی کہ سمجھ نہ سکتی وہ جانتی تھی کہ اس کا کیا مطلب ہے مگر پھر بھی وہ اسے تنگ کر رہی تھی۔

''نہیں وہ اس لیے آنا چاہ رہی ہیں کیونکہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اب آپ کیا کہتی ہیں اس بارے میں۔''

اب کے فشار چوہدری مضبوط لہجے میں بولا تو وہ سٹپٹا کر رہ گئی۔ ''میں کیا کہہ سکتی ہوں جو امی ابو چاہیں گے۔'' اور یہ لفظی بات تھی وہ جانتی تھی کہ گھر والے ضرور اس کی شادی پر اعتراض کریں گے کیونکہ اس سے بڑی نشاط تھی۔ پہلے اس کی شادی ہونی چاہیے تھی لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ شادی صرف فشار چوہدری سے ہی کرے گی۔ بچپن کے خواب اب جا کے پورے ہو رہے تھے وہ جتنا خوش ہوتی کم تھا۔ پھر دوسرے دن فشار چوہدری کی امی (جو کہ امی کم اور ماڈل زیادہ لگ رہی تھیں) اور اس کی بہن روبی چلی آئیں انہوں نے نشاء کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور ہزار ہزار کے کئی نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ اماں

ابا الگ پریشان تھے کہ وہ اتنے امیر لوگوں میں رشتہ کرنے سے گھبرا رہے تھے تب نشاء نے ہی ضد کی اور انہیں اس رشتے کے لیے راضی کیا۔ جس کے لیے اسے تھوڑی سی جدوجہد کرنی پڑی۔ اماں نے کہا بھی کہ وہ پہلے نشاط کی شادی کریں گی جس پر وہ بگڑ کر بولی۔

"کیوں اماں! اگر اس کی شادی اس کے مقدر میں لکھی ہوگی تو ضرور ہوگی مگر میں اس کے لیے اپنا نصیب نہیں چھوڑ سکتی۔"

اس نے نفرت اور حقارت سے نشاط کو دیکھا تھا۔ ملگجے کپڑے بکھرے بال آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اپنے ہونٹ کاٹتی آنسو پیتی وہ اسے سخت بری لگی تھی۔ بالآخر اماں ابا کو اس کی ضد ماننا ہی پڑی اور شادی کی تاریخ دے دی گئی۔ نشاء تو ہواؤں میں اڑ رہی تھی وہ یہ خوش خبری سب سے پہلے ماہین کو سنانا چاہتی تھی فون کرنے پر اسے پتا چلا کہ ماہین اپنی بڑی بہن کے گھر گئی ہے۔ کچھ دنوں کے لیے اسے سخت دکھ ہوا تھا اس کی سب سے اچھی دوست ہی اس کی شادی میں شریک نہیں ہوگی مگر اگلے کچھ دنوں میں وہ سب بھول گئی ماہین کو نشاط کی آنکھوں کے آنسو یہاں تک کہ وہ خود کو بھی بھول گئی تھی۔ کبھی جن کپڑوں کو وہ حسرت سے دیکھا کرتی تھی اسے اس نے جی بھر کر خریدا ہر مہنگے سے مہنگا پرفیوم سوٹ، جوتے، میک اپ اس نے ہر ہر چیز خریدی اپنی شادی کی ساری شاپنگ اس نے مہنگے مہنگے مول سے کی وہ جس جس چیز پر ہاتھ رکھتی فشار چوہدری اسے لے کر دے دیتا۔ وہ بھی حیرت سے خود کو آئینے میں دیکھتی کیا واقعی اس کے بچپن کے دیکھے وہ سارے خواب سچ ہو رہے تھے کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کوئی خواب دیکھیں اور وہ سچ ہو جائے۔ وہ اکثر سوچتی مگر اب تو اسے سوچنے تک کا وقت نہیں ملتا تھا۔ وہ سارا دن فشار چوہدری کے ساتھ شاپنگ کرتی پھرتی۔ پھر کسی ہوٹل سے وہ لوگ ڈنر کرتے۔ اس نے اپنا فرنیچر تک خود لیا تھا مگر پیسے فشار چوہدری کے ہی تھے۔

☆......☆

اور پھر وہ دلہن بنی کچھ خواب کچھ امید...... لیے اور کچھ جگنو لیے وہ نشاء فشار چوہدری بن کر اس کے گھر آ گئی۔

بیٹھے بیٹھے اس کی کمر اکڑ گئی تھی مگر فشار کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ اس سے مزید بیٹھنا دوبھر ہو گیا تو وہ بیڈ کے بیک سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور حیرت سے اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔

"کیا سچ میں اب میں امیر ہوں مجھے کسی چیز کے لیے ترسنا نہیں پڑے گا۔" اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب وہ سو گئی۔

صبح کو جب وہ اٹھی تو فشار ٹیبل کے سامنے کھڑا اپنے بالوں میں برش کر رہا تھا اسے دیکھ کر مسکرا دیا تو نشاء کو یکدم شرمندگی نے آن گھیرا۔ وہ دلہن کے لباس میں ہی سو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی فشار مسکرا کر نارمل انداز میں بولا۔

"اٹھ گئیں یار! آئم سوری ڈارلنگ مجھے ابھی اور اسی وقت ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ نیچے ٹیبل پر میں تمہارے لیے ناشتہ لگانے کا کہہ دیتا ہوں باہر ڈرائیور ہر وقت موجود ہے گا تمہیں جہاں جانا ہو چلی جانا میں نے سائیڈ والی ٹیبل پر کچھ کیش رکھ دیا ہے، لے لینا اور میں لیٹ نائٹ آؤں گا پلیز میرا انتظار مت کرنا سو جانا او کے خدا حافظ، لو یو۔" وہ جلدی سے کوٹ پہنتا کمرے سے چلا گیا جب اس نے حیرت سے اپنی شادی کی پہلی صبح کو دیکھا پھر دل کو بہلا کر بولی۔

"شاید کوئی بہت ہی ضروری میٹنگ ہوگی ورنہ وہ اس طرح سے مجھے چھوڑ کر بالکل بھی نہ جاتے۔"

وہ خود کو تسلی دیتی اپنا زیور اتارنے لگی۔ نہا کر اس نے اپنا سب سے خوب صورت اور مہنگا سوٹ پہنا تھا

ایک ہاتھ میں چار سونے کی چوڑیاں اور دوسرے ہاتھ میں ڈائمنڈ سے جڑا کنگن کانوں میں ڈائمنڈ کی ہی بالیاں اور گولڈ کی چین جس میں دل کی شکل کا ننھا سا ڈائمنڈ جگمگا رہا تھا پہن کر اس نے ہلکا ہلکا میک اپ کیا اور اپنے بالوں کو کھلا چھوڑ کر گلے میں دوپٹہ ڈالے وہ نشاء پرویز تو بالکل نہیں لگ رہی تھی جو ہر وقت ایک ہی سوٹ پہنے رکھتی، اپنے حالات سے سخت نالاں رہتی یہ تو کوئی اور ہی نشاء فشار چوہدری تھی۔ وہ خود کو حیرت اور بے یقینی سے نجانے کتنی ہی دیر آئینے میں دیکھتی رہی، چونکی تو اس وقت جب نوکرانی دروازہ ناک کر کے اندر داخل ہو کر بولی۔

''وہ بی بی جی ناشتا تیار ہے جی۔''

''آنٹی اور روبی کیا ٹیبل پر ہیں؟''

وہ اپنی ساس اور نند کے بارے میں پوچھتے ہوئے اپنے بالوں میں جلدی جلدی کنگھا کرنے لگی اور تبھی نوکرانی کے جواب نے اس کے ہاتھ روک دیئے۔

''وہ جی میڈم تو ایک پارٹی میں گئی ہیں اور روبی بی بی تو اپنے دوستوں کے ساتھ کلب گئی ہیں جی۔''

''یعنی گھر پر کوئی نہیں ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جی بی بی کوئی نہیں ہے جی۔''

''اچھا میں آتی ہوں۔''

وہ آہستہ سے بولی اور بے دلی سے اس کے پیچھے چلتے ہوئے آ کر ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ پوری ٹیبل یہاں سے وہاں تک نجانے کتنے ہی کھانوں سے بھری پڑی تھی۔ ایک وقت تھا جب وہ ایک ایک چیز کے لیے ترستی تھی اور آج یہ وقت تھا کہ ہر چیز اس کے پاس تھی مگر وہ خوش نہیں تھی۔ بہت پہلے کہیں ماہین کی بات اسے ایکدم یاد آ گئی۔

''تم نہیں جانتیں امیر لوگوں کی دنیا بڑی بناوٹی ہوتی ہے، یہاں تک کہ ان کے جذبات احساسات تک بناوٹی ہوتے ہیں اور یہ ہی بناوٹ انہیں خدا سے دور کر دیتی ہے۔''

''کیا ماہین نے سچ کہا تھا یا پھر......''

''میڈم کھانا ٹھنڈا ہو گیا ہے میں گرم کر کے لے آتی ہوں۔'' اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ سوچتی نوکرانی کی آواز پر چونکتی ہوئی بولی۔

''نہیں، میں کھانا نہیں کھاؤں گی تم بس میرے لیے ایک کپ چائے لے آؤ میرے کمرے میں۔''

وہ کرسی دھکیل کر بے دلی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ بالکونی میں وہ کھڑی نہ جانے کتنی سوچوں میں قید تھی۔ اس کا گھر اس علاقے میں سب سے امیر گھر تھا۔ لیکن کیا واقعی وہ امیر تھے؟ وقت کچھ اور گزرا۔ فشار چوہدری کا معمول پہلے دن کی ہی طرح تھا وہ اس کے سونے کے بعد آتا اور جاگنے سے پہلے ہی چلا جاتا اس نے ابھی تک اپنی ساس اور نند کے پاس بیٹھ کر صرف دس منٹ بات تک نہیں کی تھی۔ وہ سارا دن پورے گھر میں بولائی بولائی پھرتی۔ اس کو گھر کے در و دیوار سے وحشت ہونے لگی تھی اور پھر آج جب اتفاق سے فشار چوہدری ناشتے کی ٹیبل پر اسے ملا تو اس نے اسے کہہ دیا تو وہ نرمی سے بات بدل کر بولا۔

''آج شام تم تیار رہنا ایک پارٹی میں جانا ہے بلکہ یوں کرو تم آج میرے ساتھ چلو مارکیٹ سے شاپنگ کر لینا اور پارلر چلی جانا، میں دوپہر کو آ جاؤں گا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' وہ خوشی سے بولی کہ چلو کچھ دیر کے لیے ہی سہی وہ اس قید سے آزاد ہو گئی۔ اس نے فشار چوہدری کے ساتھ ڈھیروں شاپنگ کی پارلر گئی اور جب وہ وہاں سے تیار ہو کر باہر نکلی تو فشار چوہدری اسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا پھر مسکرا کر بولا۔

''ونڈرفل! بہت خوب صورت لگ رہی ہو تم۔''

وہ تھوڑی شرما کر گاڑی میں بیٹھ گئی اور جب وہ

پارٹی میں گئی تو نہ جانے کتنی نظروں نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ عورتوں کی رشک بھری نظریں اس کے چہرے پر گئی۔ ایک تو وہ تھی ہی خوب صورت لمبے بال گوری رنگت اور بڑی بڑی آنکھیں ستواں ناک اور آج تو کچھ بیوٹیشن کا کمال بھی تھا اور ایک اس نے پہلی بار ساڑھی پہنی تھی۔ وہ تو جیسے جاتے ہی پوری محفل کی جان ہی بن گئی تھی۔ تبھی فشار چوہدری اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اسے ایک آدمی کے پاس لے جاکر بولا۔

''ارے نہال صاحب! کیسے ہیں آپ ان سے ملیے شی از مائی وائف۔''

''اوہیلو۔ کیا نام ہے آپ کا؟''

نہال اپنی گندی نظریں اس کے چہرے پر جما کر بولا اور ساتھ ہی اپنا ہاتھ بھی بڑھا دیا۔ نشاء نے شپٹا کر دیکھا جو پر سکون انداز میں مسکرا رہا تھا۔

''ہیلو! میرا نام نشاء فشار چوہدری ہے۔''

اس نے دل کڑا کر کے اپنا ہاتھ نہال کے ہاتھ میں دے دیا جس پر نہال نے اپنے لب رکھ دیے۔ اسے تو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ تبھی پوری محفل میں ہڑ بڑی مچ گئی اور فشار چوہدری بھی اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اسے لیے آگے بڑھ گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا بہت بڑی ہستی تھا۔ نشاء نے حیرت سے سب کو دیکھا جو اس آدمی کے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ ان میں فشار چوہدری نمبر ایک پر تھا جو ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہا تھا پھر نشاء کا تعارف کروایا تو اس نے صرف ایک نظر اسے دیکھا اور مسکرا کر فشار سے بولا۔

''آئی ایم سوری میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، یہ تو چیف صاحب نے اصرار کیا تو میں چلا آیا۔ میں چلتا ہوں۔''

''ارے آپ تو محفل کی جان ہیں، خیر میری پارٹی میں آپ کو ضرور آنا ہوگا۔''

''ٹرائی کروں گا۔''

ساکرم کہہ کر چلا گیا اور اس کے جاتے ہی سب باتوں میں لگ گئے۔ ہر لڑکی ہر عورت کی زبان پر صرف ساکرم کا ہی نام تھا لیکن اسے حیرت تب ہوئی جب اس نے ہر آدمی کے منہ سے بھی اس کا ہی نام سنا اور رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو فشار چوہدری نرمی سے بولا۔

''تم ساکرم سے ملیں تھیں نا، وہ صرف اس شہر کے ہی نہیں کئی شہروں کے مشہور بزنس مین ہیں۔ نہ جانے کتنے ملکوں میں ان کا بزنس پھیلا ہوا ہے۔'' اس نے حیرت سے اسے دیکھا آخر وہ اسے یہ سب کیوں بتا رہا تھا اور اگلے ہی پل اس کی حیرت بے یقینی میں اس وقت بدلی جب فشار چوہدری نے کہا۔

''اصل میں نا کل میں نے اسے کچھ فائلیں دینی ہیں۔ نہال کو جس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں دو دنوں کے لیے دبئی جا رہا ہوں ویسے تو میں ڈرائیور کے ہاتھ بھی بھیج سکتا ہوں بٹ تم جانتی ہو نا کہ ہمارا پرانا ڈرائیور چھٹی پر گیا ہوا ہے اور اس کے بدلے نیا آیا ہے۔ جس پر مجھے بالکل بھی اعتبار نہیں ہے۔ میں نے ڈرائیور کو ایڈریس بتا دیا ہے اور فائلیں بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پڑی ہیں پلیز یار تم چلی جانا اوکے گڈ نائٹ۔''

وہ اس کا جواب سنے بغیر ہی اسٹڈی روم میں چلا گیا جب کہ نشاء کل کے لیے پریشان ہوگئی۔

☆......☆

صبح اس کے اٹھنے سے پہلے ہی فشار چوہدری جا چکا تھا۔ بے دلی سے اس نے کپڑے بدلے کاجل آنکھوں میں ڈال کر وہ نیچے چلی آئی۔ خلاف معمول روبی اور آنٹی ناشتہ کرنے میں مصروف تھیں اس کو دیکھ کر بس رسمی سی مسکرائیں اور دوبارہ ناشتہ کرنے میں مصروف ہوگئیں۔ نشاء نے ایک نظر روبی کو دیکھا بغیر بازو کے ٹائیٹ شرٹ اور جگہ جگہ سے پھٹی جینز پہنے

اپنے براؤن بالوں کو کندھے پر ڈالے وہ آزادی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ ہلکا سا ناشتہ کر کے وہ فائلیں لے کر باہر چلی آئی۔ ڈرائیور تو بس جیسے اس کا ہی منتظر تھا اسے دیکھ کر اس نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول دیا تو وہ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اسے بار بار کل رات کا واقعہ یاد آ رہا تھا جب نہال نے اس کے ہاتھ پر کس کیا تھا اور فشار چوہدری جان کر انجان بن گیا تھا۔

"کیا کوئی مرد ایسا بھی ہوتا ہے۔ میں جلدی سے فائلیں دے کر واپس آ جاؤں گی۔" وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی۔ تبھی اس کی کار ایک جھٹکے سے رکی تو وہ باہر نکل آئی وہ کوئی گھر نہیں عالیشان محل تھا وہ جتنا حیران ہوتی کم تھا۔ گھر کے باہر دو باوردی گارڈ کھڑے تھے جنہوں نے اسے دیکھ کر دروازہ کھول دیا اور وہ حیران سی اندر چلی آئی۔ سرخ اینٹوں سے بنا وہ گھر کسی محل سے کم نہیں تھا ہر طرف پھول ہی پھول تھے ہر جگہ باوردی گارڈ کھڑے تھے۔ ایک پل کے لیے اس کا دل چاہا کہ واپس چلی جائے مگر وہ اب مڑ نہیں سکتی تھی۔

"ارے نشاء صاحبہ آئی ہیں۔ آئیے آئیے کیسی ہیں آپ؟"

وہ حیران سی گھر کو دیکھ رہی تھی کہ ایکدم مسکراتا ہوا نہال جو کہ 35 سال تک کا تھا اس کے سامنے آ کر بولا۔

"جی آئی ایم فائن۔ یہ لیجیے فائل۔"

"آئیے نا باہر کیوں کھڑی ہیں اندر چلتے ہیں کچھ ٹائم ہمارے ساتھ بھی گزار لیا کریں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا اور آگے چل پڑا تو مجبوراً وہ بھی اس کے پیچھے چلتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہو گئی اور اس کے کہنے پر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

"باقی باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی پہلے یہ بتائیے کیا لیں گی آپ؟"

"جی کچھ نہیں میں بس وہ......"

"ارے ایسے کیسے چلے گا۔ گارڈ جلدی سے میڈم کے لیے چائے لے آؤ۔"

اس کے منع کرنے کے باوجود وہ بولا تو ایکدم سارے گارڈ کمرے سے باہر چلے گئے۔ نہ جانے کیوں اسے ایکدم کچھ خطرے کا احساس ہوا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور فائلیں ٹیبل پر رکھ کر بولی۔

"مائنڈ مت کیجیے گا مجھے ذرا جلدی ہے۔" وہ کہتے ہوئے مڑی کہ نہال اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"ارے ایسے کیسے نشاء صاحبہ جس کام کے لیے آئی ہیں پہلے وہ کام تو کریں پھر چلی جایئے گا۔"

"یہ کیا بدتمیزی ہے میرا ہاتھ چھوڑیں آپ۔"

"ارے بڑی شریف بن رہی ہیں آپ، جیسے کچھ پتا ہی نہیں ہے۔"

اب کے وہ اس کا رخسار سہلا کر بولا تو نشاء ایک جھٹکے سے الگ ہوئی اور بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

"شاید آپ کو آپ کے شوہر نے کچھ بتایا نہیں۔ رکیں آپ بات کریں اپنے شوہر سے۔" نہال نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور فشار چوہدری کا نمبر ملا کر اسے فون دیا تو وہ تقریباً چیخ کر بولی۔

"فشار کہاں ہیں آپ اور یہ......"

"کیا بکواس کر رہی ہو جاہل عورت جیسا وہ کہتا ہے ویسا کرو ورنہ میری طرف مت آنا، میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ ارے اتنے میں نے پاپڑ بیلے ہیں صرف تمہارے لیے اب صلہ دینے کا وقت آیا ہے تو چیخ رہی ہو۔"

اس نے فون بند کر دیا اور نشاء بے حس و حرکت سی گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ ایکدم بے جان ہو کر رہ گئی تھی کیا یہ تھی وہ دولت جسے پانے کی چاہ میں وہ پاگل رہی تھی کیا عزت، دولت سے اہم تھی؟

وہ ایکدم نہال کے قدموں میں گر کر پھوٹ

پھوٹ کر روتے ہوئے بولی۔

''پلیز...... پلیز مجھے جانے دیں مجھے بالکل پتا نہیں تھا۔ میں ایسی لڑکی نہیں ہوں، مہربانی کریں مجھ پر۔ پلیز اگر آپ سچے مسلمان ہیں تو مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔''

کیسی بے بسی تھی کہ وہ نشاء پرویز جو کبھی اپنے حالات سے خوش نہیں رہی تھی جس نے کبھی کسی انسان کو انسان نہیں سمجھا تھا وہ آج اپنی عزت کے لیے ایک امیر زادے کے قدموں میں گری پڑی تھی۔ پتا نہیں اس کی قسمت اچھی تھی یا پھر وہ وقت ہی ایسا تھا۔ نہال اس سے دور ہو کر زور سے بولا۔

''گارڈ میڈم کو ان کے گھر چھوڑ آؤ۔''

اس نے بے یقینی سے سر اٹھا کر نہال کو دیکھا تھا جو رخ موڑے کھڑا تھا۔ پھر اس سے بولا۔

''مس نشاء فشار چوہدری کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کو لگی ٹھوکر سے ہی سبق سیکھ جاتے ہیں اور کچھ لوگ ہمیشہ ٹھوکر لگنے کے انتظار میں رہتے ہیں اور کچھ ٹھوکر لگنے کے بعد اٹھ کر اپنے قدم مضبوطی سے جما لیتے ہیں تاکہ دوبارہ اٹھ کر نہ لگے۔ اب آپ کا انتخاب کن میں ہوتا ہے یہ میں نہیں جانتا۔ آپ جا سکتی ہیں مگر یاد رکھیے گا ہر کوئی نہال نہیں ہوتا جو ہاتھ آیا مفت کا مال ٹھکرا دے۔''

وہ بولا تو نشاء اٹھ کر باہر چلی آئی ڈرائیور اس کا منتظر تھا مگر وہ اسے نظر انداز کیے بے جان قدموں سے آگے بڑھتی چلی گئی۔

کیا یہ تھی وہ دولت جس کے اس نے خواب دیکھے تھے۔ وہ اپنے حال پر کبھی خوش نہیں رہی تھی اور اسے ملا بھی تو کیا آج اس کے پاس دولت تھی، بینک بیلنس تھا پر اپنی ذات کا مان اور یقین نہیں تھا۔ وہ اپنی ہی نظروں میں بے مول ہو کر رہ گئی تھی۔ چلتے چلتے اس کے پاؤں میں درد ہونے لگا تھا مگر وہ چلتی جا رہی تھی اور تبھی اس کی نظر سامنے سے آتے ٹرک پر پڑی اور وہ یہ بات جانتی تھی کہ یہاں سے جائے گی تو فشار اسے ہر بار بیچے گا اور وہ اپنی عزت نہیں بچا سکے گی اور اگر وہ اس کا کہا نہیں مانے گی تو وہ اسے طلاق دے دے گا، عمر بھر کا روگ۔ اس سے بہتر تھا کہ وہ مر جاتی۔

اس سے پہلے کہ ٹرک اس پر سے گزرتا کسی نے پوری قوت سے اسے پیچھے کھینچا تھا اور وہ لڑکھڑا کر ایک طرف گری اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی تو نہال نے نہایت دکھ سے اسے دیکھا پھر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

''یہ کیا کر رہی تھیں تم؟''

''مر جانا چاہتی ہوں میں اس زندگی سے موت بہتر ہے۔''

''اچھا اب اگر میں تمہیں مرنے دیتا تو کیا ہوتا۔ ایک نا ختم ہونے والی سزا تمہارا مقدر بنتی۔ بدنامی سے تم بچنے کے لیے اپنی اگلی ساری زندگی جس میں موت بھی نہیں ہے، تم برداشت کرتی کس منہ سے تم اللہ کے پاس جاتیں۔ وہ تم سے نہ کہتا کہ اے بندی میں نے تجھے ساری زندگی دی اور جب تجھ پر ذرہ سی آزمائش ڈالی تو تم نے خودکشی یعنی حرام موت چن لی۔ ہر مسئلے کا حل موت نہیں ہوتا نشاء۔''

پھر وہ اپنے گھر آ گئی۔ اماں ابا کو جب فشار چوہدری کے بارے میں پتا چلا تو انہوں نے اس کے فیصلے کو ٹھیک کہا اور تقریباً مہینے کے بعد اسے ڈاک سے طلاق نامہ موصول ہوا۔ نہ جانے کتنی ہی دیر وہ اماں کے گلے لگ کر اس نام نہاد رشتے کے ٹوٹنے پر ماتم کرتی رہی۔

ابھی کیا کہیں ابھی کیا سنیں کہ
سرِ فصیل سکوتِ جاناں

☆......☆

آج میں نہال کے ساتھ بہت خوش ہوں ابھی کچھ دیر میں ہم ایک ہوٹل میں ڈنر کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ آج میرا ایک پیارا سا بیٹا شاہ زیب ہے۔ میں

اسے بالکل نہال کی طرح دیکھنا چاہتی ہوں۔ نشاط، تریشہ اور عریشہ کی شادی ہو چکی ہے۔ ابا اور امی ہم میں نہیں جب کہ بھائی اپنی بیویوں کے ساتھ ایک خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔ میں آج بھی سوچتی ہوں تو ڈر جاتی ہوں کہ اگر اس دن میں خودکشی کر لیتی تو میرا انجام کس قدر بھیانک ہوتا، اگر مجھے نہال نہ بچاتے تو؟ اس سے آگے میں کچھ سوچ نہیں سکتی۔ نہال مجھے بلا رہے ہیں۔"

"جلدی کرو یار دیر ہو رہی ہے۔"

"بس آتی ہوں۔"

میں کہتے ہوئے جلدی سے شاہ زیب کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئی اور ہمیشہ کی طرح آج بھی ٹریفک بے حد تھا۔ ریڈ سگنل پر گاڑی رکی اور میری نظر ونڈو کے پار نظر آتے اس شخص پر رک سی گئی۔ میں بے اختیار بھاگتی ہوئی اس تک گئی۔ پھٹے پرانے کپڑے ایک ٹانگ آنکھوں سے بہتے آنسو اس پر بیٹھی مکھیاں ہاتھ اٹھا کر بھیک مانگتا یہ وہ فشار چوہدری تو نہیں تھا جو محفلوں کی جان ہوا کرتا تھا یہ تو کوئی اور ہی تھا جسے اپنے کیے کا دنیا میں ہی عذاب مل رہا تھا اور آخرت میں بھی ملنا تھا۔

"نشاء! مجھے......مجھے معاف کردو میں نے تمہارے ساتھ غلط کیا۔"

"یہ سب......" میں اتنا ہی کہہ سکی اور میرے پیچھے آنے والا نہال ساکت رہ گئے جب کہ فشار چوہدری روتے ہوئے بولا۔

"تمہیں طلاق دینے کے بعد کچھ لوگوں نے روبی کو کڈنیپ کر لیا اور وہ میری ساری دولت مانگنے لگے، میں نے انہیں اپنی برسوں سے جمع کی ہوئی ساری دولت دے دی اور انہوں نے روبی کا گینگ ریپ کر کے اسے مار دیا امی بھی یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور جب میں نے مرنے کی کوشش کی تو ایک ٹانگ گنوا بیٹھا۔ ہر کوئی اپنے کیے کا انجام ضرور بھگتتا ہے جلدی یا دیر سے۔ مجھے اللہ نے اب تک شاید اس لیے زندہ رکھا ہے کہ میں تم سے معافی مانگ سکوں مجھے معاف کر دو۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا تو میں نے اسے کہا کہ میں نے اسے معاف کر دیا۔ میں اٹھ کر ابھی دو قدم ہی چلی تھی کہ ایک دم شور مچ گیا، فشار چوہدری گناہ کو گناہ نہ سمجھنے والا آج لاوارث موت مرا پڑا تھا، بے شک اللہ بہتر انصاف کرنے والا ہے۔ ہم نے گھر آتے ہی اس کی تدفین کرائی اور آج میں اللہ کے اس انصاف پر حیران ہوں جو ہماری قسمت میں ہوتا ہے ہمیں ضرور ملتا ہے جلد یا بدیر اور ہم کون ہوتے ہیں اس سے یہ کہنے والے کہ اس نے فلاں کو اتنا دیا اور ہمیں نہیں دیا۔ کسی چیز کے ختم ہونے پر شکوہ مت کرنا کیونکہ اس نے آپ سے صرف ایک چیز لی ہے سب کچھ نہیں۔"

میں نے سوچتے ہوئے ایک نظر آسمان پر ڈالی۔ جہاں پر نیا سورج کچھ نئے وعدے امیدیں اور ارمان لے کر طلوع ہو رہا تھا اس امید پر کہ شاید اب کوئی لڑکی نشا کی طرح ناشکری نہ کرے۔ کاش اب کوئی فشار چوہدری غرور میں نہ ڈوبے۔

"نہال ہر انسان تمہاری طرح کیوں اچھا نہیں ہو سکتا۔"

"اگر ہر نہال کی زندگی میں نشاء چلی آئے۔ نہ تو نہال کو اچھا ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا ہے اور مجھے نئی زندگی مل گئی۔"

"میری بھی زندگی کا حاصل ہیں آپ۔"

میں نے شرما کر کہا اور نہال کے کندھے پر سر رکھ کر ایک بار پھر سے باہر پھیلتی نئی صبح کو دیکھنے لگی مگر اب میرے دیکھنے کے انداز میں مایوسی اور ناامیدی نہیں تھی بلکہ ایک نئی امید تھی آس تھی کچھ اچھا ہو جانے کی۔

......☆......

روشنی فاطمہ فیصل

افسانہ

عکس در عکس

''پلیز مما جانے دیں ناں؟'' پچھلے ایک گھنٹے سے وہ مستقل سائرہ کو منانے کی کوشش کر رہی تھی۔ برتھ ڈے پارٹیز اور کمبائن اسٹڈیز کے لیے وہ ہر دوسرے دن اس سے اجازت لے رہی ہوتی تھی۔ سائرہ کو اس



کے آنے جانے پر سخت اعتراض تھا اور اعتراض بے جا تھا بھی نہیں۔ رات گئے کی واپسی اسے بہت کھلتی تھی۔ تب ہی وہ آج بھی اس کو جانے کی پرمیشن نہیں دے رہی تھیں۔

''مما پلیز! مان جائیں ناں۔'' اس کا جواب نہ پاکر وہ دوبارہ درخواست گزار ہوئی۔

''رجاء! مجھے تمہارے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' اس کا یہ جملہ سننا تھا کہ وہ خوشی سے اچھل کر کھڑی ہوگئی۔

''تھینکس مما......!''

''ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی ہے رجاء!'' اس کی مسکراہٹ کو بریک لگ گئے۔

''تمہارا رات دیر سے واپس آنے پر مجھے سخت اعتراض ہے اگر تم جلدی واپس آسکتی ہو تو چلی جاؤ Other wise......'' ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی رجاء جھٹ بول اٹھی مبادا وہ مزید خفا نہ ہو جائیں۔

''نہیں مما! میں جلدی واپس آجاؤں گی۔'' وہ خوش ہو کر جوش سے بولی اور اپنا بیگ لینے اپنے روم میں چلی گئی۔



☆......☆

''کیا بات ہے آج بہت سناٹا ہو رہا ہے گھر میں خیر تو ہے۔'' کامران رضا فریش ہو کر روم میں آئے تو دریافت کرنے لگے۔

''جی سناٹا تو ہو گا ہی آپ کی شہزادی آج پھر کمبائن اسٹڈیز کے لیے گئی ہے۔'' لہجے کی ناگواریت واضح تھی جسے وہ بخوبی بھانپ گئے تھے۔ بغور وہ سائرہ کو دیکھتے رہے پھر بولے۔

''کیا بات ہے سائرہ! میں نے نوٹ کیا ہے تم رجاء کے کہیں بھی جانے پر خوش نہیں ہوتیں۔''

''جی بالکل ٹھیک کہا آپ نے، مجھے اس کا روز روز کا آنا جانا بالکل پسند نہیں ہے۔'' وہ صاف گوئی سے بولیں۔ انہیں سچ پر پردہ ڈالنے کی عادت بھی نہیں تھی جو دل میں ہوتا بتا دیتی تھیں۔ وہ الجھ گئے۔ کافی دیر تک ان کو الماری سیٹ کرتا دیکھنے لگے۔

''میری سمجھ نہیں آتا سائرہ! تم اتنی کنزرویٹو کیوں ہوتی جا رہی ہو۔ رجاء ہماری اکلوتی بیٹی ہے۔ اسے آزادی دو تا کہ اس میں خود اعتمادی پیدا ہو سکے۔ ابھی وہ عمر کے جس حصے میں ہے اس میں خود اعتمادی کی بہت ضرورت ہے ابھی اگر ہم اسے آزادی نہیں دیں گے تو وہ مستقبل میں کیسے قدم جما سکے گی۔ ابھی تو اسے اپنا کیریئر بنانا ہے۔''

''ٹھیک کہا آپ نے؟'' وہ الماری بند کر کے پلٹ گئیں۔

''مگر جس خود اعتمادی کی بات آپ کر رہے ہیں آج کل کے دور میں خود پسندی میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگتی۔ میں کنزرویٹو نہیں ہوں۔'' انہوں نے ان کے خود پر لگائے گئے الزام کی تردید کی۔

''میں محتاط ہوں۔ زمانے کی ڈگر ہی ایسی ہے جو سیدھی راہ پر چل بھی رہا ہو، وہ بھی ڈگمگا جاتا ہے۔ رجاء تو ٹین ایج میں ہے اس عمر میں تو......'' کامران نے بات کاٹ دی۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں سائرہ! تم خود اتنی ایجوکیٹڈ ہو پھر بھی ایسی سوچ رکھتی ہو۔ ہم ایک آزادانہ ماحول میں رہتے ہیں اور ہماری کلاس میں یہ کوئی بڑی بات نہیں۔'' کامران رضا کو اس کی سوچ متاسف کر گئی۔

سائرہ متفکر چہرہ لیے ان کی باتوں پر غور کرنے لگیں۔

''کیا واقعی میری سوچ غلط ہے۔'' انہیں صرف اس کے آنے جانے پر ہی نہیں اس کے لباس پر بھی اعتراض رہتا تھا۔ جینز ٹائٹس پہننا کوئی معیوب بات نہیں تھی اور دوپٹے جیسی فارملیٹی کی بھی کوئی گنجائش نہ تھی مگر شاید سائرہ کی سوچ اس ماحول سے یکسر مختلف تھی۔ انہیں شاید احساس تھا کہ غلط اور صحیح کیا ہے وہ اتنی زیادہ مذہبی بھی نہیں تھیں مگر ان کا دل و ذہن جو علیحدہ تھا جو ان سب چیزوں کو دل سے قبول نہیں کرتا تھا۔

☆......☆

''اور اسٹڈی کیسی چل رہی ہے بیٹا؟'' بہت کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ تینوں ناشتے کی ٹیبل پر جمع ہوں آج اتفاق تھا کہ کامران رضا جلدی بیدار ہو گئے تھے۔

''جی پاپا! بہت اچھی......!'' توس کا بائٹ لیتے ہوئے اس نے مگن سے انداز میں کہا۔

''اور ایگزام کب تک اسٹارٹ ہیں؟'' وہ آج شاید اچھے موڈ میں تھے تب ہی اپنی بیٹی سے پڑھائی کے متعلق گفت و شنید کر رہے تھے۔

''اوہو! آج تو بہت رونق لگی ہوئی ہے ٹیبل پر......'' وہ چائے کی ٹرے تھامے ڈائننگ ٹیبل کے قریب آئی۔

''رونق سے مراد آپ کی مما......'' رجاء بھاپ اڑاتی چائے کے چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگی۔

''رونق سے مراد آپ کے پاپا ہیں۔'' سائرہ کی شرارت پر کامران کے لبوں پر تبسم بکھر گیا۔ رجاء کافی حیرت سے دیکھنے لگی۔

''پاپا! آپ مجھے ڈراپ کر دیں گے؟'' چائے ختم

کر کے وہ جیسے جانے کے لیے پر تولنے لگی۔
"جی بالکل بیٹا!" آج وہ خاصے اچھے موڈ میں لگ رہے تھے۔ سائرہ نے اس غیر معمولی تبدیلی پر خوشی کا اظہار کیا اور وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔
"کیا بات ہے آج آپ کافی خوش لگ رہے ہیں کوئی خاص وجہ!" اس سے قبل کہ کامران کوئی وضاحت پیش کرتا رجاء ناراضی سے ٹوک بیٹھی۔
"مما! کمال کرتی ہیں آپ اگر پاپا خوش ہیں اچھے موڈ میں ہیں تو آپ کو تو اسی بات پر خوش ہونا چاہیے نا کہ آپ اس طرح کہہ کر انہیں Disheart کریں۔" کامران نے اپنی حمایت پر مشکور انداز میں اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ سائرہ نے ان دونوں کو مصنوعی خفگی سے گھورا اور دوسرے ہی لمحے مسکرا دیں۔
رجاء بھاگ کر اندر کی جانب چل دی۔ سائرہ چائے کا کپ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور ٹیبل سے سب چیزیں سمیٹنے لگیں۔ کامران کی نظر نیوز پیپر پر پڑی تو وہ ہیڈ لائنز پر نظر ڈالنے لگے۔ تب ہی ٹیبل پر رکھا سیل فون بجنے لگا۔ اس سے قبل کہ کامران ٹیبل کے نزدیک آتا سائرہ سیل اٹھا چکی تھیں۔ اسکرین پر سرسری سی نگاہ ڈال کر انہوں نے سیل کامران کی جانب بڑھا دیا اور وہ خالی کپوں کی ٹرے اٹھا کر کچن کی جانب چلی گئیں۔
"او کے میں ایک گھنٹے میں آ رہا ہوں یو ڈونٹ وری یار......"
"چلیں پاپا!" وہ کاندھے پر بیگ اٹھائے تیار تھی۔
"ہاں بیٹا بالکل۔"
انہوں نے عجلت سے سیل فون ڈسکنیکٹ کرتے ہوئے پاکٹ میں رکھا اور اس کے پیچھے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل آیا۔ پورچ میں کھڑی وائٹ کار کی جانب بڑھتے ہوئے انہوں نے سائرہ کو آتے دیکھا تو وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے مگر گاڑی کا لاک کھول کر وہ بیٹھنے ہی والے تھے۔ جب سائرہ نے اس کی نگاہوں کو جان کر خود ہی پوچھ لیا۔
"آج آپ جلدی آ جائیں گے ناں؟"
"نہیں سائرہ! آج شاید لیٹ ہو جاؤں گا، تم کھانے پر انتظار مت کرنا۔" اس سے پیشتر کہ وہ مزید سوال کرتیں وہ فوراً ہی گاڑی میں بیٹھ گئے۔
"بائے مما۔" پورچ سے گاڑی کے نکلتے ہی اس نے ہاتھ ہلایا۔ وہ جواب دیتیں واپس اندر کی جانب بڑھ گئیں۔

☆......☆

"یار سیریسلی! مجھے تو ماہ رخ ایک آنکھ نہیں بھائی۔ ایک تو اس کا رنگ اتنا ڈارک ہے اوپر سے وائٹ یونیفارم یار بالکل بھی سوٹ نہیں کرتا اس پر مجھے تو لگتا ہے وہ زرینہ (کالج کی بوا) کی بیٹی ہے اور خود کو افلاطون سمجھتی ہے۔" پچھلے آدھے گھنٹے سے رجاء فون پر بزی تھی سائرہ کچن میں رضیہ کے ساتھ کام کروا رہی تھیں مگر دھیان رجاء کی گفتگو پر ہی تھا۔
"ہاں یار! اور دیکھو ناں میڈم ملائکہ اس کو ہر وقت Appriciate کرتی رہتی ہیں۔ جیسے اس سے زیادہ ذہین تو کوئی دوسرا ہے ہی نہیں۔" وہ دل کی بھڑاس جی بھر کے نکال رہی تھی یقیناً دوسری جانب بھی اس کی ہم خیال تھی تب ہی تو گفتگو طول پکڑتی جا رہی تھی۔
"یار! کوئی پلان بناؤ اس کو میڈم ملائکہ کیا کوئی بھی اس کو انکریج نہ کرے۔" اس کے لہجے میں رعونت ہی رعونت کے سوا کچھ نہ تھا۔
"زویا پلیز یار! اب تم تو کم از کم اس کی سائیڈ مت لو۔" وہ تپ کر رہ گئی۔
"مجھے وہ بہت زہر لگتی ہے۔ I hate her۔" اب کی بار لہجے میں نفرت سی بھر گئی۔
"کوئی اور بات نہیں تمہارے پاس۔" وہ غصے سے بھڑکنے لگی۔ زویا دوسری جانب سے اس کے

غصے سے حظ اٹھا رہی تھی۔ سائرہ اس کی باتیں سن کر کچن سے نکل آئیں۔ اس کے لہجے و انداز پر سخت حیرت بھی تھی اور کہیں زیادہ افسوس بھی تھا کہ وہ کسی کے لیے ایسے جذبات رکھتی ہے۔

"پلیز زویا! Leave this topic۔" میں اسے دیکھنا تو کیا اس کے بارے میں بات بھی کرنا پسند نہیں کرتی۔ کالی کوئل ہنہہ......" غصے سے دانت کچکچاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اپنی بھڑاس نکالی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اگر وہ ابھی اس کے سامنے آجائے تو اس کا حشر کردے گی۔

سائرہ کو قطعاً اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کسی کی یوں تذلیل کرے۔ دوسری جانب وہ مگن رہی۔ سائرہ نے تین چار بار پکارا مگر رجاء نہ جانے سن رہی تھی یا پھر دانستہ طور پر ان سنی کر رہی تھی۔

"رجاء" اس بار قدرے بلند آواز سے پکارا تو اس نے اس کے غیر معمولی موڈ کو دیکھ کر فون رکھنے کا ارادہ کر ہی لیا۔

"او کے زویا! میں پھر بعد میں کال کروں گی۔"

"رجاء! کیا ہوتا جا رہا ہے تمہیں؟" وہ مکمل طور پر آج اس سے باز پرس کرنے کے موڈ میں تھیں۔

"جی مما! کیا کہہ رہی ہیں آپ میں کچھ سمجھ نہیں پائی۔" اس نے الجھن سے اسے دیکھا۔

"ابھی تم کس کے بارے میں بات کر رہی تھیں زویا سے۔"

"مما! وہ ایک نئی لڑکی آئی ہے کالج میں......" اس نے بے نیازی سے کہا۔

"تو تم سب اسی طرح سب نئی آنے والی لڑکی کو ڈسکس کرتی ہو۔" لہجے کی ناگواریت رجاء کی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ سارا معاملہ اس کا ہے اور اس کی کلاس فیلوز کا انہیں آخر اس میں کیا پرابلم تھی بھلا؟"

"کیا مطلب ہے مما؟" اس کی تیوریاں شکن آلود ہونے لگیں۔

"مطلب یہ ہے کہ آخر تم کالج میں کیا کرنے جاتی ہو، تعلیم ڈگری کا نام نہیں ہے رجاء۔ یہ ہمیں ضابطہ اخلاق، مذہب، رہن سہن ہر ایک چیز کی اہمیت اور ہر ایک چیز کو زندگی میں شامل کرنے بلکہ کس حد تک شامل کرنا ہے اور کیسے، ہر ایک چیز کا شعور دیتی ہے۔"

"مما! آپ کو کیا ہو گیا ہے، میں نے ایسا تو کچھ بھی نہیں کیا ہے کہ آپ مجھے اس طرح ڈانٹیں یا لمبے لمبے لیکچر دیں۔" لہجے کی ناگواریت اس کے چہرے پر بھی نمایاں ہونے لگی تھی۔ اس کو سائرہ کا یوں سمجھانا قطعاً نہ بھایا تھا۔

"نہ تو میں تمہیں ڈانٹ رہی ہوں نہ ہی لیکچر دے رہی ہوں۔ میں صرف تمہیں تعلیم کی اہمیت اور اس کے مقصد کے بارے میں آگاہ کر رہی ہوں۔"

"مما! میں کوئی ان پڑھ لڑکی نہیں ہوں یا مڈل کلاس میں رہنے والی نہیں ہوں کہ آپ مجھے اٹھنے بیٹھنے سونے جاگنے کا طریقہ بتائیں، مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ مجھے اپنی سوسائٹی میں کس طرح موو کرنا ہے۔" وہ بگڑ کر بولی۔ سائرہ ہکا بکا رہ گئیں۔ اس سے اس قدر بدلحاظی کی توقع نہیں تھی انہیں۔ انہیں یوں ہی حیران پریشان چھوڑ کر وہ اندر چلی گئی اور ان کے ذہن میں ایک سوچوں کی یلغار ابلنے لگی تھی جیسے۔

"اتنی تبدیلی آگئی ہے رجاء میں اب نہ اسے تنقید برداشت ہوتی ہے نہ ہی نصیحت ہی اسے بھاتی ہے۔ ماں کی باتیں اب اسے ناگوار لگنے لگی ہیں۔ یہ کس ڈگر پر نکل گئی ہے۔ نصیحت کو برداشت نہ کرنا نافرمانی میں داخل ہونے کی پہلی نشانی ہوا کرتی ہے۔" ان کا دل ہولنے لگا۔ اس کے طور طریقوں پر وہ پہلے ہی اس سے نالاں رہا کرتی تھیں مگر اس بدتمیزی کی انہیں ہرگز بھی توقع نہیں تھی۔ وہ سر تھام کر رہ گئیں۔

☆......☆

"رجاء کالج اور کوچنگ کی کلاسز تو ریگولر جوائن کر رہی ہے مگر رزلٹ کچھ خاص نہیں آیا ہے۔" سائرہ

اس بات کو لے کر بہت فکر مند تھیں جب سے ان کو معلوم ہوا تھا کہ وہ رزلٹ میں ہاف مارکس بھی نہیں لے سکی ہے۔

''ہوں۔'' کافی دیر بعد ان کا مگن سا جواب آیا تھا۔

''لیپ ٹاپ پر انگلیاں متحرک تھیں۔

''سمجھ نہیں آرہا وہ اسٹڈی میں ویک کیوں ہے۔''

وہ اس کے لاپرواہ رویے سے پریشان تھیں۔ دن رات اٹھتے بیٹھتے بس انہیں رجاء کی اسٹڈی کی ہی فکر کھائے جا رہی تھی۔

''آپ اس سلسلے میں بات کر کے دیکھیں رجاء سے۔'' وہ خود تو کافی بدظن سی ہو گئی تھیں اس بابت۔

''سن رہے ہیں میں کیا کہہ رہی ہوں آپ سے۔'' وہ اس کی عدم توجہی پر چڑ ہی تو گئی پتا نہیں وہ ٹھیک سے سن بھی رہے تھے کہ نہیں۔

''ہاں، ہاں......'' وہ سرسری سے انداز میں بولے۔ مبادا اسے معلوم نہ ہو جائے کہ وہ اس کی بات پر توجہ نہیں دے رہے۔ ان کی مکمل توجہ لیپ ٹاپ پر تھی۔

''پلیز رضا! یہ تو بند کریں پہلے۔'' وہ زچ ہو کر لیپ ٹاپ آگے سے ہٹانے کے لیے بڑھیں تو رضا نے ان کا ارادہ بھانپتے ہوئے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

''کیا ہوا ڈیئر۔'' انہوں نے ان کے خفا خفا چہرے کو دیکھا۔

''اس کا مطلب ہے آپ نے کچھ بھی نہیں سنا جو کچھ بھی میں نے کہا؟'' وہ شکوہ کناں ہوئیں۔ انہیں ان سے ایسی توقع نہ تھی۔

''اب معلوم ہوا کہ رجاء آپ پر ہی گئی ہے۔'' وہ بگڑ کر بولیں انہیں بہت تاؤ آرہا تھا۔ دونوں کی غیر سنجیدگی پر۔ ان کے کہنے پر وہ قہقہہ لگا اٹھے۔

''کیا مطلب ہے اس بات سے؟'' وہ مسکراہٹ دبانے کی سعی کرنے لگے۔

''آپ سے تو کچھ بھی کہنا بے کار ہی ہے۔'' وہ اب باقاعدہ ناراض ہو کر چہرے پر نائٹ کریم لگانے بیٹھ چکی تھیں۔

''سائرہ پلیز! کم از کم ناراض تو مت ہو۔ بولو کیا بات ہے تم رجاء کے بارے میں کچھ بتا رہی تھیں شاید......'' وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔

''میری تو سمجھ نہیں آرہا کہ آپ کو رجاء کی کن کن باتوں پر توجہ دلاؤں۔ میں کسی بات پر خدشے کا اظہار بھی کرتی ہوں تو آپ کو میری سوچ دقیانوسی لگنے لگتی ہے۔'' وہ بہت زیادہ خفا تھیں رجاء سے بھی اور ان سے بھی۔

''یار! کبھی تو رجاء کے علاوہ کسی اور پر بھی نظر کر لیا کرو۔'' وہ پھر غیر سنجیدہ دکھائی دینے لگے۔ انہوں نے گھور کر انہیں دیکھا جہاں سنجیدگی کا شائبہ تک نہ تھا۔ انہیں معلوم تھا کچھ بھی کہنا بے سود ہے۔

''اب تو مسکرا دو یار مجھے سنجیدہ بیوی بالکل اچھی نہیں لگتی۔'' ان کی مسکراتی نگاہوں کا جواب انہوں نے مسکرا کر ہی دیا۔ جانتی تھیں رضا کو سنجیدہ رہ کر اپنی بات منوانا ناممکن ہے۔ اور وہ ایسے ہی تھے ہر بات کو مذاق میں اڑا دینے کے عادی۔ ہر بات کو لائٹ لینے والے۔

☆......☆

''مما پلیز! آج جانے دیں ناں۔'' وہ آج پھر ان کے سر ہو رہی تھی۔

''رجاء۔'' انہوں نے برہمی دکھائی مگر وہ اپنی ضد پر مصر تھی۔

''مما پلیز! آج زویا نے سب فرینڈز کی پارٹی رکھی ہے میں نہیں جاؤں گی تو وہ بہت ناراض ہو گی۔'' وہ انہیں ہر طور منانے پر تلی ہوئی تھی۔

''مجھے تمہارے جانے پر اعتراض نہیں ہے رجاء! بات ہوتی ہے وقت کی۔ تمہارے ایگزام نزدیک

ہیں اور تمہیں گھومنے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔"
"مما! کہا ناں جلدی آجاؤں گی، ویسے بھی میں رات کو ہی کرتی ہوں اسٹڈی اور رات تک میں واپس بھی آجاؤں گی۔" اس کے پاس ہر بات کا جواب موجود تھا۔
"او کے چلی جاؤ مگر جلدی واپس آنا۔" انہوں نے ہر بار کی طرح ہتھیار ڈال دیئے۔
"تھینک یو مما۔" وہ اس کے بائیں گال پر کس کرتی اپنے روم میں تیار ہونے چلی گئی۔

☆......☆

"رضا! آج آپ جلدی آجائیں۔" انہوں نے فون کر کے رضا سے اصرار کیا۔
"کیوں؟" ہمیشہ کی طرح سوال۔
"آج کہیں کھانے پر باہر چلتے ہیں۔" انہوں نے وجہ بتائی۔
"تم رجاء کو ساتھ لے جاؤ مجھے آج دیر ہو جائے گی۔" ان کے انکار پر بہت دل دکھا آج بہت آس سے کہا تھا انہوں نے۔ روز کا یہ ہی رونا تھا۔ رضا ہمیشہ لیٹ آتے اور رجاء کی آئے دن کی پارٹیاں اور کمبائن اسٹڈیز وہ اکیلے رہ رہ کر تھک گئی تھیں اس روٹین سے۔
"پلیز رضا! آج جلدی آنے کی کوشش کریں۔" اس بار وہ التجا کر رہی تھیں۔
"یار! بہت مشکل ہے Next ٹائم۔" ان کی طرف سے صاف انکار تھا۔
انہوں نے آہستگی سے سیل ٹیبل پر رکھ دیا۔
"بی بی جی! میں جاؤں اب۔" خانساماں کھانا پکانے کے بعد ان سے اجازت طلب کر رہا تھا۔
"رحمت بابا! آج کھانا آپ لے جائیں اپنے گھر۔" ان کے ایک ایک انداز میں تھکاوٹ سی تھی۔
"مگر کیوں بی بی؟" وہ حیران پریشان کھڑے تھے۔ "سب کھانا کھا کر آئیں گے۔"
"اور آپ بی بی؟" وہ فکر مندی سے بولے۔
"مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ انہیں جواب دے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ رحمت بابا کے جانے کے بعد انہوں نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر کھڑی گاڑی کی جانب آئیں۔ گاڑی لے کر وہ روڈ پر آتو گئی تھیں مگر نہیں معلوم تھا کہ جانا کدھر ہے۔ گھر سے انہیں وحشت ہو رہی تھی، گھر کا سناٹا کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ دماغ کو پرسکون کرنے کے لیے انہوں نے پارک کا رخ کیا۔ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ پارک کی تمام لائٹیں آن ہو چکی تھیں۔ ہنستے مسکراتے کچھ بچے فٹ بال سے کھیلنے میں مگن تھے۔ کتنے بزرگ اور کتنی ہی خواتین تھیں مگر تنہا کوئی بھی نہ تھا سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کافی دیر تک وہ اس ماحول سے خود کو بہلاتی رہیں پھر اٹھ کر گاڑی کی طرف آگئیں۔ گاڑی ریسٹورنٹ پر لا روکی۔ سر میں شدید درد اٹھ رہا تھا۔ سو کافی پینے چلی آئی تھیں۔ بیٹھنے کے ساتھ ہی ان کی نگاہ سامنے والی ٹیبل پر گئی۔ سامنے والی چیئر پر چالیس سالہ شخص قہقہوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ لڑکی کی پشت ان کی جانب تھی لڑکی کا چہرہ دکھائی نہ دے رہا تھا مگر وہ اسے لاکھوں میں بھی پہچان سکتی تھیں۔ وہ سرعت سے اٹھیں اور بجلی کی تیزی سے لڑکی کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئیں۔ ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔ ایک قہر آلود نگاہ انہوں نے اس شخص پر ڈالی جس نے کچھ دیر پہلے رجاء کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔
"رجاء چلو یہاں سے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑتی تقریباً گھسیٹتی ہوئی گاڑی تک لائیں۔ دروازے کے لاک کھول کر اسے سیٹ پر دھکا دیا اور پھر جلدی سے دوسری جانب سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئیں گھر پہنچنے تک انہوں نے کوئی ایک بات بھی رجاء سے نہیں کہی تھی۔ دل و دماغ سن ہوئے جا رہے تھے۔ یہ منظر غیر یقینی تھا۔ ریسٹورنٹ سے گھر تک کے راستے میں ایک

ہزار بار اس شخص کا چہرہ اور اس کا رجاء کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتا نگاہوں میں گھومتا رہا۔

"کون تھا وہ؟" گھر آکر اس نے قدرے دھیرے سے پوچھا تھا۔

"م......مم......م......مما وہ......" وہ بدحواس ہو رہی تھی سمجھ نہیں آرہا تھا یہ ہوا کیا ہے۔

"بولو کب سے یہ سب چل رہا ہے۔" اس بار آواز قدرے بلند ہوگئی۔

"ماں باپ کو کب سے بے وقوف بنا رہی ہو بولو۔" اس نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا اسے اسی وقت جان سے مار ڈالے۔

"کیا ہوا؟" رضا ابھی ابھی اندر آئے تھے اندر آتے ہوئے ان کی آواز سن چکے تھے۔

"آپ خود پوچھ لیں اپنی لاڈلی سے۔"

وہ صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ کبھی بے طرح بدحواس ہوتی رجاء کو دیکھ رہے تھے تو کبھی غصے میں آپے سے باہر ہوئی سائرہ کو۔

"افیئر چل رہا ہے ان کا کسی انکل کے ساتھ؟" ایک ایک لفظ کو چباتے ہوئے انہوں نے یوں بولا گویا اس شخص کا غصہ نکال رہی ہوں۔ وہ انکشاف پر ہکا بکا رہ گئے۔

"آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی ہے یہ ہمارے، کبھی کمبائن اسٹڈیز کا بہانہ، کبھی پارٹی کا بہانہ...... اور ہم ہر بار بے وقوف بنتے رہے۔" انہیں خود پر افسوس ہونے لگا کہ وہ ہی اس کو اجازت دے دیا کرتی تھیں جانے کے لیے۔

"بولو کون تھا وہ؟" اس نے غصے سے ایک بار پھر اسے جھنجھوڑا۔

"م......م......مما وہ سر ہیں۔" روہانسی ہو رہی تھی۔

"سر؟" تاسف سے انہوں نے سر ہلایا۔

"کب سے چل رہا تھا یہ چکر بولو جواب دو۔" ان کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ ایک آگ سی سینے میں دہک رہی تھی۔ انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ رجاء کا کیا کر ڈالیں۔ وہ خاموش رہیں۔

"تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آئی اپنی باپ کے عمر کے شخص کے ساتھ عشق لڑاتے ہوئے۔ ایک بار بھی تم نے نہیں سوچا ماں باپ کی عزت کو خاک میں ملاتے ہوئے۔ اعتبار کرنے کا یہ صلہ دیا تم نے ہمیں۔" غم و غصے کی کیفیت میں وہ کبھی غصے میں بلند آواز میں چلانے لگیں تو کبھی رنجیدہ ہو جاتیں مگر اس سارے معاملے میں رضا بالکل خاموش تھے۔

"آپ پوچھیں ناں اس سے کیوں کیا اس نے ایسا؟" اس کے آنسو گالوں پر لڑھکنے لگے تھے۔

"اب کچھ کہتے کیوں نہیں آپ اسے؟" انہوں نے رضا کو جھنجھوڑا جو شاید صدمے کی کیفیت سے نکل نہیں پارہے تھے۔

"آپ کی ہی دی ہوئی Freedom کا نتیجہ ہے یہ، دیکھ لیا اتنی زیادہ آزادی کا انجام، ہماری عزت خاک میں ملا دی اس نے۔" وہ اب نڈھال سی صوفے پر ڈھے گئیں۔ وہ چپ سادھے دیکھتے رہے، سنتے رہے۔ پھر واش روم میں چلے گئے واش بیسن کھول کر کتنی ہی دیر ہاتھ دھوتے رہے۔ منہ دھوتے رہے۔ واش بیسن کے اوپر لگے آئینے سے ان کا عکس دکھ رہا تھا مگر یہ بیرونی عکس تھا اندرونی چہرے سے تو کوئی واقف نہ تھا۔ وہ کیسے رجاء سے سوال کرتے یا اعتبار کے ٹوٹنے کی شکایت کرتے۔

ان کے لیٹ آنے کی وجہ 20 سالہ تحریم نیازی تھی جس کے ساتھ وہ ڈنر کر کے آرہے تھے۔ "سائرہ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا رجاء ان پر ہی گئی ہے۔ ان میں اور رجاء میں کوئی فرق نہیں تھا۔"

......☆......

ام کلثوم زیب

افسانہ

کمانے کے رشتے

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے محبوب شوہر کو دیکھ رہی تھی جن کے منہ سے الفاظ نہیں انگارے نکل رہے تھے۔

''عانیہ بیگم! جوروش تم نے اختیار کی تھی آج وہی راستہ میری بیٹی کو دکھا رہی ہو مگر میں تمہیں کبھی ایسا کرنے نہیں دوں گا۔''

''عالیان! اگر منال خود ہی اس لڑکے کے پیچھے پاگل ہو رہی ہے تو اس میں میری کیا غلطی ہے۔'' اس نے سخت احتجاج کیا تھا۔

''اچھا......!'' عالیان استہزائیہ ہنسے تھے۔

''جب ایک ماں اپنی اولاد کی تربیت کرتی ہے تو سب سے پہلے اسے اچھے برے کی تمیز سکھاتی ہے۔ ہر غلط راستے سے روکتی ہے مگر عانیہ بیگم تم یہ سب کیونکر کرو گی جب کہ تم خود بھی اچھی بیٹی اچھی بہن اچھی بیوی ثابت نہ ہو سکیں تو اچھی ماں کیسے بن سکتی ہو۔'' عالیان کا زہر میں ڈوبا ہر لفظ عانیہ کے دل میں تیر بن کر اتر رہا تھا۔

''مگر نہیں غلطی تو میری ہے جو تم جیسی عورت سے شادی کر کے اپنی زندگی برباد کر لی۔ ایسی عورت جس نے میرے رشتوں کو مجھ سے چھین لیا اور اب میری اولاد کو مجھ سے جدا کرنا چاہتی ہے۔'' عالیان کے لفظوں نے اس کو چھلنی کر دیا تھا۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے اس نے سامنے کھڑے اپنے محبوب کو دیکھا تھا مگر عالیان تو جیسے پچھلے بیس سالوں کا غبار نکال رہے تھے۔

''جو عورت اپنے ماں باپ کی نہ بن سکی وہ میری اور میری اولاد کی کیسے بن سکتی ہے۔'' آخری وار کرتے وہ وہاں سے جا چکے تھے۔ عانیہ زمین پر ڈھے گئی تھی جس شخص کی خاطر بیس سال پہلے اپنے رشتوں کو ٹھکرایا تھا۔ آج اسی شخص نے آسمان سے زمین پر پٹخ دیا تھا۔ بیس سالوں کی ریاضتوں کو اس شخص نے لمحوں میں ریزہ ریزہ کر دیا تھا جس کی خاطر عمر بھر اذیتیں سہی تھیں آج وہی شخص اپنی اولاد کے غلط راستوں پر چلنے کا موردِ الزام اسے ٹھہرا رہا تھا۔ آنکھوں سے نکلنے والے موتی ماضی کی یاد میں قطرہ قطرہ پگھل رہے تھے۔

☆......☆

''عانیہ بیٹا! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' مما اس کی بچگانہ بات پر جلدی سے اس کی طرف بڑھی تھیں۔

''مما! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں، مجھے احتشام سے نہیں عالیان سے شادی کرنی ہے۔'' لاؤنج میں بیٹھے سب لوگ اس کی بات پر ششدر رہ گئے تھے۔

''عانیہ! کیا بدتمیزی ہے یہ۔'' بھیا اس کی فضول بکواس پر دہاڑے تھے۔

''بیٹا! تم جانتی ہو کارڈ بٹ چکے ہیں۔ دس دن بعد تمہاری شادی ہے۔ ہماری عزت خاک میں مل جائے گی۔'' مما نے اسے خود سے لگا کر بہت نرمی سے سمجھایا تھا جب کہ بابا خاموشی سے محض اسے دیکھ



رہے تھے۔

"مگر مما! آپ لوگوں کی خاطر میں اپنی زندگی برباد نہیں کرسکتی یہ میرا حق ہے۔" جواباً وہ بڑی بدتمیزی سے بولی تھی۔

"چٹاخ...... خبردار جو ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں تمہاری جان لے لوں گا۔" بھیا نے پوری قوت سے اسے تھپڑ مارا تھا۔ وہ ششدر رہ گئی۔ پھر بھاگتی ہوئی خود کو کمرے میں بند کرگئی تھی۔ دنیا کی بیسٹ مما، بابا کو آج اس کے تڑپنے کی کوئی پروا نہیں تھی اور جان چھڑکنے والے بھیا کے تھپڑ نے اسے جیسے توڑ دیا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی جن لوگوں کی اس میں جان تھی، وہ آج کس قدر بدل گئے تھے۔

"عانیہ بیٹا! دروازہ کھولو۔" مما، بابا کب سے کھڑے دروازہ بجا رہے تھے۔ عانیہ صبح سے دروازہ بند کیے بیٹھی تھی۔ وہ بھلا کب اس کو دکھی دیکھ سکتے تھے۔

"نہیں...... کھولوں گی میں دروازہ اور اگر آپ لوگوں نے میری بات نہیں مانی تو میں خود اپنی جان لے لوں گی۔" وہ آنسو بھری آواز میں چیخی تھی تو مما بابا ساکت رہ گئے تھے۔

"ہم تمہاری ہر بات مانیں گے، عانیہ پلیز! باہر آجاؤ۔" تھوڑی دیر بعد بابا کی شکستہ سی آواز سنائی دی تھی اور اندر بیٹھی نادان عانیہ ظہیر اپنی فتح پر مسکرا دی تھی پھر اس کی شادی اس کے چچازاد احتشام سے کینسل کر کے عالیان سے کردی گئی تھی۔ اس نے اپنے عزیز از جان رشتوں پر اپنی محبت کو ترجیح دی تھی۔ ساری عمر عالیان مرزا سے ہر حالت میں نبھائی تھی اور آج اس شخص نے سب ختم کردیا تھا۔ بڑے سے خوب صورت گھر کا دروازہ کھولتی عانیہ ظہیر بیس سال بعد وہی عانیہ تھی، جسے اپنے رشتوں سے عشق تھا۔ درد کی ایک تیز لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی۔ آنکھیں جل تھل کرنے لگی تھیں۔ بھابی بہت اچھے طریقے سے ملی تھیں اور بھیا بھی ہمیشہ کی طرح بازار سے اس کی پسند کی چیزیں لینے چلے گئے تھے مگر وہ بیس سال پہلے والے بھیا کہاں تھے جو اس پر جان چھڑکتے تھے جو اس کی زندگی کے ہر رنگ سے واقف تھے اور اس کے آنسو پر تڑپ اٹھتے تھے مگر نہیں وہ محبتیں تو اس نے خود کھوئی تھیں، عالیان مرزا کی خاطر مما، بابا اب اس جہان میں نہیں تھے مگر ان کی مہک پھر بھی ان در و دیوار میں رچی بسی تھی۔ وہ اٹھ کر مما، بابا کے کمرے میں آگئی۔ آج بھی وہ کمرہ ویسا ہی تھا۔ بھیا نے آج بھی ان کی یادوں کو سنبھال رکھا تھا اگر نہیں تھے تو اس کے دنیا کے بیسٹ مما، بابا نہیں تھے۔ مما کی ممتا بھری گود نہیں تھی اور بابا کا شفقت بھرا سینہ، آج بیس سال بعد اسے رشتوں کا احساس ہوا تھا تو آج وہ ان کی اہمیت جان گئی تھی۔ آج اپنوں اور غیروں میں فرق سمجھ آگیا تھا۔ وہ خون کے رشتوں کی مضبوطی اور گہرائی کو جان گئی تھی۔ رشتوں کی مثال نازک آبگینوں کی طرح ہوتی ہے اگر انہیں سینت سینت کر رکھا جائے تو ٹھیک ورنہ ذرا سی بے احتیاطی سے اگرچہ وہ ٹوٹتے نہیں مگر ان میں دراڑ ضرور پیدا ہوجاتی ہے اور پھر لاکھ چاہنے کے باوجود وہ دراڑ مٹ نہیں پاتی، اس کے اور اس کے رشتوں کے درمیان بھی وہ دراڑ آج تک موجود تھی جس کی ذمہ دار وہ خود تھی، اس وقت انہوں نے اس کی خواہش پوری کردی تھی۔ پورے خاندان میں ان کی عزت تماشا بن کر رہ گئی تھی مگر انہوں نے پھر بھی اس سے تعلق نہیں توڑا تھا مگر ان کی محبتوں میں وہ شدتیں ختم ہوگئی تھیں آج عانیہ ظہیر اپنے اٹھائے گئے اقدام پر تڑپ اٹھی تھی مگر وہ سب واپس نہیں آسکتا تھا۔ سب ختم ہوچکا تھا آج وہ اس تکلیف دہ مقام پر بالکل تنہا کھڑی تھی۔

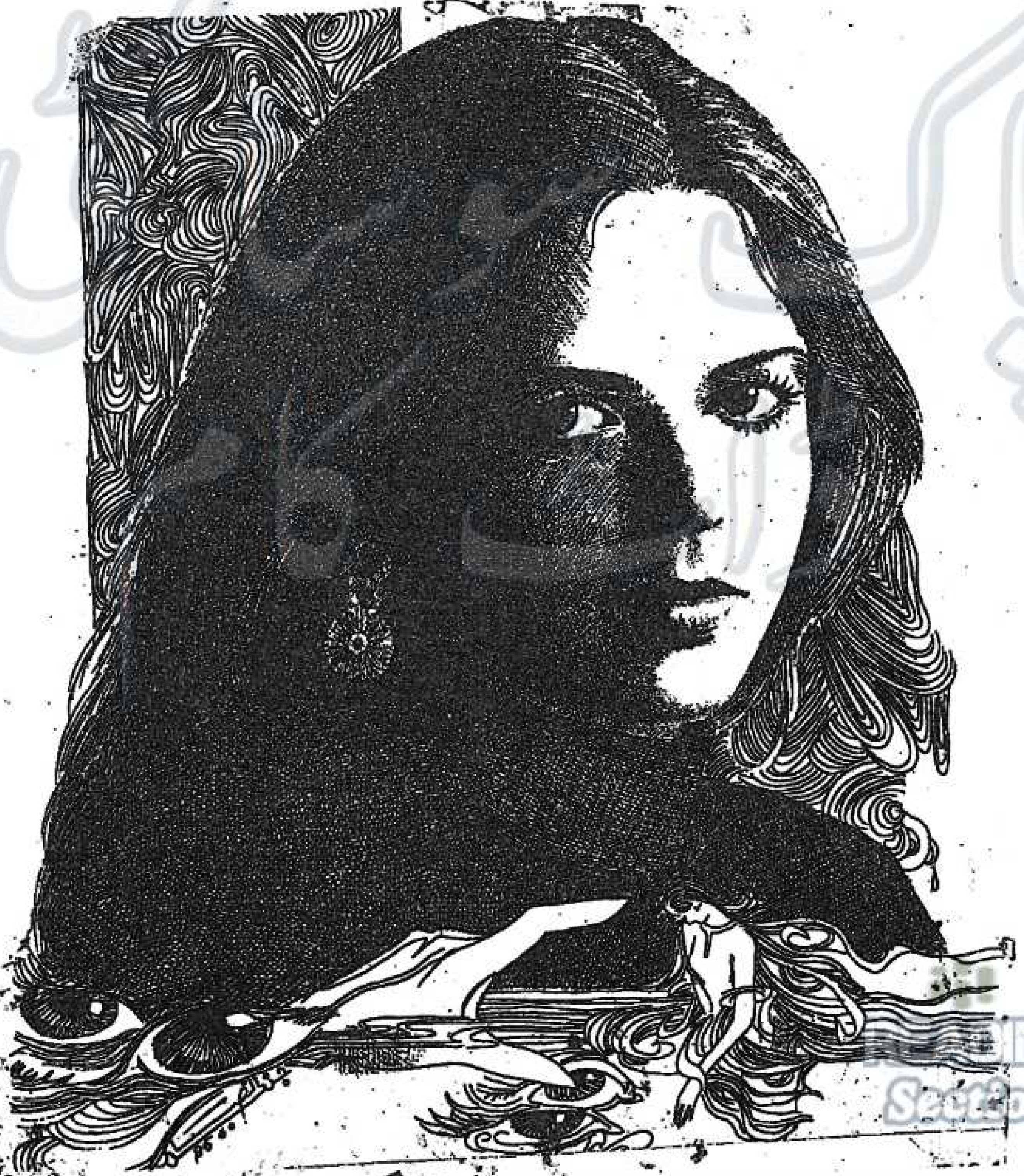
......☆......

نظیر فاطمہ

افسانہ

احساس کا رشتہ

''کیوں چچا! اب آپ کو معلوم ہوا کہ گھر سے بھاگی ہوئی عورت کا باپ کہلانا کتنا اذیت ناک ہے؟ بھاگی ہوئی عورت کا طعنہ برداشت کرنا کتنا مشکل ہے؟ یقیناً آپ کو اب بہت اچھی طرح معلوم ہو چکا



ہے۔'' فضل کی یہ بات سن کر کمرے میں موجود ایک مرد کا سر جھک گیا اور وہ سوچنے لگا تھا کہ میں نے معاف کرنا کیوں نہیں سیکھا۔ جب کہ دوسرا مرد فضل کو ناگواری سے گھورنے لگا تھا اور وہاں موجود عورت کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔

☆......☆

پچیس سال پہلے امتیاز صاحب اور رضوانہ نے پسند کی شادی کی تھی۔ امتیاز صاحب اور رضوانہ دور پرے کے رشتے دار تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ رضوانہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں اور بہت ناز و نعم میں پلی بڑھی تھیں۔ امتیاز صاحب کے والدین رضوانہ کا ہاتھ مانگنے گئے تو ان کے والدین نے چند وجوہات کی بنا پر رشتہ دینے سے انکار کر دیا لیکن وہ دونوں ایک دوسرے سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جب رضوانہ کے والدین کو منانے کی ہر کوشش بے کار ہو گئی تو دونوں نے کورٹ میرج کر لی۔ رضوانہ اس خوش فہمی کا شکار تھیں کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہیں بعد میں انہیں منا لیں گی اور وہ مان جائیں گے کیونکہ ان کے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ کورٹ میرج



کے بعد امتیاز صاحب رضوانہ کو اس کے گھر چھوڑنے آئے تو صورت حال کا علم ہوتے ہی رضوانہ کے والدین نے دونوں کو اپنے گھر سے نکل جانے کا حکم سنایا اور اپنے گھر کے دروازے ان پر ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے۔

رضوانہ کے لیے یہ بہت بڑی سزا تھی۔ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے والدین انہیں اس طرح گھر بدر کر دیں گے۔ بہر حال امتیاز صاحب ان کو لے کر اپنے والدین کے گھر آ گئے۔ ان کے والدین شریف لوگ تھے اور دل سے رضوانہ کو اپنے گھر کی بہو بنانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے نہ صرف انہیں اپنے گھر کی بہو تسلیم کیا بلکہ اسے اس کے جائز حقوق بھی دیئے۔ دونوں نئی زندگی کا آغاز کر چکے تھے لیکن رضوانہ اکثر اندرونی خلفشار کا شکار ہو جاتیں۔ انہیں یہ احساس کچوکے لگاتا کہ انہوں نے والدین کی نافرمانی کر کے اچھا نہیں کیا لیکن پھر امتیاز صاحب کے سمجھانے بجھانے پر نارمل ہونے کی کوشش کرتیں۔

☆......☆

ان کی شادی کو دو ماہ کا عرصہ گزر گیا تو امتیاز صاحب کا چھوٹا بھائی منیر دس دن کی چھٹی پر لاہور آیا۔ منیر ایک پرائیویٹ بینک میں کام کرتا تھا۔ آج کل اس کی پوسٹنگ اسلام آباد میں تھی۔ لہٰذا وہ دو تین ماہ بعد گھر آتا تھا۔ گھر آ کر جب اسے امتیاز صاحب اور رضوانہ کی شادی کی بابت معلوم ہوا تو وہ بہت چراغ پا ہوا اور اس نے ''گھر سے بھاگی ہوئی عورت'' کہہ کر رضوانہ کی بہت بے عزتی کی اور اپنے والدین سے مطالبہ کیا کہ وہ اس عورت کو گھر سے نکال دیں ورنہ وہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اگلے دن منیر غصے میں اسلام آباد واپس چلا گیا۔ منیر فطرتاً سخت مزاج اور حاکمیت پسند تھا۔ اس کے شدید ردعمل کو دیکھ کر امتیاز صاحب کے والدین نے انہیں اپنے دوسرے مکان میں شفٹ ہونے کا مشورہ دیا تو وہ دونوں الگ گھر میں شفٹ ہو گئے۔ وقت گزرتا رہا لیکن منیر کے دل سے رضوانہ کے لیے کدورت ختم نہ ہو سکی۔ امتیاز صاحب اور رضوانہ کی شادی کے دو سال بعد منیر کی شادی ہوئی۔ اس وقت تک امتیاز صاحب ایک بیٹے فضل کے باپ بن چکے تھے۔ منیر نے شادی کے بعد اپنی بیوی پر بھی یہ پابندی لگائی کہ وہ رضوانہ سے بات چیت اور دوستی کرنے کی کوشش نہ کرے۔ وقت گزرتا رہا اللہ تعالیٰ نے امتیاز صاحب کو دو بیٹے اور دیئے اور منیر کو دو بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا۔ منیر کا ٹرانسفر لاہور ہو چکا تھا۔ رضوانہ کے والدین اللہ کو پیارے ہو چکے تھے لیکن انہوں نے مرتے دم تک انہیں معاف نہیں کیا تھا۔ یہ چیز رضوانہ کو چین سے جینے نہیں دیتی تھی۔ گزرے پچیس سالوں میں بارہا منیر نے رضوانہ کو اپنے طعنوں اور سخت الفاظ کی مار سے زخمی کیا تھا۔ البتہ منیر کی بیوی اور بچے اس کی عدم موجودگی میں ان سے بہت اچھی طرح ملتے تھے۔ رضوانہ بھی ان کے سب بچوں خصوصاً رابعہ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ رضوانہ کے ساس سسر نے منیر کی طبیعت کی سختی کی وجہ سے امتیاز صاحب اور رضوانہ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی اور ان دونوں خاص کر رضوانہ نے ان دونوں کی خدمت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ پانچ سال پہلے دونوں یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

☆......☆

اب پچیس سال بعد ان دونوں بھائیوں کی اولادیں جوان تھیں۔ امتیاز صاحب کی خواہش تھی کہ منیر کی بیٹی رابعہ ان کے فضل کی دلہن بنے۔ جب انہوں نے اپنی یہ خواہش اس کے سامنے بیان کی تو وہ بھڑک اٹھا۔

''میں ضرور اپنی بیٹی کی شادی آپ کے بیٹے

سے کرتا اگر وہ اس بے اعتبار عورت کا بیٹا نہ ہوتا۔" امتیاز صاحب کے پوچھنے پر منیر نے تکبر سے کہا۔

"تمیز سے بات کرو وہ تمہاری بھابھی ہے۔" امتیاز صاحب بولے۔

"وہ صرف آپ کی بیوی ہے میری کچھ نہیں لگتی اور بہتر ہے آپ یہاں سے جائیں اور دوبارہ کبھی یہ بات کرنے کے لیے یہاں تشریف نہ لائیں کیونکہ میں رابعہ کی بات اپنے دوست کے بیٹے سے تقریباً طے کر چکا ہوں۔ بس رسمی اعلان کرنا باقی ہے۔" منیر کو اپنے الفاظ کی سختی کا احساس تک نہ تھا۔ (نہ جانے منیر یہ بات کیوں بھول جاتا تھا کہ کورٹ میرج کا فیصلہ امتیاز اور رضوانہ دونوں کا تھا۔ پھر قصوروار تنہا رضوانہ کیوں تھیں؟)

امتیاز صاحب دکھے دل کے ساتھ وہاں سے اٹھ آئے تھے۔ یہ سچ تھا کہ اس وقت جذبات میں آکر دونوں نے کورٹ میرج کرنے کی غلطی کرلی تھی۔ اس وقت انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کا یہ فعل ان کے بچوں کی زندگیوں پر اس طرح اثر انداز ہوگا۔ یہ بھی سچ تھا کہ رضوانہ برے کردار کی عورت نہیں تھیں۔ بس یہ غلطی کر بیٹھی تھیں اور آج تک اپنی اس غلطی پر پشیمان سی تھیں کہ انہوں نے اپنے والدین کی عزت کا خیال کیوں نہ کیا؟ کیوں خود غرض ہوگئی تھیں؟ کیوں انہوں نے اپنے والدین کو منانے کی بھرپور کوشش نہ کی؟ وہ نماز شب میں اللہ سے اپنے والدین کا مان اور دل توڑنے پر معافی کی خواستگار رہتی تھیں۔

☆......☆

اتوار کا دن تھا۔ امتیاز صاحب ناشتے کے بعد اخبار پڑھ رہے تھے کہ ان کا موبائل فون بجنے لگا۔ انہوں نے چیک کیا تو منیر کی کال تھی۔ اس روز کی تلخ کلامی کے بعد نہ تو وہ اس کے گھر گئے تھے اور نہ ہی انہوں نے اسے فون کیا تھا۔ اب اس کی کال آئی تو اس نے انہیں فوراً گھر آنے کو کہا۔ وہ وہاں پہنچے تو انہیں منیر بہت پریشان نظر آیا۔ اس کی بیوی تو باقاعدہ رو رہی تھی۔ منیر نے امتیاز صاحب کو بتایا کہ رابعہ کل یونیورسٹی گئی تو ابھی تک واپس گھر نہیں پہنچی۔ یہ سن کر امتیاز صاحب کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ دونوں بھائیوں نے مل کر ہر ممکن جگہ پر اسے تلاش کیا لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔

محلے والوں کو رابعہ کی گمشدگی کی بھنک پڑی تو کچھ لوگوں نے یہ بات پھیلا دی کہ وہ گھر سے بھاگ گئی ہے۔ لوگوں کی زبانیں کون پکڑ سکتا ہے حالانکہ پورا محلہ یہ بات جانتا تھا کہ وہ بہت شریف اور باکردار لڑکی ہے۔ اس کی بائیس سالہ زندگی ان لوگوں کے سامنے تھی مگر پھر بھی لوگ سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے تھے۔

یہ رابعہ کی گمشدگی کے تیسرے روز کی بات ہے کہ منیر کے موبائل پر صبح صبح ایک خاتون کی کال آئی کہ آپ کی بیٹی خیریت سے ہے۔ تھوڑی دیر میں آپ کے پاس ہوگی۔ تقریباً نو ساڑھے نو بجے ایک گاڑی منیر کے دروازے پر آکر رکی اور اس میں سے پچپن چھپن سال کی عمر کا ایک مرد، انتیس تیس سالہ ایک لڑکی اور رابعہ اترے۔ رابعہ کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس آدمی نے بیل بجائی۔ منیر اور اس کی بیوی دونوں باہر آئے اور رابعہ اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ منیر نے اس آدمی اور لڑکی کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

"پرسوں دوپہر کو آپ کی بیٹی میری بیٹی کی گاڑی سے ٹکرا کر بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس کے سر میں چوٹ آئی تھی۔ میری بیٹی ڈاکٹر ہے وہ اسے اپنے اسپتال لے گئی جہاں اس کی حالت کے پیش نظر اسے ایمرجنسی میں داخل کرلیا گیا تھا لیکن روڈ سے اسپتال تک آنے کے دوران آپ کی بیٹی کا بیگ کوئی

اٹھا کر لے گیا۔ آپ کی بیٹی بے ہوش تھی اور ہمارے پاس آپ لوگوں کو تلاش کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اسے صبح چار بجے کے قریب ہوش آیا اور تقریباً چھ بجے تک اس کے حواس بحال ہوئے تو یہ آپ کا موبائل نمبر اور اپنے گھر کا پتا بتانے کے قابل ہوئی۔ لہٰذا اب میں اپنی بیٹی کے ساتھ اسے چھوڑنے آیا ہوں تاکہ آپ لوگ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ یہ دن آپ نے جس اذیت میں گزارے ہیں اس کے لیے ہم باپ بیٹی دونوں آپ سے معافی چاہتے ہیں۔'' وہ آدمی بہت سلجھے ہوئے انداز میں بات کر رہا تھا۔

''کوئی بھی مسئلہ ہو تو آپ لوگ ہمیں فون کر لیجیے گا۔'' اس آدمی کی بیٹی نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر منیر کو پکڑایا اور دونوں باپ بیٹی جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆......☆

جیسے ہی رابعہ کے واپس آنے کی اطلاع محلے میں پھیلی تو محلے کی چند ٹوہ لینے والی عورتیں ہمدردی کی آڑ میں اس کو اپنی باتوں سے زخمی کرنے لگیں۔ کچھ نے اس بات کا اعتبار کیا کہ اسے واقعی کوئی حادثہ پیش آیا تھا اور کچھ نے اس بات کو نمک مرچ لگا کر پھیلایا اور اس کی خوب کردار کشی کی۔ آخر کو ایک کنواری لڑکی دو راتیں گھر سے غائب رہی تھی یہ کوئی معمولی بات تھی۔ اس صورت حال سے رابعہ تو بالکل ہی بے حال ہو گئی اور منیر باہر نکلتا تو لوگوں کی زبانیں اسے لہولہان کرنے لگتیں۔ رابعہ قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی قصور وار گردانی جاتی۔ منیر کے دوست نے اسی بات کو بنیاد بنا کر رشتے سے انکار کر دیا۔ رضوانہ، منیر کے رویے کی وجہ سے بہت کم اس کے گھر جاتی تھیں۔ آج جب وہ امتیاز صاحب کے ساتھ اس کے گھر آئیں تو وہ رابعہ کو دیکھ کے کٹ کر رہ گئیں۔ انہوں نے اسے گلے سے لگا کر اس کے سر پہ پیار کیا تو وہ انہیں اپنی بے گناہی کا یقین دلانے لگی۔ رضوانہ نے اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا اور کافی دیر اسے اپنے ساتھ لگائے بیٹھی رہیں۔ رضوانہ اور امتیاز صاحب نے دوبارہ منیر کے سامنے رابعہ کے لیے اپنی جھولی پھیلائی۔ اب حالات کچھ ایسے تھے کہ منیر کے پاس کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ لہٰذا اس نے ہامی بھر لی۔ ایک ماہ بعد فضل اور رابعہ کی شادی ہونا قرار پائی تھی۔

☆......☆

آج امتیاز صاحب اور منیر اسی سلسلے میں کچھ مشورہ کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے اور رضوانہ ان کے لیے چائے لے کر کمرے میں آئی تھیں۔ جب ان کا بیٹا فضل کمرے میں داخل ہوا اور منیر سے کہنے لگا۔ ''کیوں چچا! اب آپ کو معلوم ہوا کہ گھر سے بھاگی ہوئی عورت کا باپ کہلانا کتنا اذیت ناک ہے؟ بھاگی ہوئی عورت کا طعنہ برداشت کرنا کتنا مشکل ہے؟ یقیناً آپ کو بہت اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے۔'' وہ اپنی بات مکمل کر کے کمرے بلکہ گھر سے باہر جا چکا تھا۔

رات کو جب فضل واپس گھر آیا، رضوانہ لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ فضل وہیں چلا آیا اور ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا لیکن انہوں نے اس کے آنے اور اپنے ساتھ بیٹھنے کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ وہ مسلسل کسی گہری سوچ میں گم رہیں۔ اس کے پکارنے پر انہوں نے بڑی اجنبی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ تڑپ اٹھا۔

''کیا بات ہے؟ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں؟'' اس نے بے قراری سے پوچھا۔

''فضل! امتیاز صاحب اور میں نے رابعہ کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ ہم اس معصوم بچی کو بدکرداری کے طعنوں سے بچا سکیں لیکن تم تو خود

پتھر مارنے والے ہجوم میں کھڑے ہو۔ مجھے بہت دکھ ہے کہ تم نے اپنے چچا سے اس طرح کی بات کہی۔'' انہوں نے ناراضی سے کہا۔

''گویا ہم تینوں بھائیوں کے ہوش سنبھالتے ہی آپ اور ابو نے ہمیں بتا دیا تھا کہ آپ لوگوں کی شادی کس طرح ہوئی تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کا اور ابو کا فیصلہ درست تھا لیکن اس کے باوجود میں نے چچا کی آنکھوں میں آپ کے لیے ہمیشہ جو نفرت اور حقارت دیکھی ہے وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ کئی بار میرے سامنے انہوں نے آپ کو گھر سے بھاگ کر شادی کرنے والی بدکردار عورت کہا۔ اس لیے آج میں نے یہ سب کہہ کر چچا کو یہ احساس دلایا ہے کہ ماں یا بیٹی کے حوالے سے کوئی بھی طعنہ جھیلنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔'' اس نے گویا ماں کو اپنی اس بدتمیزی کی دلیل دی تھی۔

''فضل! تمہیں اپنے چچا کو معاف کر دینا چاہیے تھا وہ تو پہلے ہی لوگوں کے طعنوں سے چھلنی ہے رہی سہی کسر تم نے پوری کر دی۔'' ان کے لہجے میں بہت افسوس تھا۔

''انہوں نے آج تک آپ کو معاف نہیں کیا تو میں کیسے معاف کر دیتا؟'' وہ ابھی بھی اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔

''اچھا بس کرو اب، صبح اپنے چچا کے پاس جاؤ اور ان سے معافی مانگو اور ایک بات مجھے سچ سچ بتاؤ تم رابعہ سے شادی کرنے پر دل سے راضی ہو ناں؟'' انہوں نے اس کا جواب سنے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔

''اگر راضی نہیں ہو تو بتاؤ میں رابعہ کی شادی رحمٰن سے کروا دوں گی کیا ہوا جو وہ اس سے ایک سال چھوٹا ہے وہ میرا بہت اچھا اور احساس کرنے والا بچہ ہے۔'' رضوانہ نے بات ختم کی۔

''امی میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں رابعہ سے شادی نہیں کروں گا؟'' وہ رابعہ کے لیے اپنے دل میں پسندیدگی کے جذبات رکھتا تھا۔ ماں کی اس بات پر انہیں شکایتی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''لیکن ایک بات یاد رکھنا فضل اگر تم نے شادی کے بعد رابعہ کو اس حادثے کے حوالے سے کبھی تنگ کیا یا کوئی بھی دکھ پہنچایا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ بیٹا داغ دار کردار کا طعنہ برداشت کرنا خاص طور پر ایک عورت کے لیے بہت مشکل کام ہے۔ میں کسی حد تک قصوروار تھی لیکن اس کے باوجود میرے لیے یہ طعنہ ناقابل برداشت ہو جاتا تھا تو اس بے گناہ کے بارے میں سوچو کہ وہ یہ طعنہ سن کر کس تکلیف سے گزرتی ہوگی۔ بیٹا! اللہ غلطی پر نادم ہونے والوں کو معاف کر دیتا ہے لیکن ہم لوگ کبھی کسی کی غلطی کو معاف نہیں کرتے مرنے کے بعد بھی نہیں۔ بلکہ ہم تو دوسروں کو ناکردہ گناہوں اور غلطیوں کی سزا بھی دیتے ہیں۔ نہ جانے ہم لوگ اتنے سنگدل کیوں ہو جاتے ہیں۔'' رضوانہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

فضل ماں کی باتیں سن کر شرمندہ ہو گیا۔

''میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ چچا سے معافی بھی مانگ لوں گا اور رابعہ کو کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔'' اس نے اپنی ماں کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ فضل جا چکا تھا اور رضوانہ نے سکون سے آنکھیں موندھ لیں۔ رضوانہ رابعہ کی آڑ لے کر منیر سے اپنی بے عزتی کا خوب بدلا لے سکتی تھیں لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ وہ خود چوٹ کھائے ہوئے تھیں۔ ان کے دل نے رابعہ سے احساس کا رشتہ استوار کر لیا تھا جو سب رشتوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اسی رشتے کے حوالے سے انہوں نے منیر کو معاف کر کے رابعہ کے زخموں کا مرہم بننے کا فیصلہ کیا تھا۔

......☆......

عائشہ غفاری

افسانہ

راہِ الفت

''میرے جسم پر لگنے والی یہ معمولی چوٹیں میری روح کو مزید تقویت بخشتی ہیں۔'' فرہاد کی بات سن کر وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے افسوس سے بولا مگر مضبوط اور پختہ لہجے میں۔

''تم صرف اتنی سی چوٹ سے ڈر گئے؟ میں تو سینے پر گولی کھانے کے ارادے سے آیا ہوں، مجھے یہ چوٹیں ڈرا نہیں سکتیں، میرے حوصلے پست نہیں کر سکتیں۔ میرے حوصلے بے حد بلند ہیں اس پاک وطن پر میں سو بار قربان میرے بھائی۔'' لالک جان نے فرہاد کو ترس بھری نگاہوں سے دیکھا۔ وہ شرمندہ ہو گیا۔ وہ کتنا کم ہمت نکلا۔ بزدل نکلا۔ یہ الفاظ اس کے دل پر کوڑے برسانے لگے تھے۔ لالک جان بے حد بہادر، نڈر، حوصلہ مند اور نیک سیرت کے علاوہ خوبرو نوجوان تھا۔ اس کی ہمت و جنوں دیکھ کر فرہاد ہوش میں آیا، اس کے کچھ دیر پہلے کہے گئے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

''میں تو یہاں سے جانے کی سوچ چکا ہوں۔ اتنی سخت ٹریننگ، میرا سارا جسم درد سے تڑپ اٹھا ہے۔ تم بھی میری مانو کھسکو یہاں سے، آرام سے آزادی میں زندگی بسر کریں گے۔'' فرہاد کے ان الفاظ سے لالک جان کو دلی دکھ ہوا تھا۔ ان کو پاکستان آرمی جوائن کیے ابھی کچھ ماہ گزرے تھے۔

☆......☆

''میری خواہش ہے میرے سب اسٹوڈنٹ آرمی جوائن کریں۔ ملک کے محافظ بنیں کیا آپ سب میری یہ خواہش پوری کریں گے مگر سچے دل اور اپنی مرضی سے کسی پر میں اپنی خواہش زبردستی مسلط نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ روزانہ کسی موضوع پر تبصرہ کیا کرتی تھی۔ آج کا موضوع ''پاک آرمی'' پر تھا وہ جوش و جذبے سے ملک یا پاکستان کے بارے میں دیر تک بول سکتی تھی۔ چند ایک کے علاوہ سب نے مثبت جواب دیا تھا۔ اسے خوشی محسوس ہوئی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیابی پا رہی ہے۔ وہ بہت سے بچوں کو اچھا انسان اور محب وطن بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان کو پاکستان کا پاسبان اور محافظ بننے کی تلقین کرتی رہتی تھی جو وہ خود نہ بن پائی تھی اپنے شاگردوں کو بنانا چاہتی تھی۔ وہ اب پھر سے پرعزم دکھائی دیتی تھی۔

☆......☆

وہ ٹیسٹ میں ناکام ہوئی تو بے حد روئی، ہر وقت کمرے میں بند رہتی، اسے یقین نہ آتا، وہ زندگی سے مایوس ہو گئی تھی۔ اسے لگتا اب زندگی جینے کا مقصد ختم ہو گیا۔ کھانے پینے کا کوئی ہوش نہ تھا۔ اس کا زندگی میں صرف ایک خواب تھا وہ بچپن سے یہ ہی خواب دیکھا کرتی۔ وہ عام لڑکیوں سے مختلف تھی اسے بناؤ سنگھار سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اس کے کھلونوں میں گڑیا نہیں بلکہ



ٹینک، پستول اور آرمی کیپ، شوز یونیفارم وغیرہ اور تاریخی جنگوں کی کتابیں اس کے کمرے میں محفوظ تھیں اس کو جنون کی حد تک آرمی جوائن کرنے کا شوق تھا مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

وہ ٹیسٹ میں پاس نہ ہو پائی جسمانی کمزوری کی وجہ اس کا ''شوق'' شوق بن کر رہ گیا۔ یوں ہی دن مایوسی میں گزر رہے تھے۔ ماما، بابا سمجھا سمجھا کر تھک چکے تھے پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ ڈیڑھ ماہ ہو گیا تھا نہ کہیں آتی جاتی تھی۔

ایک دن وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی وہاں کا منظر اسے بہت کچھ سمجھا گیا۔ ایک لڑکی گاؤں کے کسی اسکول میں درخت کے نیچے بچوں کو پڑھا رہی تھی۔ وہ بچوں کو پاکستان کے حالات اور اس کی حفاظت کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ ایک غریب گاؤں کا منظر تھا۔ اس کے ذہن میں مختلف مثبت سوچیں آنے لگیں۔ وہ کچھ سوچ کر فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔

☆......☆

''ماما، بابا میں جاب کرنا چاہتی ہو اسکول میں۔'' ناشتے کی ٹیبل پر اس نے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔

''ہاں...... ہاں ضرور میری جان کیوں نہیں۔ ہم تو خود یہ ہی چاہتے ہیں تم فارغ نہ رہو گھر سے بھی باہر جایا کرو، تم نے تو خود کو کمرے میں بند کر رکھا ہے۔'' ماما نے خوشی کا اظہار کیا کہ وہ کچھ تو کرے فارغ رہنے سے اس کی حالت قابلِ رحم ہو گئی تھی۔

''اچھا فیصلہ ہے بیٹا! مگر آپ میرے ساتھ آفس کیوں نہیں جوائن کر لیتیں؟'' بابا نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''بابا! میں آرمی اسکول جوائن کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے گویا ہوئی۔ اس کی بات پر ماما بابا نے ایک دوسرے کو دیکھا وہ دونوں سمجھ گئے کہ وہ اب اس فیصلے سے ایک انچ پیچھے نہیں ہو گی۔

☆......☆

''مس کرن شجاع! کیا آپ جانتی ہیں آپ کو حسن کارکردگی کا تمغہ دیا جائے گا۔ آپ کی اعلیٰ کارکردگی پر۔'' مس روبینہ کے کہنے پر وہ الرٹ ہوئی۔

''اچھا...... رئیلی! آپ کو کیسے پتا چلا؟'' کرن شجاع نے خوشی اور حیرت کا اظہار کیا۔

''میں آفس میں کسی کام سے گئی تھی تب سر اور میڈم اس بارے میں ڈسکس کر رہے تھے۔'' روبینہ نے تفصیل بتائی۔

کرن شجاع کو لگا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی اس کی محنت رنگ لائی تھی۔ سارے اسٹاف اور پرنسپل نے اس کی کارکردگی اور جذبہ ہمت کی داد دی تھی۔ اسکول کے اکثر معاملات اس کے سپرد کر دیئے جاتے، جو وہ نہایت نظم و ضبط اور آسانی سے کر لیا کرتی تھی۔ اسکول کی ایک تقریب میں اسے حسن کارکردگی کا تمغہ دیا گیا، کرن شجاع کو اس اسکول میں سات سال ہو گئے تھے۔ اس کے کچھ شاگرد آرمی جوائن کر چکے تھے جن میں جذبہ، ہمت اور بہادری اس نے کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ وہ سب نہایت ایمان دار ثابت ہوئے۔ آج کا دن اس کے لیے بہت خاص تھا۔ اس نے محنت اور لگن سے کامیابی حاصل کر لی تھی۔ وہ بے حد خوش تھی۔

''کیا ہوا جو میں بارڈر پر ملک کی محافظ نہ بن سکی مگر یہاں اسکول میں رہ کر بہت سے بچوں کو وطنِ عزیز کا محافظ بنانے کی کوشش تو کر سکتی ہوں۔'' آج پہلی بار وہ اپنے خواب ٹوٹنے پر شکوہ کناں نہیں بلکہ شکر ادا کر رہی تھی کہ اگر وہ یہاں نہ ہوتی آج تو بہت سے بچے جو اس کی وجہ سے آرمی

میں گئے محروم رہ جاتے۔ اس نے سمجھوتا کر لیا تھا۔

"اللہ پاک جو کرتا ہے درست کرتا ہے ہم ہی سمجھ نہیں پاتے۔" وہ آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

☆......☆

"کرن بیٹا! آپ کی میڈم محمودہ آئی ہیں۔" ماما نے اسے کمرے میں آ کر اطلاع دی وہ حیران ہوئی کیونکہ آج پہلی بار وہ ان کے گھر آئی تھیں۔

"اچھا! خیریت تو ہے ٹھیک ہے ماما میں ابھی آتی ہوں۔" کرن بیڈ پر بکھری کتابیں سمیٹنے لگی۔ اس کے روم میں تاریخی کتابوں کا انبار تھا۔ ہر چیز سلیقے سے پڑی تھی۔ پاؤں میں سلیپر پہنتی وہ لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔

"میں خاص مقصد کے لیے آئی ہوں۔ میری بہن کا بیٹا آرمی میں ہے میں اس کا رشتہ کرن کے لیے لے کر آئی ہوں۔ دراصل کرن بہت پیاری سمجھ دار اور بہادر لڑکی ہے۔ لالک جان بے حد ایمان دار اور بہادر سپاہی ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے مناسب ہیں۔ بلکہ بہترین ہیں۔ آپ لوگ سوچنے کا ٹائم ضرور لیں مگر مجھے یقین ہے آپ کی طرف سے مثبت جواب آئے گا۔" میڈم محمودہ ماما سے محو گفتگو تھیں ان کے چہرے پر امید بھری مسکراہٹ تھی۔

☆......☆

کرن لالک وارڈ روب کھولے اس کا یونیفارم نکال رہی تھی۔ جب وہ تولیے سے بال صاف کرتا واش روم سے برآمد ہوا۔ وہ پلٹی تو لالک جان اس کے عین سامنے کھڑا تھا۔ کرن ٹکراتے بچی وہ مسکرا دیا۔

"آپ کا یونیفارم۔" کرن نے اپنا ہاتھ آگے کیا تو اس نے یونیفارم پکڑ کر اس کو سائیڈ پر رکھا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

"سنو! میں بہت خوش نصیب ہوں کہ تم جیسی باشعور، خدمت گزار، عزت کرنے والی بہادر اور ہر لمحہ مجھے سپورٹ کرنے والی شریک حیات میرا مقدر بنی۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے اعتراف کر رہا تھا۔ کرن محبت سے اس کا چہرہ تک رہی تھی۔

"خوش نصیب تو میں بھی بہت ہوں کہ مجھے آپ ملے ایک عظیم سوچ رکھنے والے سچے اور دوسروں کے لیے جینے والے۔" نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر پاس رکھی آرمی کیپ اٹھا کر جو ستاروں سے چمک رہی تھی اس کے سر پر پہنا دی وہ مسکرا دیا۔ لالک جان نے اپنے سر سے آرمی کیپ اتار کر کرن لالک کے سر پر رکھی تو وہ شدتِ جذبات سے رو پڑی، کبھی یہ کیپ پہننے کا خواب تھا اس کا جو آج پورا ہو گیا اسے اپنے شریک حیات پر فخر ہوا۔

"ارے......رو کیوں رہی ہو پگلی، جب میں تمہارا ہوں تو یہ کیپ بھی تمہاری ہوئی ناں۔" لالک جان نے اس کے ہاتھ نرمی سے تھام لیے۔ وہ اس کا خواب جان چکا تھا۔ اس نے مسکرا کر لالک جان کو دیکھا۔

"ایک در بند ہوا تو دوسرا کھل گیا میں نہیں تو آپ سہی۔" وہ مشکور نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اور میرے بعد ہمارے بچے۔" وہ شرارت سے گویا ہوا تو کرن بلش ہوئی۔ لالک جان ہنس دیا۔ وہ اپنے رب کا شکر ادا کرنے لگی۔

☆......☆

نائلہ طارق

مکمل ناول

اک خواب کا نیلا پھول کھلے

حد نگاہ تک برف کی سفید چادر نے ناہموار زمین کو اپنے نیچے چھپا رکھا تھا، رات کی گہری خاموشی میں





اونچے اونچے گھنے درخت ساکت کھڑے تھے، ان کی
ٹہنیاں اور پتے روئی کے گالوں جیسی برف سے ڈھکے
ہوئے تھے، شاید کچھ گھنٹوں پہلے برف باری ہوئی تھی
مگر اس سے آسمان بالکل صاف تھا، آب وتاب سے
چمکتا پورا چاند ہر منظر کو اس حد تک واضح کر رہا تھا کہ
تاریکی کا نام ونشان تک نہ تھا، ہوا بند تھی، خنکی حد درجہ
تھی، خوابناک سناٹا ہر سمت پھیلا ہوا تھا۔

گہرے سیاہی مائل نیلے آسمان پر ٹمٹماتے
ستاروں کے جھرمٹ ماحول کے سحر کو مزید پُر اثر بنا
رہے تھے، یکایک اس پرسکون ماحول کو ایک بے ہنگم
سی آواز نے توڑنا شروع کر دیا تھا، آواز آہستہ آہستہ
بڑھتی شور مچا رہی تھی، تب ہی آسمان پر ایک لہراتا، بل
کھاتا فوکر نمودار ہوا تھا، وہ جس رفتار سے نیچے آ رہا تھا
اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ یقیناً اس کے انجن میں
خرابی ہوئی ہے اور یہ کہ وہ پائلٹ کے کنٹرول سے باہر
نکل چکا ہے اور پھر اگلے چند لمحوں میں وہی ہوا تھا، جو
صاف ظاہر تھا، ماحول کا سکون درہم برہم کرتا فوکر
ایک دھماکے سے برف کی دبیز تہہ سے ٹکراتا، درخت
کے ساتھ جا لگا تھا، چند لمحوں تک انجن کا بھیانک شور
جاری رہا تھا اور پھر دوبارہ ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔
مگر اس بار یہ سناٹا خوابناک نہیں تھا، سحر ٹوٹ چکا تھا،
چھایا سکون بہت عجیب تھا۔

☆..........☆..........☆

چھوٹے سے کیمپ کے اندر اتنی جگہ تھی کہ تین
سلیپنگ بیگز اس میں آسانی سے سما گئے تھے، اپنے
سلیپنگ بیگ میں لیٹی وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی،
لیمپ کی مدھم روشنی میں اس نے ایک نظر دونوں
بچیوں پر ڈالی تھی، جو سفر اور تفریح کی تھکن کے بعد
اب گرم بستر میں پرسکون نیند سوئی ہوئی تھیں، ان
دونوں کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے
سوچا تھا کہ چند دنوں میں ہی ان معصوم بچیوں سے کتنا
گہرا لگاؤ ہو گیا تھا، اور یہ بچیاں بھی اس سے کس قدر
مانوس ہو گئی تھیں کہ اس کے بغیر رہتی ہی نہ تھیں،
حالانکہ ان دونوں سے اس کا رشتہ بس اتنا ہی تھا، کہ وہ
ان کی گورنس تھی، ان کے ساتھ ساتھ ان کے گھر کی
دیکھ بھال کرتی تھی۔ گہری سانس لے کر وہ اٹھ بیٹھی
تھی، عجیب سی وحشت اور بے چینی نے اسے گھیر لیا
تھا، قریب ہی ایک دوسرا کیمپ بھی تھا، جہاں ان بچیوں
کے ماں باپ موجود تھے، یقیناً وہ دونوں بھی سو چکے
تھے اسی لئے تو ان کے کیمپ سے کوئی آواز نہیں ابھر
رہی تھی۔ تقریباً ایک ماہ پہلے اسے بہت دقتوں اور
مارے مارے پھرنے کے بعد گورنس کی یہ جاب ملی
تھی، تنخواہ معقول تھی، ذمہ داریاں بہت زیادہ تھیں،
بچیوں کی ماں اس کی ذرا سی غلطی بھی برداشت نہیں
کرتی تھی اور بچیوں کے باپ سے اس کی لاتعلقی اور
سرد مہری برداشت نہیں ہوتی تھی، یہ سب اس کے
لیے برداشت کرنا ایک مجبوری تھی کیونکہ پہلی بار اسے
ایسی نوکری ملی تھی جہاں رہنے کے لئے اسے گھر کی
چھت بھی میسر تھی، دو پیاری پیاری بچیوں کی محبت
اسے ملی تھی، بچیوں کے ماں باپ سارا دن اپنی جاب کی
وجہ سے گھر سے باہر رہتے تھے، اس دوران وہ سیاہ
سفید کی مالک ہوتی، بچیوں کی ضرورتوں کا خیال رکھنا،
ان کو وقت پر کھانا کھلانا، اسکول بھیجنا، ان کو پڑھانا،
ان کے ساتھ کھیلنا، ان کی شرارتوں پر ہنسنا یہ سب اسے
ہر غم بھلا دیتا تھا، تنہائی سے اسے نجات مل گئی تھی،
دونوں بچیاں جڑواں تھیں، ان کی ماں کے لیے انہیں
سنبھالنا اور جاب بھی کرنا مشکل تھا، لہٰذا گھر اور بچیوں
کے لیے وہ ہمیشہ گورنس کی ہی ضرورت مند رہی تھی،
بچیوں کی ماں سے اس نے نہیں پوچھا تھا کہ اس سے
پہلے جو گورنس تھی، اس نے نوکری کیوں چھوڑی؟
اسے یہ سوال پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، ایک ماہ
میں وہ بچیوں کے باپ سے اچھی طرح واقف ہو گئی
تھی، اس سے پہلے جتنی گورنس بھی نوکری چھوڑ گئی
ہوں گی یا تو بچیوں کے باپ کی وجہ سے یا پھر بچیوں کی

ماں نے ان کو نکالا ہوگا، آخر کار وہ بھی تو اپنے شوہر کی عادات واطوار سے واقف ہوگی، اسی لئے تو وہ عورت اب اس پر بھی کڑی نگاہ رکھتی تھی، شوہر کے سامنے وہ کچھ زیادہ ہی اس کے ساتھ سختی سے پیش آتی تھی، حالانکہ اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ وہ بچیوں کے باپ کی موجودگی میں اپنے کمرے تک ہی محدود رہے، دن بچیوں کے ساتھ بہت خوش باش گزرتا، مگر رات ہوتے ہی کئی سانپ اسے اپنے اردگرد سرسراتے محسوس ہونے لگتے تھے، وہ کب تک ان کے زہر سے خود کو بچا سکتی تھی، اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ کب تک وہ ان حالات کا مقابلہ کر سکتی ہے، وہ بہت کمزور تھی، زندگی میں سختیاں برداشت کرتے کرتے وہ واقعی اب کمزور ہو چکی تھی، گھٹنوں سے چہرہ ٹکائے وہ یکدم چونکی تھی، کیمپ کی دیوار پر اسے ایک سایہ نمودار ہوتا دکھائی دیا تھا، خوف سے اس کے دل کی دھڑکن رکنے لگی تھی، شکر تھا کہ اس نے کیمپ کے داخلی حصے کی زپ چڑھا کر اسے پہلے ہی بند کر دیا تھا، ورنہ اس سانپ کو اندر داخل ہونے سے وہ نہیں روک سکتی تھی، اس کے کانوں سے مانوس آواز ٹکرائی تھی، وہ اپنی بچیوں کو پکار رہا تھا۔

''بچیاں سو چکی ہیں''۔ گھبراہٹ میں وہ بلاسوچے سمجھے بول گئی تھی۔ مگر اگلے ہی پل اپنی بے وقوفی پر اس نے سر پکڑ لیا تھا، اگر وہ بالکل خاموش رہتی تو یہ خطرہ ٹل سکتا تھا، مگر اب وہ وحشت زدہ نظروں سے اس سائے کو تک رہی تھی جو رینگتا ہوا اس کے بالکل دائیں جانب آ گیا تھا، دھڑکتے دل کو سنبھالتی وہ خود میں سمٹنے لگی تھی۔ درمیان میں صرف ایک کمزور سی دیوار تھی جسے چاقو سے کاٹ کر بھی وہ اس تک پہنچ سکتا تھا۔

''لیکن ایسا وہ نہیں کر سکے گا''۔ بچیوں کی موجودگی نے ایک تحفظ کا احساس اسے بخشا تھا۔

''یہ اچھی بات ہے کہ بچیاں سو چکی ہیں، میں تم سے ہی بات کرنا چاہتا تھا''۔ سرسراتی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

''سنو! بہت ترسا چکی ہو تم مجھے، میرا صبر ختم ہو چکا ہے، میں تمہارے ساتھ کچھ غلط نہیں کرنا چاہتا، میری بات مان لو، ساری آسائشیں تمہارے قدموں میں ڈال دوں گا، اچھا گھر دوں گا، روپیہ، زیور جو مانگو گی دوں گا''۔

''اور جب دل بھر جائے گا تو سڑک پر پھینک دو گے''۔ وہ غرائی تھی۔

''یہی قیمت ہے تمہاری نظر میں ایک عورت کی؟ مجھ سے پہلے ایسی کتنی سودے بازیاں کر چکے ہو؟''

''بکواس مت کرو''۔ کھسیائی آواز ابھری تھی۔

''میں اب اور تمہاری منت سماجت نہیں کروں گا، تم جیسی بے سہارا اور ٹکے ٹکے کی نوکریوں کی محتاج عورتوں کو ایسی سودے بازیاں کرنی پڑتی ہیں، کبھی اپنی خوشی سے اور کبھی زور زبردستی سے۔ تمہیں بھی پیار کی زبان سمجھ نہیں آتی، اپنی ضد نہیں چھوڑو گی تو ذلیل و خوار ہوگی، بہت گھمنڈ ہے تمہیں اپنی پاکبازی پر مگر میں بھی تمہیں مجبور کر دوں گا گھٹنے ٹیکنے پر''۔ ابھرتی زہریلی آواز میں کچھ ایسی خنکی تھی کہ وہ ٹھٹھر کر رہ گئی تھی۔

''میرا مزید وقت برباد نہ کرو، مجھے بتاؤ کیا فیصلہ ہے تمہارا؟ کیا کرنا چاہتی ہو؟ یاد رکھو مجھ تک آنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے تمہارے پاس''۔

''ایک راستہ اور ہے اور وہ یہ کہ میں اسی وقت شور مچا کر تمہاری بیوی اور بچیوں کو تمہارا بھیانک چہرہ دکھا دوں''۔ سائے کو گھورتی وہ لرزتے لہجے میں بولی تھی۔

''شوق سے مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، میری بیوی صرف اس بات کا یقین کرے گی، جو میں اسے بتاؤں گا''۔ استہزائیہ لہجے پر وہ بمشکل ضبط کر سکی تھی۔

''پھر بھی تم ایسی بیوی کو دھوکہ دینا چاہتے ہو؟

تمہیں اپنی معصوم بچیوں پر بھی ترس نہیں آتا؟ کس طرح تم ان کو اپنا مکروہ چہرہ دکھاتے ہو؟" وہ غصیلے لہجے میں بولی تھی۔

"میں ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کر رہا، اور نہ ہی تم پر کوئی ظلم مگر تم مجھے مجبور کر رہی ہو، اب تمہارے پاس صرف کل کا دن ہے، اس سے زیادہ وقت میں تمہیں نہیں دوں گا، ہر بات کی ذمہ دار صرف تم ہو گی اگر فیصلہ میرے حق میں نہ ہوا، غور سے سن لو، بس کل کا دن"۔ کاٹ دار لہجے میں اسے دھمکاتا وہ سایہ چند لمحوں بعد غائب ہو گیا تھا۔ ساکت بیٹھی وہ قدموں کی چاپ کو سنتی رہی تھی، جو دوسرے کیمپ تک جا کر بند ہو گئی تھی۔ ایک سرد سانس کھینچتے ہوئے اسے اپنے کندھوں پر بھاری بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں زندگی واقعی بہت کٹھن ہوتی ہے یا پھر صرف اس کے لیے ہی مشکل سے مشکل ہوتی جا رہی تھی۔ تھکے تھکے انداز میں اس نے سر گھٹنوں پر رکھ دیا تھا۔

☆.............☆.............☆

گہرے سکوت میں درخت سے لگے اس فوکر میں سے مستقل دھواں اٹھ رہا تھا، تب ہی کاک پٹ کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تھا اور اس کے ساتھ ہی کاک پٹ سے گرنے والے انداز میں اترتا وجود دبیز برف پر لڑھکتا چلا گیا تھا، زخم کڑکڑائے تھے تو اس کے حلق سے بھاری کراہیں بلند ہوئی تھیں۔ چند لمحوں تک اوندھے منہ پڑے رہنے کے بعد اس نے سر اٹھا کر اردگرد نظر دوڑائی تھی، اگلے ہی پل اپنی ناکامی پر اسے شدید غصہ آنے لگا تھا، اس سے تو بہتر تھا کہ وہ ریوالور کی ایک گولی سے اپنا بھیجہ اڑا دیتا، چند سیکنڈ بھی نہیں لگتے اس دنیا سے جانے میں، اس فوکر پر بھروسہ کرتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ یہ اسے زیادہ آسانی سے زندگی سے نجات دلا دے گا، مگر اس نے تو ایک نئی مصیبت میں اسے لا پھینکا تھا، خود کو گھسیٹ کر قریبی درخت کی طرف لے جاتے ہوئے اسے

اندازہ تھا کہ اس کے ہاتھ اور پیر میں فریکچر ز ہو گئے ہیں، سر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، کنپٹی کے گہرے زخم سے رستا خون اس کے گریبان تک آ پہنچا تھا، اب ایسی ٹوٹی پھوٹی حالت میں نہ وہ اس جگہ سے نکل سکتا تھا نہ ہی مرنے کا کوئی اور راستہ اسے فوری طور پر مل سکتا تھا، کسی نہ کسی طرح اسے اپنے زخمی وجود کو درخت کے چوڑے تنے سے ٹکاتے ہوئے اسے اپنے زخموں کی فکر نہیں تھی، فکر انگیز چیز یہ تھی کہ بغیر کسی مدد کے وہ یہاں سے کیسے نکل سکے گا، بے شک وہ اپنی بے مقصد زندگی کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا، مگر تڑپ تڑپ کر تو ہرگز نہیں اور نہ ہی وہ کسی درندے کا شکار بننا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جنگل زیادہ دور نہیں ہو گا جہاں سفید بھیڑیے بکثرت ہوں گے، ان کے خونخوار جبڑوں کا خیال آتے ہی اسے جھرجھری آ گئی تھی، اگر وہ اپنے پیروں پر اٹھنے کے قابل ہوتا تو وہ یقیناً دھواں چھوڑتے فوکر کو جا کر دو چار لاتیں ضرور رسید کرتا، مگر اس وقت تو وہ چند بھاری بھرکم جملے اگلتا اپنا اشتعال نکال سکتا تھا اور وہ ایسا کر رہا تھا۔

درخت کے تنے سے سر ٹکاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر آسمان سے زمین تک کا جائزہ لیا تھا، تیز چاندنی میں ہر چیز نکھری اور واضح تھی، اس کے ذہن میں خیال ابھرا تھا کہ اگر وہ بہت اچھے حالات میں اس جگہ ہوتا تو یقیناً اس پرفسوں، جادوئی جگمگاتی رات میں کسی کے ساتھ ہونے کی، کسی کے پاس ہونے کی تمنا ضرور کرتا، مگر ایسا تب ہوتا جب ایسا ممکن ہوتا، خواہشیں، تمنائیں، خواب نہ کبھی اس کے پورے ہوئے اور نہ ہی ان کے پورے ہونے کی امید وہ رکھتا تھا۔ وہ تو زندہ رہنے کی، کچھ عرصہ مزید زندگی سے جڑے رہنے کی امید بھی توڑ چکا تھا، آخر اس زندگی سے ملا ہی کیا تھا، غم، تنہائی، بے وفائی، نارسائی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ چند دن اور اس دنیا میں رہا تو مکمل طور پر اپنا ذہنی توازن کھو دے گا۔ دن رات فرسٹریشن

اور ڈپریشن کے زیر اثر رہنے کے بعد اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ وہ تنگ آچکا تھا خود کو پرسکون رکھنے کے لیے بے اثر لال، پیلی، نیلی گولیاں نگلتے نگلتے، کب تک؟ آخر کب تک؟ پوری منصوبہ بندی کے بعد انتہائی فیصلہ کرتے ہوئے اس نے خود کو سزائے موت سنائی تھی، اسے یاد تھا فوکر کا توازن ہوا میں بگڑ رہا تھا اور وہ اپنے بھاری جوتے سے اس کا کنٹرول سسٹم توڑ پھوڑ رہا تھا اور جب فوکر برف سے ڈھکی ناہموار سطح سے ٹکرانے پوری رفتار سے جا رہا تھا، تو اس نے پہلی اور آخری پرسکون سانس لے کر آنکھیں بند کر لی تھیں، مگر جب آنکھ کھلی تو خود کو ایک بار پھر ناکام ترین قرار دینے پر وہ کوئی شرمندگی محسوس نہیں کر رہا تھا۔

وجود میں اٹھتی ٹیسوں کو ضبط کرتے ہوئے اس کی سانسیں پھولنے لگی تھیں، بوسیدہ لباس پر بس اس نے ایک پرانی جیکٹ چڑھا رکھی تھی، اسے اب سردی کی شدت محسوس ہو رہی تھی، اچانک کچھ یاد آنے پر اس نے اپنے اس ہاتھ کو حرکت دی تھی جس میں تکلیف قدرے کم تھی، کچھ تلاش کے بعد اسے جیکٹ کی اندرونی جیبوں سے سگریٹ کا ایک پیکٹ اور رلائٹر مل گیا تھا، کچھ ڈھارس سی ملی تھی، اس وقت وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا، اپنے آپ کو ہر چیز سے بے تعلق رکھنا چاہتا تھا، مگر سگریٹ کے کش لیتے ہوئے اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔

☆............☆............☆

کان لگا کر وہ چند لمحوں تک باہر کسی کی غیر موجودگی کا یقین کرتی رہی تھی اور پھر بغیر کسی آہٹ کے کیمپ کی زپ کو تھوڑا نیچے کر کے باہر نگاہیں دوڑائی تھیں اور جیسے سب کچھ بھول گئی تھی، دور تک پھیلے خاموش منظر نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا، آسمان سے برستی دودھیا چاندنی برف پوش زمین میں مدغم ہو رہی تھی، اونچے درخت خاموش کھڑے کسی آہٹ کے منتظر تھے، اسے یاد آیا تھا، آج پورے چاند کی رات ہے، نظر آ رہا تھا کہ رات اپنے پورے جوبن پر تھی، ایک پل کو رک کر اس نے کچھ سوچا تھا اور پھر اپنا گرم کوٹ بازو میں دبائی چپکے سے کیمپ سے باہر نکل آئی تھی، سر اٹھائے آسمان کو تکتی وہ مبہوت زدہ تھی، تاروں سے جگمگاتا آسمان اس پر جھکا آ رہا تھا، رات کی سحر انگیز خاموشی میں عجیب سی ترنگ بھری تھی، موسیقی کی دلکش لہریں اسے اپنے اردگرد پھیلتی محسوس ہو رہی تھیں، آسمان پر نظریں دوڑاتے ہوئے ہی اچانک وہ بری طرح چونک گئی تھی۔ دور ایک درخت کے اوپر سے اسے گاڑھا دھواں اٹھتا دکھائی دیا تھا، چند لمحوں تک وہاں جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے اسے یقین کرنا پڑا تھا کہ ضرور وہاں کوئی حادثہ ہوا ہے، حادثہ ہوا تھا تو یقیناً کوئی حادثے کا شکار بھی ہوا ہوگا، دھوئیں کے بگولے دیکھتے ہوئے اسے وہی بے چینی محسوس ہوئی تھی جو اس وقت محسوس ہوئی تھی جب ایمرجنسی وارڈ میں کوئی سیریس کیس آتا تھا، ایک ذمہ دار نرس کی طرح وہ ڈاکٹر کے پیچھے ہی ان کی مدد کے لیے تیار ہوتی تھی، اس کی ماں بھی ایک نرس تھی، اس پروفیشن سے لگاؤ اور محبت اسے اپنی ماں کی وجہ سے بھی تھی، انہوں نے اپنی ساری زندگی بیماروں کی دادرسی اور ان کی تیمارداری کے لیے وقف کر دی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ بہت آسانی سے اپنی ماں کے اس پروفیشن کو اپنا سکتی ہے کیونکہ اس کے پاس بھی ایک ایسا دل تھا جو انسانوں کی ہمدردی اور رحم سے بھرا ہوا تھا، مگر اس پروفیشن میں قدم جمانے کے لیے صرف رحم دل اور وفادار ہونا ہی کافی نہیں تھا، وہ اپنی ماں کی طرح مضبوطی سے قدم جمانے میں ناکام رہی تھی، وہ ایسے قابل عزت پیشے سے نفرت نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اسے جاری بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ زندگی کی دوڑ میں شامل رہنے کے لیے اس نے ان گنت نوکریاں حاصل کیں اور پھر ان کو چھوڑ دیا، جس کام میں عزت پر آنچ آنے لگے اسے چھوڑ دینا ہی بہتر تھا اور اس نے ایسا ہی کیا۔

شاید اس کی قسمت میں ہی ایسے حالات سے دوچار ہونا لکھا تھا، ورنہ اور بھی تو عورتیں ہیں اس دنیا میں جو بہت بہتر طریقے سے تنہا اسٹرگل کرتی ہیں اور کامیاب زندگی حاصل کرتی ہیں۔ سوچوں کو جھٹکتے ہوئے اس نے ایک ارادہ کرلیا تھا اور پھر دیر نہیں کی تھی۔ کیمپ میں جا کر اس نے اپنے بیگ کو اٹھایا تھا، سوئی ہوئی بچیوں کی طرف سے اطمینان کرتی وہ دبے قدموں کیمپ سے نکل آئی تھی، دوسرے کیمپ پر ایک نظر ڈال کر اس نے اپنے کیمپ کے داخلی حصے کو باہر سے سیفٹی ڈوریوں سے اچھی طرح باندھ دیا تھا، باہر جلتی آگ میں اس نے چند مزید سوکھی لکڑیاں ڈال دی تھیں، تاکہ آگ بجھنے نہ پائے اور جنگلی جانور، کیڑے وغیرہ کیمپوں کے قریب نہ آنے پائیں۔ چلتے ہوئے اس نے حفاظت کے لیے ایک تیز دھار چاقو بھی ساتھ رکھ لیا تھا، جنگل سے جانوروں کی کریہہ آوازیں اسے صاف سنائی دے رہی تھیں، کوئی بھروسہ نہیں تھا کہ کسی درندے سے اس کا سامنا بھی ہوسکتا تھا، تیز نیلگوں روشنی میں اس کے قدموں کے نشان برف کی دبیز تہہ پر بنتے جارہے تھے۔

☆..........☆..........☆

سگریٹ کا بچا ٹکڑا ایک طرف پھینک کر اس نے اپنے پیر کا رخ بدلنا چاہا تھا، اور اس کوشش میں اس کی کراہیں نکل گئی تھیں، اس نے پہلے سوچا تھا کہ فوکر کے قریب جا کر اس میں سے کوئی ایسی چیز نکال لائے جو ہتھیار کا کام کرسکتا ہو، کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بھیڑیا اس کے بہتے خون کی بو سونگھتا یہاں تک آجائے اور منٹوں میں اسے چیر پھاڑ کر رکھ دے، اب اس نے کوئی ایسا گناہ بھی نہیں کیا تھا کہ ایسی بھیانک موت مرتا، فوکر تک جانے کا ارادہ اس نے ترک کردیا تھا، فی الحال کیونکہ اپنے زخمی وجود کو حرکت دینا اس کے لیے بہت تکلیف کا باعث بن جاتا لہٰذا وہ اپنے اردگرد ہی کوئی ایسا پتھر یا لکڑی تلاش کرنے لگا تھا جو قریب ترین ہو اور اس کے بچاؤ کے کام آسکے۔ ابھی وہ اپنی متلاشی نظریں ادھر ادھر دوڑا ہی رہا تھا کہ کچھ آہٹ سی اسے محسوس ہوئی تھی، اس کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا تھا کیونکہ اس وقت وہ کسی بھیڑیئے سے مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں تھا۔ خطرے کی سمت کو بھانپنے کے لیے اس نے تیزی سے اپنے اردگرد کا جائزہ لینا شروع کردیا تھا اور پھر کچھ سیکنڈ بعد ہی اپنے دائیں جانب اس کی آنکھیں جم گئی تھیں، اسے لگا تھا کہ اس کے دماغ میں بھی شائد کوئی اندرونی چوٹ آئی ہے، کیونکہ جو اسے دکھائی دے رہا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ سرخ گرم کوٹ میں ملبوس سر پر اونی اسکارف لپیٹے تیزی سے اس جانب آتی وہ اس کے وہم کو یقین میں بدلنے لگی تھی، دوسری جانب کچھ فاصلے پر رک کر اس نے درخت سے پشت لگا کر بیٹھے زخمی شخص کو دیکھا تھا جو مکمل طور پر اس کی طرف ہی متوجہ تھا۔ فوکر کے اٹھتے دھوئیں کو اور کبھی اس شخص کو دیکھتی وہ کچھ دیر تک صورتحال کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہی تھی اور پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک فون نکال لیا تھا، آسمان صاف تھا اور اسے امید تھی کہ فون کے سگنل مل جائیں گے، وہ فوری طور پر ریسکیو کو کال کرکے اس حادثے کے بارے میں بتانا چاہتی تھی اور پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ فون کوٹ کی جیب میں واپس رکھتی وہ تیزی سے اس شخص کی جانب آئی تھی جو دنگ نظروں سے اسے دیکھتا اب تک اس کی موجودگی کا یقین کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔

''فکر مت کرو سب ٹھیک ہوجائے گا، کیا تم اکیلے ہو یا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟'' تیزی سے بیگ سے پانی کی بوتل نکالتی وہ ہمدردی بھری نگاہوں سے اسے دیکھ بھی رہی تھی۔

دوسری جانب پانی کی بوتل دیکھتے ہوئے اسے یاد آیا تھا کہ پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے ہیں، وہ بھی سمجھ گئی تھی سو فوراً کیپ ہٹا کر بوتل

سے تھا دی تھی۔ وہ غٹا غٹ پانی حلق میں انڈیل رہا تھا، اس دوران کاٹن کا بنڈل وہ اٹھائی اس کے قریب آ بیٹھی تھی۔ اس کی کنپٹی پر کافی گہرا زخم تھا، بہتے خون کو روکنے کی ضرورت تھی، ابھی اس نے زخم کو صاف کرنا ہی چاہا تھا کہ اچانک وہ جھٹکے سے اس کا ہاتھ جھٹک گیا کہ وہ پیچھے کی طرف گرتے گرتے بمشکل ہی بچی تھی۔

''یہ کیا حرکت ہے، میں تمہاری مدد کر رہی ہوں، زیادہ خون بہنے سے تمہاری زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے''۔ اس سلوک پر وہ اپنے غصے کو ضبط نہیں کر سکی تھی۔

''کون احمق زندہ رہنا چاہتا ہے؟'' وہ جس طرح سے آنکھیں نکال کر غرایا تھا وہ حق دق رہ گئی تھی۔

''اپنے آپ کو ان حالات سے میں نے خود دوچار کیا ہے، کہیں کوئی کمی رہ گئی تھی ورنہ تمہیں یہاں میری لاش ملتی، کتنا اچھا ہوتا کہ میں یہاں برف میں دفن ہو جاتا''۔ آخری جملہ اس نے شدید مایوسی اور حسرت سے کہا تھا۔

''اوہ... تو تم یہاں خودکشی کرنے کے ارادے سے آئے تھے؟'' سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی وہ تائید چاہتی تھی۔

''تم نے جان بوجھ کر اپنے ساتھ یہ حادثہ کیا ہے؟''

''کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے؟'' وہ جھلائے انداز میں بولا تھا، دوسری جانب وہ چند لمحوں تک اس کے خون آلودہ چہرے کو دیکھتی رہی تھی۔

''کیوں مرنا چاہتے ہو؟''۔

''مر مر کر جینے سے بہتر ہے ایک ہی بار مر جانا اور کچھ؟'' اس کے تلخ لہجے پر وہ چپ رہی تھی جبکہ وہ سر جھٹکتا اپنے ٹوٹے پھوٹے فوکر کو دیکھنے لگا تھا۔

''ٹھیک ہے، یہ تمہاری زندگی ہے جو چاہو کرو مگر مجھے میرا کام کرنے دو''۔ قطعی لہجے میں بولتے ہوئے وہ پھر اس کا زخم صاف کرنے قریب ہوئی تھی۔

''دور رہو''۔ پھر بھڑکتے ہوئے وہ اسے دور دھکیلنا چاہتا تھا مگر وہ بروقت اس کا ہاتھ روک گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک طمانچہ اس کے چہرے پر رسید کر چکی تھی۔

''اتنی تہذیب نہیں تمہارے پاس کہ کسی عورت کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے''۔ وہ اس پر برسی تھی جو سناٹے میں گھرا منہ کھولے اسے تک رہا تھا۔ زناٹے دار تھپڑ نے جانے اس کی حسیات کو سن کر دیا تھا یا بیدار مگر پھر وہ اسے روک نہیں سکا تھا، جو کافی احتیاط اور تیزی سے اس کا زخم صاف کر رہی تھی، حالانکہ اندر ہی اندر وہ کچھ ڈر گئی تھی اور اس کے ردعمل کے لئے تیار بھی تھی، مگر ایسا کچھ ہوا نہیں تھا، وہ اس دوران بھی بالکل شانت رہا تھا جب وہ اس کے خون کو صاف کر رہی تھی۔

''میں نے بینڈیج کر دی ہے فی الحال مگر تمہارے زخم کو اسٹیچز کی ضرورت ہے''۔ پیچھے ہٹتی وہ بولی تھی اور پھر گھٹنوں کے بل بیٹھتی اس کے کچھ بولنے کی منتظر رہی تھی، جو سر جھکائے مکمل خاموش تھا۔

''اور کہاں چوٹ لگی ہے؟ اپنے پیروں پر اٹھ سکتے ہو تم؟''

''نہیں، شاید میرے ہاتھ اور پیر دونوں میں فریکچرز ہو گئے ہیں''۔ اپنے ایک پیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ ہلکی آواز میں بولا تھا۔

''پھر اپنے پیر کو حرکت نہ دو، ایک گھنٹے کے اندر اندر ریسکیو والے یہاں پہنچ جائیں گے''۔ اس کی تسلی پر وہ بری طرح چونکا تھا۔

''تم نے ریسکیو کو یہاں بلا لیا، میری اجازت کے بغیر ان کو اطلاع کیوں دی تم نے؟'' وہ دھاڑا تھا تھا۔

''تم اتنا غصہ کیوں کرتے ہو، میری آنکھوں کے سامنے ایک حادثہ ہوا ہے، میرا فرض تھا کہ میں تمہاری مدد کے لیے یہاں ریسکیو کو بلاتی، مجھے پہلے سے نہیں

پتہ تھا کہ تم یہاں خود کو مارنے آئے ہو"۔ اس کے معذرت خواہانہ لہجے پر وہ بس خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میرا نام ساشا ہے، میں یہاں ایک فیملی کے ساتھ کیمپنگ ٹرپ پر آئی ہوں، اس فیملی میں دو چھوٹی بچیاں ہیں، میں ان کی گورنس ہوں"۔ اپنے بارے میں بتاتے ہوئے وہ اس کے متوجہ ہونے کی منتظر تھی جو دوسری طرف نظر پھیرے ہوئے تھا۔

"میں جانتی ہوں تم میری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے، مگر میرا قصور اتنا بڑا بھی نہیں ہے، تم پہلے ہی اپنی کوشش میں ناکام ہو چکے تھے"۔ اس کے کہنے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"ناکامیوں کے سوا مجھے اس زندگی سے ملا بھی کیا ہے، موت حاصل کرنے نکلا تو اس میں بھی ناکامی، نفرت ہے مجھے اپنی ناکامیوں سے اور اس ناکام زندگی سے"۔ وہ انتہائی تلخ لہجے میں بولا تھا۔

"ناکامی تو میں نے بھی بہت سمیٹی ہے اور سمیٹ رہی ہوں، مگر میں اپنی زندگی سے کبھی نفرت نہیں کر سکتی اور نہ ہی میں اتنی بزدل ہوں کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤں"۔

"مگر میں بزدل ہوں، میری ناکامیوں نے مجھے بزدل بنا دیا ہے، لیکن میں اگلی بار مات نہیں کھاؤں گا دوبارہ خود کو مارنے کی کوشش کروں گا اور تب تک کوشش کرتا رہوں گا، جب تک کامیاب نہ ہو جاؤں"۔

"کتنا اچھا ہو اگر یہ کوشش تم اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے کرو"۔ وہ بولی تھی۔

"اور تمہیں یہ لگتا ہے کہ میں نے یہ کوشش نہیں کی ہو گی؟" وہ ناگواری سے بولا تھا۔ "میری زندگی میں اب ایسا کچھ نہیں رہا جس کے لیے میں زندگی کی تمنا کروں"۔

"ایسا کیا تھا جو اب باقی نہیں رہا اور اب تمہیں اس کے بغیر زندہ رہنا بھی پسند نہیں؟" وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی تھی، جواباً تھکے تھکے انداز میں وہ آنکھیں بند کرتا سر جھکا گیا تھا۔

"پتہ ہے آج پہلی بار تمہیں دیکھتے ہوئے میرا دل چاہ رہا ہے کہ میرے سامنے ایک ایسا انسان ہے جسے میں اپنی تکلیفوں اور ناکامیوں کے بارے میں بتاؤں، شاید میری باتیں تمہارے لیے اہم نہ ہوں مگر مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ پہلی بار ایک غمگسار مجھے ملا ہے، جس کے پاس وقت ہے میرے دل کی بات سننے کے لیے، کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ میں بہت توجہ سے تمہارے دل کی بات سنوں گی، تمہارے غم کو سمجھوں گی؟" اس کے سوال پر وہ نظر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

"کچھ دیر بعد ریسکیو یہاں آ جائے گی اور تم چلے جاؤ گے، جانے سے پہلے کیا تم مجھے کچھ وقت کے لیے اپنا دوست بھی نہیں سمجھ سکتے؟" اس کے خاموشی سے دیکھنے پر وہ مزید بولی تھی۔

"ساشا... یہ نام بتایا تھا تم نے اپنا؟" اس کے سوال پر ساشا نے سر ہلایا تھا۔ دوسری جانب وہ گہری سانس لیتا جگمگاتے آسمان پر نظر جما چکا تھا۔

"میرے دل میں بھی اب ایسا کچھ باقی نہیں رہا جو تمہیں بتا سکوں، میں جانتا ہوں تم مجھ سے یہ معلوم کرنا چاہتی ہو کہ میں کیوں خودکشی کا مرتکب ہوا؟" آسمان پر نظر جمائے وہ ایک پل کو خاموش ہوا تھا۔

"ایک انسان دنیا کو سمجھنے کے لیے، اس میں شامل ہونے کے لیے جب تیار ہوتا ہے تو اس کے پیچھے سہارا دینے کے لیے کچھ رشتے ہوتے ہیں، جو اس کی ہمت بندھاتے ہیں، دنیا کے سمندر میں اگر اس کا توازن بگڑے تو اسے سنبھالتے ہیں، آگے بڑھانے کے لیے اسے ڈھارس دیتے ہیں، اس کے آنسو پونچھتے ہیں، اس سے محبت کرتے ہیں، مگر میں ان سب ہی رشتوں سے محروم تھا، دن سڑکوں پر رات

پارک کی بنچوں پر گزارتے ہوئے پتہ ہی نہیں چلا کہ ایک گھر کی خواہش کتنی شدت سے دل میں جڑ پکڑ چکی تھی، میں خواب میں خود کو ایک خوبصورت گھر میں دیکھتا تھا، جہاں میرے اردگرد کچھ ایسے رشتے ہوتے جو مجھ سے محبت کرتے اور میں ان سب کے درمیان بہت خوش ہوتا... اور جب آنکھ کھلتی تو وہی ہراساں کرتی تنہائی میرے گرد ہوتی، پھر میں نے جاگتی آنکھوں سے بھی ایک گھر کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے، کچھ اور خواب بھی اس خواب کے ساتھ جڑ گئے، کسی کا ساتھ، عمر بھر کا ساتھ، چاہنے اور چاہے جانے کے خواب، مگر ان سب خوابوں کو تعبیر دینا بہت مشکل تھا، میں جدوجہد کرتا رہا، دن رات ایک کر دیئے، گھر بنانے کے لیے بہت سارا پیسہ چاہئے تھا اور مجھے ایک بڑی رقم جمع کرنی تھی، اسی جدوجہد کے دوران مجھے وہ ملی جس سے ملنے کے بعد مجھے لگا تھا کہ اس کے بغیر تو میرا گھر، گھر کہلا ہی نہیں سکے گا"۔

گھٹنوں پر ہاتھ رکھے وہ ساکت بیٹھی اسے سن رہی تھی جو بولتا جا رہا تھا۔

"میں جس اسٹور میں سیلز مین تھا وہ وہیں میرے ساتھ کام کرنے آئی تھی، میں شاید اس کی نظر میں کوئی کشش نہ رکھتا تھا، مگر وہ تو پہلی لڑکی تھی جو پہلی نظر میں میرے دل میں اتر گئی تھی، دن رات نوکریاں کرتے ہوئے میرے پاس اتنا وقت نہیں بچتا تھا کہ میں کسی لڑکی کے ساتھ وقت گزاروں، مگر وہ دن کی شفٹ میں میرے ساتھ ہی اسٹور میں کام کرتی تھی، میں نے کبھی صاف طور پر اسے اپنے جذبات سے آگاہ نہیں کیا، مگر وہ جانتی تھی، پہچانتی تھی کہ میں اسے کتنا چاہنے لگا ہوں، پھر ایک دن میں نے اس سے بس اتنا کہا کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں، اس نے مجھے انکار نہیں کیا مگر کوئی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی، ایک معمولی ورکر کا پرو پوزل اسے ساتویں آسمان پر تو نہیں پہنچا سکتا تھا، اس نے بس اتنا کہا کہ میں پہلے ایک گھر بناؤں، کوئی اچھا بزنس شروع کروں، اس سے پہلے شادی کا کوئی جواز نہیں بنتا، یہ تو میں بھی جانتا تھا مگر میں اس کے اسی جواب سے خوش تھا، میری جدوجہد اور تیز ہو گئی، دو کے بجائے میں نے تین تین نوکریاں کرنی شروع کر دی تھیں۔ گھر کے ساتھ ساتھ مجھے بزنس بھی شروع کرنا تھا، رقم اور چاہیے تھی۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ اسٹور چھوڑ کر شہر کے ایک دوسرے بہت بڑے اسٹور میں سیلز گرل کی جاب کرنے چلی گئی، کیونکہ وہاں اسے اچھی سیلری مل رہی تھی اور میں اس کی خوشی میں خوش تھا، مگر میں اسے نہیں بتا سکا کہ اس کا چند گھنٹوں کا ساتھ ختم ہو جانا میرے دل کو کتنا صدمہ پہنچا رہا ہے، مجھے یہ اطمینان تھا کہ اس نے مجھ سے تعلق پہلے کی طرح قائم رکھا ہے۔ میں اسے فون کرتا، روزانہ لنچ بریک میں لنچ کرنے کے بجائے اس سے ملنے اس کے اسٹور تک پہنچ جاتا، وہ بھی بہت خوشی سے ملتی، ہمارے درمیان کچھ باتیں ہوتیں جن کے سہارے میں دوسرے دن تک اس سے ملنے کا انتظار کرتا"۔ بولتے بولتے وہ یکدم چپ ہو گیا۔ ساشا نے اسے بولنے پر مجبور نہیں کیا تھا اسے اندازہ تھا کہ اس وقت وہ کہیں اور ہی پہنچا ہوا ہے، زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا وہ پھر بولنا شروع کر چکا تھا۔

"پھر پتہ نہیں اسے کیا ہوا، اس نے سرد مہری سے پیش آنا شروع کر دیا، اس نے میرے فون بھی اٹینڈ کرنے بند کر دیئے مگر میں نے دل میں اس کے خلاف بدگمانی نہیں آنے دی، اس اسٹور میں وہ منیجر کی پوسٹ پر آ گئی تھی، اس کا کام اور ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں، مگر میں تو وہی تھا، وہ میرے لئے ہر کام، ہر ذمہ داری سے پہلے تھی۔ ایک دن جب میں اس سے ملنے گیا تو پہلی بار وہ مجھے اسٹور کے اندر لے گئی، میں نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ وہ اپنے اسٹور کے مالک سے مجھے ملانا چاہتی ہے۔ میں حیران تھا کہ آج

اچانک وہ ایسا کیوں چاہتی ہے، مگر میں تو ہر معاملے میں اس کی خوشی میں خوش تھا، میں پہلی بار اس خوش پوش انسان سے مل رہا تھا، جس نے پہلی ملاقات میں ہی مجھے منہ کے بل گرادیا تھا، میں جس کے ساتھ اپنے گھر کو آباد کرنا چاہتا تھا وہ خود مجھے بتا رہی تھی کہ وہ اس شخص سے شادی کرنے والی ہے، ایک ہفتہ پہلے ہی ان دونوں نے انجمنٹ رنگ ایک دوسرے کو پہنائی تھی، پچھلے ایک ہفتے سے میرے خواب ایک ایک کر کے جل رہے تھے اور مجھے خبر تک نہ ہو سکی اور جب خبر ہوئی تو ان خوابوں کی راکھ میرے ہاتھوں میں تھی، جن کو ساتھ لئے میں خاموشی سے ان دونوں کے درمیان سے نکلتا وہیں پہنچ گیا جہاں سے چلا تھا۔"

"تم نے اس سے کوئی سوال کوئی شکایت نہیں کی؟" ساکت نظروں سے اس کے چہرے پر پھسلتے دو قطروں کو دیکھتی وہ بمشکل بولی تھی۔

"نہیں... اس دن میں اسے یہ بھی نہیں بتا سکا تھا کہ ایک دن پہلے ہی میں نے ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا ہے، پھر یہ بھی بتانا پڑتا کہ اس گھر کو خریدنے کے بعد میرے پاس صرف وہی چند روپے بچے ہیں جو اس وقت میرے والٹ میں پڑے مجھ پر ہنس رہے تھے"۔ وہ ٹوٹے لہجے میں بولا تھا۔

"اسے میری ضرورت نہیں تھی، اسے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی، جو اسے اچھا گھر، پرآسائش زندگی دے سکے، معاشرے میں جس کا ایک مقام ہو، جو بھاری بینک بیلنس اور کامیاب بزنس کا مالک ہو، اور وہ شخص اسے مل گیا تھا، میرے پاس کیا تھا جس پر اکڑ کے میں اس سے سوال کرتا، میں نے کبھی اسے ایک اچھا تحفہ تک نہیں دیا تھا، کیا شکایت کرتا اس سے؟ میری غلطی تھی، دن رات کی محنت کے بعد بھی مجھ جیسے ناکام انسان کو خواب دیکھنے کا کوئی حق نہیں تھا، میں جس عورت کو قیمتی تحفے نہیں دے سکتا تھا، ہوٹل میں ڈنر کروانا افورڈ نہیں کرسکتا تھا، جس پر خرچ کرنے کے لیے میرے پاس بے تحاشہ روپیہ نہیں تھا، اس عورت کی بے وفائی پر میں اس سے کیا شکایت کرتا؟" وہ یکدم مشتعل ہوتا بول رہا تھا۔

"مجھ جیسے انسان کو زندہ رہنے کا بھی حق نہیں ہے، جو ایک ایک خوشی کے لیے ترستا رہا ہو، جس کو ٹھکرایا تو جا سکتا ہے مگر گلے سے نہیں لگایا جا سکتا، میری زندگی شرمندگی اور ناکامی کا دوسرا نام ہے اور میں اس کا بوجھ اس لئے نہیں اٹھا سکتا کہ میں ٹوٹ چکا ہوں، میری روح تھک چکی ہے، ہر مقصد فوت ہو چکا ہے"۔ بھینچے لہجے میں بات ختم کرتا وہ خاموش ہو گیا تھا۔

"جتنی سچائی سے تم نے مجھے یہ سب بتایا ہے، اسی سچائی سے میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ تم ایک بہت اچھے انسان ہو، تم کہتے ہو کہ تم نے کوئی کامیابی حاصل نہیں کی، مگر ہر کامیابی سے بڑی کامیابی ہے اچھا انسان بننا، دولت، شہرت تو کوئی بھی حاصل کر سکتا ہے، تمہاری دوسری بڑی کامیابی یہ ہے کہ تم نے اپنا پہلا خواب حاصل کر لیا، اسے تعبیر دے دی، تم نے اپنی محنت سے ایک گھر حاصل کر لیا ہے، زندگی صرف ایک عورت تک آکر ختم نہیں ہو جاتی، یہ اس عورت کی بدنصیبی ہے کہ اس نے تمہاری اور تمہارے جذبوں کی قدر نہیں کی، مگر یہ تمہاری خوش نصیبی ہے کہ تمہیں ایک ایسی عورت سے چھٹکارا مل گیا جو دولت اور آسائشوں کے لئے شاید دس سال بعد بھی یا پھر کسی بھی موڑ پر تم سے دامن چھڑا سکتی تھی، تب کیا کرتے تم؟ کیا یہ بہتر نہیں ہوا کہ وقت پر تمہیں صحیح اور غلط کے بارے میں معلوم ہو گیا"۔ اس کے قائل کرنے والے انداز پر وہ بس خاموش تھا، اس کے چہرے سے ہی ظاہر تھا کہ ساشا کی کسی بات نے اسے متاثر نہیں کیا ہے۔

"دنیا کی ہر عورت کو دولت اور آسائش کی ضرورت نہیں ہوتی، کم از کم مجھے تو نہیں، جانتے ہو

میں ایک ایسے شخص کا ساتھ چاہتی ہوں، جو مجھ سے مخلص ہو اس کے بعد اگر مجھے اس کے ساتھ سڑک کے کنارے بھی رہنا پڑے تو میں ہنسی خوشی رہوں گی، کیونکہ میری چھت، میرا سائبان اور محافظ وہی تو ہوگا، میں یہ نہیں چاہوں گی کہ وہ دن رات میری محبت کا دم بھرے یا مجھے سامنے بٹھا کر دن میں دس بار محبت کا اظہار کرے، ہاں لیکن اگر میں کہیں گم ہو جاؤں اور اسے کہیں دکھائی نہ دوں، تو وہ پاگلوں کی طرح مجھے ڈھونڈتا پھرے، میرا نام لے کر چیختے چیختے اس کے حلق میں خراشیں پڑ جائیں''۔اس کے سنجیدہ لہجے پر کوفت سے سر ہلاتا وہ دوسری سمت دیکھنے لگا تھا جبکہ اس کے تاثرات پر ساشا کچھ شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

''معاف کرنا میں شاید کچھ زیادہ ہی بول گئی''۔وہ شرمندہ لہجے میں بولی تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' اس کے سوال پر وہ کچھ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

''اگر تم اپنا نام نہیں بتانا چاہتے تو کوئی بات نہیں، تم نے کچھ وقت کے لئے مجھے اپنا غمگسار سمجھ کر اپنے دل کی بات بتائی میرے لئے یہی...''

''شیموئیل''۔وہ درمیان میں ہی بول اٹھا تھا۔

''شیموئیل نام ہے میرا''۔اس کے سپاٹ لہجے پر وہ بس خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

''تم گورنس ہو، بچوں کی نگرانی کیسے کرتی ہوگی، تمہیں تو خود کسی کی نگرانی میں رہنے کی ضرورت ہے''۔اس کے تنقیدی لہجے پر ساشا نے الجھی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''تنہا یہاں تک آ گئی ہو، جانتی ہو یہ کتنی خطرناک جگہ ہو سکتی ہے تمہارے لئے؟'' وہ بولا تھا۔

''جانتی ہوں مگر مجھے عادت ہو چکی ہے خطروں کا سامنا کرنے کی، تنہا زندگی گزارنا کتنا مشکل ہے یہ تم سے زیادہ بہتر کون جانتا ہوگا، زندگی سے کچھ حاصل ہو یا نہ ہو، تنہائی سے اور خطروں سے لڑتے ہوئے زندہ رہنے کا طریقہ تو آ ہی جاتا ہے''۔وہ ہلکی آواز میں بولی تھی۔

''کیوں تنہا زندگی گزار رہی ہو، شادی کر لو''۔وہ بولا تھا۔

''تم کرو گے مجھ سے شادی؟'' ساشا نے فوراً سوال کیا تھا، مگر اگلے ہی پل اس کی حیران نظروں پر وہ بے ساختہ ہنسی تھی اور ہنستی ہی چلی گئی تھی۔شیموئیل خاموشی سے اسے دیکھتا رہا تھا جس کی ہنسی رک چکی تھی، مگر چہرے پر ہنسی کے معدوم ہوتے تاثرات موجود تھے۔بڑھتی خنکی سے بچاؤ کے لیے وہ بازوؤں کو اپنے گرد مضبوطی سے لپیٹے بیٹھی تھی۔

''کب سے گورنس کی جاب کر رہی ہو؟'' شیموئیل نے پوچھا تھا۔

''بس کچھ ہی عرصہ گزرا ہے''۔وہ مختصراً جواب دے کر ارد گرد دیکھنے لگی تھی۔

''اس سے پہلے کیا کام کرتی تھیں؟''

''اس سے پہلے بھی بہت جگہ مختلف نوکریاں کیں، مگر جاری نہ رکھ سکی کہیں... اور شاید اب یہ گورنس کی نوکری بھی چھوڑنی پڑے''۔

''اس کی کیا وجہ ہے؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''عزت اور عزت نفس سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی چیز اہم نہیں ہوتی، میں بھی ان کا سودا نہیں کر سکتی، اس لئے ہر نوکری سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں''۔نرم برف کو انگلی سے ادھر اُدھر کرتی وہ مدھم لہجے میں بولی تھی اور پھر یکدم سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

''مگر میں ان حالات سے ہار کر موت کو گلے نہیں لگا سکتی، پھر تم مرد ہو کر اتنی بزدلی کا مظاہرہ کیوں کر رہے ہو؟''

''تمہارے اس سوال کے باوجود میں دوبارہ خودکشی کی کوشش کروں گا''۔وہ سرد لہجے میں بولا تھا۔

''میری ایک بات مانو گے؟ انکار مت کرنا''۔

ساشا کے التجائی لہجے پر وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

"میرے اور تمہارے حالات تقریباً ایک جیسے ہیں، آج ہم دونوں یہاں سے ایک نیا عزم، ایک نیا عہد لے کر جدا ہوتے ہیں کہ اگلے تین ماہ تک ہم اپنی اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی کامیابی حاصل کریں گے، یہ ایک طرح کا مقابلہ ہوگا، مگر ہم دونوں کے پاس تین ماہ کے لیے ایک مقصد ہوگا، یہاں سے جاتے ہوئے نہ تم تنہا ہو گے اور نہ میں۔ میں اپنے لئے نہیں تمہارے لئے کوئی کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کروں گی اور تم میرے لئے، اگر یہ سوچ ساتھ ہوگی تو ایک جذبہ اور جوش ہماری کوشش میں شامل ہو جائے گا، اب تک ہم اپنے لئے زندگی میں جدوجہد کرتے رہے ہیں، اب یہ تبدیلی اپنی زندگی میں کر کے دیکھتے ہیں، میں جانتی ہوں تم اندر سے بزدل نہیں ہو، بس تین ماہ تک کی بات ہے اس دوران تم خودکشی کا ارادہ ترک کر دو۔"

"اور تین ماہ گزرنے کے بعد کیا ہوگا؟" شموئیل نے پوچھا تھا۔

"تین ماہ بعد آج کی ہی تاریخ میں ہم اسی جگہ ملیں گے۔" اس کے فوراً کہنے پر وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"اس میں تمہاری ہی نہیں میری بھی بھلائی ہے، یہاں سے جاتے ہوئے مجھے یہ ڈھارس تو ہوگی کہ میں تنہا نہیں ہوں، کوئی ہے جو میرا انتظار کر رہا ہے، مجھے واپس اس کے پاس جانا ہے، کہیں تمہیں میری باتیں احمقانہ تو نہیں لگ رہیں؟" ایک پل کو رک کر ساشا نے اس سے پوچھا تھا۔

"پتہ نہیں، مگر اس سب سے کیا حاصل ہونے والا ہے؟" وہ کچھ بیزاری سے بولا تھا۔

"یہ تین ماہ کے بعد معلوم ہو جائے گا، اس دوران ہم اپنی اپنی کوشش میں ایک دوسرے سے کیا عہد تازہ رکھیں گے، ہر صبح ایک نئے عزم کے ساتھ کوشش شروع کریں گے، مجھے یقین ہے کہ اس مقابلے میں تم مجھ سے ہارنا ہرگز نہیں چاہو گے، ویسے ہار، جیت کا فیصلہ آج کے دن ہی ہوگا۔"

"اس وقت تو رات ہے۔" شموئیل کا لہجہ غیر سنجیدہ ہی تھا۔

"اچھا یاد دلایا، دن سے لے کر رات تک ہم یہاں ایک دوسرے کا انتظار کریں گے، آنے میں مجھے یا تمہیں رات بھی ہو سکتی ہے، ان پہاڑوں کے درمیان پہنچنا تمہارے لئے آسان ہو سکتا ہے مگر میرے لئے نہیں۔"

"اس جگہ ہی آنے کی وجہ کیا ہے؟" شموئیل نے پوچھا تھا۔

"اس لئے تا کہ جوش و خروش قائم رہے، ویسے بھی مجھے یہ جگہ بہت پسند آئی ہے، کسی اچھے انسان سے اچھی جگہ ہی ملا جائے تو اچھا رہتا ہے۔" وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

"تم تنہا یہاں تک کیسے آؤ گی؟"

"وہ میرا کام ہے اور تم کیسے آؤ گے؟ تمہارا فوکر تو تباہ ہو چکا ہے، تم نے کتنی رقم خرچ کی تھی اسے خریدنے کے لیے؟" ساشا نے پوچھا تھا۔

"یہ تو بالکل ناکارہ فوکر تھا، سستے داموں پر میں نے اسے کباڑ خانے سے اٹھایا تھا، میں نے بس اس کی اتنی مرمت کی کہ یہ مجھے اڑا کر کسی پہاڑ سے ٹکرا دیتا۔"

"مگر اب یہ فوکر تمہارے منصوبے کو دھوئیں میں اڑا چکا ہے۔" ساشا نے کہا تھا۔

"مجھے واپس کیمپ جانا ہے، ریسکیو کا ہیلی کاپٹر بھی یہاں پہنچنے والا ہوگا، کیا تم راضی ہو اس مقابلے کے لیے؟" ساشا کے سوال پر اس نے ایک پل کو کچھ سوچا تھا۔

"میں کیسے یقین کروں تمہارا کہ تین ماہ بعد تم

مجھے یہاں ملو گی؟"

"بالکل اسی طرح جیسے مجھے تم پر یقین ہے کہ تم ضرور وعدے کے مطابق مجھے یہاں ملو گے، میں بھی تم سے یہاں ملنے کا وعدہ کرتی ہوں"۔ وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

"ٹھیک ہے"۔ پرسوچ انداز میں شیموئیل نے سر ہلایا تھا۔

"تمہارا بہت شکریہ، میں بہت خوش ہوں"۔ وہ بولی تھی اور اگلے ہی پل وہ دونوں چونک اٹھے تھے دور کہیں سے ہیلی کاپٹر کی مدہم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"ہمارا ٹائم اب شروع ہو رہا ہے، مجھے امید ہے کہ تم بہت جلد صحت یاب ہو جاؤ گے"۔ ساشا نے عجلت میں کہا تھا۔

"کیوں ناں ہم ایک دوسرے کو اپنی اپنی کوئی نشانی دیں تاکہ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ ہونے کا یقین رہے؟"

"میں اپنے چہرے پر تمہاری نشانی لے کر جا رہا ہوں، یہ تھپڑ مجھے تین ماہ بعد بھی یاد رہے گا"۔ وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

"نہیں، کوئی ایسی چیز میں تمہیں دوں گی، جو تمہیں میرے بارے میں اچھا سوچنے پر مجبور کرے"۔ وہ شرمندہ ہوئے بغیر بولی تھی۔ دوسری طرف شیموئیل نے حیرت سے اسے دیکھا تھا، جو اپنی گردن سے زنجیر اتار رہی تھی۔

"میں یہ نہیں لے سکتا، رکو..." شیموئیل نے اسے روکنا چاہا تھا، مگر وہ ان سنی کیے اس کی جیکٹ کی پاکٹ میں زنجیر ڈال چکی تھی۔

"اب تم بھی جلدی سے اپنی کوئی چیز دو"۔ ہیلی کاپٹر قریب آتا جا رہا تھا، ساشا کی عجلت نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔

"میرے پاس یہ رسٹ واچ ہی ہے، میں اسے کھول نہیں پاؤں گا، تم خود لے لو"۔ شیموئیل نے اپنا ہاتھ اس کی سمت بڑھا دیا تھا۔

"کمال ہے، تم رسٹ واچ پہن کر خودکشی کرنے نکلے تھے"۔ اس کے ہاتھ سے رسٹ واچ اتارتی وہ مسکرائی تھی جبکہ شیموئیل نے پہلی بار بغور اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔

"تم مجھے اپنا ایڈریس یا کانٹیکٹ نمبر دے دو، یا مجھ سے لے لو"۔ وہ بلا سوچے سمجھے ہی بول گیا تھا۔

"یہ دونوں چیزیں دوں گی بھی اور تم سے لوں گی بھی، مگر تین ماہ مکمل ہونے پر آج کی ہی تاریخ میں"۔ وہ اطمینان سے بولی تھی اور پھر آسمان کی طرف دیکھتی اس کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔ شیموئیل کی نظریں اس پر ہی جمی تھیں جو سامنے ہی اپنا اونی اسکارف ہاتھ میں پکڑ کر ادھر اُدھر ہلاتی ہیلی کاپٹر کو نیچے آنے کا اشارہ دے رہی تھی، سر پر چکر کاٹتا ہیلی کاپٹر لینڈ کرنے کے لیے مناسب جگہ تلاش کر رہا تھا جب اس کے تیز شور اور ہوا کے جھکڑوں میں وہ بھاگتی ہوئی واپس اس کے پاس آئی تھی۔

"اگر دوبارہ تم پر خودکشی کرنے کا اور مایوسی کا اٹیک ہو تو میری نشانی کو دیکھنا اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا"۔ ہیلی کاپٹر کے شور میں اس کی بلند آواز سنتے ہوئے شیموئیل کو اچانک یہ احساس ہوا تھا کہ وہ کسی بھی طور پر اسے خودکشی سے باز رکھنا چاہتی ہے۔

"میں تمہیں بہت مس کروں گی اور تم...؟" وہ پوچھ رہی تھی، اثبات میں سر کو حرکت دیتا وہ بس اس کو دیکھ رہا تھا، تیز ہواؤں سے اس کے بال چہرے پر بکھر رہے تھے مگر اس کے چہرے پر پھیلی چمک کو چھپا نہیں سکے تھے۔

ریسکیو نے بہت تیزی سے اپنا کام کیا تھا، جس وقت وہ شیموئیل کو اسٹریچر پر ڈال کر ہیلی کاپٹر کی طرف لے جا رہے تھے، ساشا اس کے ساتھ ہی چل رہی تھی، وہ بالکل خاموش تھی مگر آخری بار جب ساشا

کی طرف اس نے الوداعی نظر ڈالی تو اس کی آنکھیں شیموئیل کے دل ودماغ میں نقش ہوگئی تھیں، اس کی آنکھوں میں جو تاثر، جو احساس تھا، اسے وہ نہیں بھول سکتا تھا، ساشا کا چہرہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا، مگر وہ اس کی آواز سن سکتا تھا، وہ آج کی تاریخ بار بار دہرا رہی تھی، ہیلی کاپٹر فضا میں آہستہ آہستہ بلند ہوتا جارہا تھا۔

سر اٹھائے وہ آسمان پر دور غائب ہوتے ہیلی کاپٹر کو دیکھ رہی تھی، جو اب ایک سیاہ نقطے کی طرح دکھائی دے رہا تھا، اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اس کا چہرہ ایک گرم سیال سے بھیگتا چلا گیا تھا، پہلی بار وہ کسی اپنے جیسے ٹوٹے بکھرے انسان سے ملی تھی، مگر اب وہ جا چکا تھا، لیکن واپس یہاں آنے کے لیے، اسے بھی اب واپس کیمپ تک جانا تھا، انتہائی تیزی سے وہ بھاگتی جارہی تھی، اس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں ایک رسٹ واچ چاند کی تیز روشنی میں چمک رہی تھی۔

☆..........☆..........☆

ایک چمکتے دمکتے اسٹور سے باہر نکلتے ہوئے اس کے پیر میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ موجود تھی، مکمل ریسٹ نہ کرنے کے باعث اس کے فریکچر ز اتنی جلدی بہتر نہیں ہونے والے تھے، مگر اسے پرواہ نہیں تھی، سر اٹھا کر اس نے اسٹور کے ماتھے پر چمکتے بورڈ کو دیکھا تھا، ایک خوشی کی رمق اس کے دل میں جاگ اٹھی تھی، ایک ماہ کے مختصر عرصے میں اگر یہ کامیابی اس نے حاصل کی تھی تو اس کا محرک صرف وہی تھی، جس کی نشانی اس وقت اس کی ہتھیلی پر موجود تھی، چند لمحوں تک وہ اس معمولی سی زنجیر کی غیر معمولی چمک دمک کو دیکھتا رہا تھا اور پھر دوبارہ اسٹور کا طائرانہ جائزہ لیا تھا، یہ اسٹور اس کی ملکیت تھا، اسے خریدنے کے لیے اسے اپنے اس گھر کو فروخت کرنا پڑا تھا، جو اس کا پہلا خواب تھا۔ وہ مطمئن تھا کہ اس نے ایک بہتر فیصلہ کیا تھا، اسے امید تھی کہ یہ اسٹور کامیابی سے چلے گا، یہ بزنس سیٹ ہوگیا تو وہ دوبارہ پہلے سے ایک بہتر گھر خرید سکے گا اور اسے معلوم تھا کہ اس مصروف علاقے میں اس کا کام اچھی طرح سے چلے گا۔

ایک ہفتہ ہاسپٹل کے بیڈ پر لیٹے لیٹے وہ یہ ساری منصوبہ بندی کرتا رہا تھا کیونکہ وہ خود بھی ایک نئے سرے سے اپنی زندگی کی شروعات کرنا چاہتا تھا، خودکشی کے بارے میں اب وہ کسی حال میں نہیں سوچنا چاہتا تھا، کیونکہ وہ موت کو بہت قریب سے دیکھ چکا تھا، موت کتنی بھیانک ہوسکتی ہے یہ جان لینے کے بعد وہ اب زندہ رہنا ہی بہتر سمجھتا تھا۔ اسے امید تھی کہ اگلے دو ماہ میں شاید وہ کچھ اور کامیابیاں بھی حاصل کر سکے گا، مثلاً وہ اپنے اسٹور کے باہر ایک چھوٹی سی فلاور شاپ بھی شروع کرنے کی پلاننگ کر رہا تھا اور اس کے علاوہ وہ کسی اچھے علاقے میں صرف ایک کمرے کا ہی فلیٹ کرائے پر لینا چاہتا تھا، فی الحال تو اس کا اسٹور ہی اس کی رہائش گاہ بنا ہوا تھا، اسے یقین تھا کہ اگلے ایک ماہ میں وہ یہ دونوں کام بھی کامیابی سے کر لے گا، یہ عزم اور حوصلہ اسے ایک ایسی ہستی سے ملا تھا جس کا چہرہ گزرے ایک ماہ میں اسے کہیں دکھائی نہیں دیا، مگر وہ مستقل اس کے ساتھ تھی، وہ اپنے لئے نہیں اس کے لیے کامیابیاں حاصل کرنے کی جدوجہد میں تھا اور اسی لئے وہ کامیاب ہو رہا تھا۔ وہ پریقین تھا، اپنے لئے جینا کوئی متاثر کن چیز نہیں ہوتی، کسی اور کے لیے خود کو زندگی میں آگے بڑھاتے رہنا بہت خوبصورت مشقت ہوتی ہے، گزرے دنوں میں اسے یقین ہوگیا تھا۔

☆..........☆..........☆

ویک اینڈ پر رات گئے تک اسٹور پر کسٹمرز کا رش لگا رہتا تھا، اپنے سیلز مین کی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ اسے باہر فلاور شاپ پر دوسرے سیلز مین کی مدد بھی کرنی پڑتی تھی، اس کا ہر دن مصروف سے مصروف تر

ہوتا جا رہا تھا، اسے کھانے پینے کا وقت بھی بہت مشکل سے مل پاتا تھا، اس کے ریگولر کسٹمرز کی تعداد بے شمار تھی کیونکہ وہ سب کے ساتھ بہت خوش اخلاقی اور ملنساری سے پیش آتا تھا، اس کے دونوں سیلز مین بہت محنتی اور بھروسہ مند تھے لہٰذا وہ ان کا بھی بہت خیال رکھتا تھا، ایک چھٹی کا دن اسے ملتا تھا، اس میں بھی کرنے کے لیے بہت کام ہوتے تھے۔ آدھا دن اسٹور کے گودام میں حساب کتاب کرتے ہوئے گزرتا اور پھر رات گئے تک اپنے فلیٹ کی حالت درست کرنے میں وہ گھن چکر بنا رہتا تھا، یہ فلیٹ اسے اچھے علاقے میں مل تو گیا تھا مگر اس کی حالت بہت ابتر تھی، اس کے پاس وقت کی کمی تھی لہٰذا وہ آہستہ آہستہ ہی فلیٹ کو اپنے مطابق سدھار رہا تھا۔

دن سے رات تک وہ کتنا ہی مصروف ہو، مگر جب تھک کر وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹتا تو بھی اس کے پاس سوچنے کے لیے بہت کچھ ہوتا تھا، جس کے لیے وہ اپنے آپ کو اس زندگی میں ایڈجسٹ کر رہا تھا، وہ کبھی اسے کسی خواب کی طرح لگتی اور کبھی ایک مستحکم حقیقت، ہر رات سونے سے پہلے وہ اس نازک سی سنہری زنجیر کو دیکھنا نہیں بھولتا تھا، کبھی وہ سوچتا کہ "جانے ساشا کو اپنا وعدہ یاد ہے یا نہیں... وہ اس وقت کہاں ہوگی؟ کس حال میں ہوگی؟ کیا وہ وعدے کے مطابق اس سے ملنے طے شدہ جگہ پر پہنچے گی بھی یا نہیں؟" یہ سوچیں کبھی کبھی اسے بہت زیادہ بے چین کر دیتی تھیں، مگر دل کو ایک انجانا سا یقین تھا، کبھی ساشا کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے حیرت ہوتی کہ کتنی آسانی سے وہ اسے اور اس کی زندگی کو بدل چکی ہے کوئی رابطہ نہ ہونے کے باوجود... اس کے بارے میں سوچنا شیموئیل کا ایک واحد پسندیدہ مشغلہ تھا، اپنے دل کی بدلتی کیفیات پر وہ حیران نہیں تھا، یہ احساس بہت خوبصورت تھا کہ اس دنیا کے کسی حصے میں ایک ایسا انسان موجود ہے جو اس سے ملنے کے انتظار میں ہے، جس نے اسے یاد رکھا ہوا ہے، ہاں، اس کے دل کو یقین تھا کہ ساشا نے بھی ایک دن کے لیے اسے نہیں بھلایا ہوگا، جس طرح وہ اسے نہیں بھولا، وہ آج بھی اس کی آنکھوں کے اس تاثر کو نہیں بھول سکا تھا جو آخری بار اس نے ساشا کی آنکھوں میں دیکھا تھا، جس کے زیر اثر آج بھی اس کے دل و دماغ تھے، بہت شدت کے ساتھ وہ تیسرے ماہ کے اختتام اور طے شدہ تاریخ کا انتظار کر رہا تھا۔

☆............☆............☆

وہ بہت زیادہ پرجوش تھا، مقررہ تاریخ اب بہت قریب تھی، ساشا کی آواز مستقل اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھی، وہ زندگی میں پہلی بار اتنا خوش تھا کیونکہ وہ کسی کے لیے چند کامیابیاں حاصل کر کے جا رہا تھا، ساشا نے اس کے لیے کیا، کیا حاصل کیا ہے، یہ خیال اسے بہت ایکسائیٹڈ کر رہا تھا۔

مقررہ تاریخ سے ایک دن پہلے اس نے سفر کا آغاز کرنے کی تیاری کر لی تھی، برفباری نے شہر کے معمولات کو کچھ ڈسٹرب کر دیا تھا، وہ جانتا تھا کہ شمالی حصے میں پہاڑوں پر برف کے طوفانوں کا آغاز ہو چکا ہے، یہ چیز اسے بہت فکرمند کر رہی تھی، وہ کرائے پر ایک فوکر لے کر جا رہا تھا مگر ساشا اتنے خراب موسم میں وہاں کس طرح پہنچ سکے گی، ان پہاڑوں پر پورا سال برف پڑتی تھی اور اب تو وہاں طوفانی ہواؤں کے ساتھ برف پڑ رہی تھی، بہرحال وہ مایوس نہیں تھا، بہت اچھی امیدوں کے ساتھ وہ اپنے سفر کا آغاز کرنا چاہتا تھا اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

☆............☆............☆

ایسے خراب موسم میں ان پہاڑوں کا رخ کرنا اپنی جان جوکھم میں ڈالنے کے مترادف تھا، مگر ایک انجانی سی طاقت نے اسے ہر خطرے کو پار کرنے کی ہمت و حوصلہ عطا کیا تھا۔ فوکر کو کسی محفوظ جگہ اتارنے

میں کافی وقت لگ گیا تھا، جس وقت اس نے زمین پر قدم رکھا پیر برف میں دھنس رہے تھے ہر چیز برف میں چھپی ہوئی تھی، پچھلی رات جو برف کا طوفان آیا تھا اس کی شدت میں بہت حد تک کمی آ گئی تھی، مگر برف مسلسل گر رہی تھی۔ یخ بستہ ہواؤں سے اس کا وجود محفوظ تھا، کیونکہ سر سے پیر تک وہ گرم اور بھاری لباس میں ملبوس تھا۔ مگر اس کا چہرہ سردی کی شدت سے سفید پڑ چکا تھا، برف میں دھنستے پیروں کو کھینچتا وہ اسی مانوس درخت تک پہنچا تھا، وہاں بیٹھتے ہوئے اس کا انتظار شروع ہو چکا تھا مگر ابھی صبح کے 7 بجے تھے، سورج کا نام و نشان تک نہ تھا، ہر طرف ملگجا سا اندھیرا اور برستی برف دکھائی دے رہی تھی۔ برفیلی ہواؤں سے چہرہ بچانے کے لیے اس نے مفلر کو ناک تک لپیٹ لیا تھا، اس کے اندر جوش و ولولہ یہ برفانی ہوائیں ٹھنڈا نہیں کر سکتی تھیں۔

وقت بہت سستی کے ساتھ گزر رہا تھا، اس کی آنکھیں ہر اس سمت کو جانچ رہی تھیں جہاں سے ساشا کے آنے کی امید اسے ہو سکتی تھی، اس کے بارے میں ہی سوچتا وہ وقت کے جلد از جلد گزرنے کا انتظار کر رہا تھا، تاکہ وہ وقت آ جائے جب وہ اپنی محسن سے ملے گا، اسے بتائے گا کہ وہ اس کے لیے کیا کر چکی ہے، اسے اور اس کی زندگی کو ایک ملاقات میں کس قدر حیرت انگیز طور پر بدل چکی ہے۔ جو اس نے کیا، ایسا کچھ کبھی کسی نے اس کی زندگی کے لیے نہیں کیا تھا۔ جیسے جیسے دن گزرتا جا رہا تھا اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، یہاں آتے ہوئے دل کو جو دھڑکا سا لگا تھا وہ اب بڑھنے لگا تھا۔

”ہو سکتا ہے کہ وہ راستہ بھول گئی ہو“۔ یہ خیال آتے ہی وہ درخت کے پاس سے اٹھ گیا تھا اور آس پاس کے حصے میں چاروں طرف گھومنا شروع کر دیا تھا، اس امید پر کہ شاید ساشا کی موجودگی کے آثار دکھائی دے جائیں اور وہ خود اس تک پہنچ جائے، مگر بہت دیر گزرنے کے بعد بھی ایسے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے نہ کوئی مانوس پکار سنائی دی تھی۔ ایک عجیب سے خوف نے اسے گھیرے میں لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ دوبارہ اپنی زندگی سے نفرت نہیں کرنا چاہتا تھا، دوبارہ اپنی زندگی کو فنا نہیں کرنا چاہتا تھا، دوبارہ تنہا نہیں ہونا چاہتا تھا، جیسے جیسے شام سر پر آ رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ اس کا صبر کا اختتام ہو رہا ہے، اس کے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی یا پھر وہ پاگلوں کی طرح چیخنا چلانا شروع کر دے گا، اپنے آپ کو کوسے گا یا پھر عورت، وعدے اور وفاداری سے اس کا اعتبار ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔

پہاڑوں پر اس موسم میں شام اور دن بہت مختصر ہوتے ہیں مگر وقت نہیں... شام کے 6 بج رہے تھے اور رات کا اندھیرا ہر سمت پھیلنے لگا تھا، اس کا ضبط جواب دے گیا تھا، وہ یہ قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا کہ ساشا نے اسے دھوکہ دیا ہے، وہ اسے بھول چکی ہے، یا وقتی طور پر وہ اسے خودکشی سے روکے رہنے کے لیے ایک سراب کے حوالے کر گئی تھی، اس کا دماغ اشتعال سے تپ رہا تھا مگر دل صدمے سے چور چور تھا، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، دل مستقل دماغ کے خلاف تھا، اس کا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ ساشا نے اسے دھوکہ نہیں دیا وہ یقیناً اسے یہیں کہیں ملے گی، دل کا شور اس حد تک بڑھا کہ وہ انتہائی جنون کی سی کیفیت سے دوچار ہو گیا تھا، اگر اس کا دل سچ کہہ رہا ہے تو وہ ایک جگہ رُکا نہیں رہے گا، ہر حال میں اسے ہر طرف تلاش کرے گا، وہ ایسی شکستگی کے ساتھ واپس نہیں جانا چاہتا تھا، اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا، ایک بار پھر طوفان نے شدت اختیار کرنی شروع کر دی تھی، برف پر بھاگتے ہوئے وہ کئی بار اس میں دھنس کر گرا تھا، تھک کر رکتے ہوئے اس نے چاروں سمت نظریں دوڑائی تھیں، کہیں کوئی کیمپ بھی نظر نہیں آ رہا تھا، برف کا طوفان اسے زیادہ دور تک دیکھنے کی اجازت نہیں

دے رہا تھا۔ مگر وہ ہار نہیں مان رہا تھا۔

"ساشا... ساشا..." وہ حلق کے بل چیختا بے سمت بڑھتا جا رہا تھا۔

"ساشا... سیش... سیش..." بھیانک جھکڑوں نے اسے برف پر اوندھے منہ گرا دیا تھا، اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک وہ اسی حالت میں طوفان کی زد میں پڑا رہا تھا، اس کا حلق پکارتے پکارتے چھل چکا تھا، اب کوئی امید باقی نہیں رہی تھی، اسے سچ کو قبول کر لینا چاہیے تھا، زندگی میں ہر چہرہ آپ کو دوبارہ دکھائی نہیں دیتا، حالانکہ آپ اسے دیکھنا چاہتے ہیں مگر نہیں دیکھ پاتے، وہ چہرے رہنمائی کے لیے آپ کی زندگی میں نمودار ہوتے ہیں، آپ کو منزل کا پتہ دے کر خود کہیں گم ہو جاتے ہیں۔

ہر سمت اب تاریکی اور برف کا شور مچاتا طوفان تھا، بمشکل وہ اپنے پیروں پر اٹھا تھا، اور بے سمت خود کو آگے کھینچنا شروع کر دیا تھا، اس کے ہر انداز میں تھکن تھی، مایوسی تھی، وہ قدرت سے ہار گیا تھا، ساشا نے ٹھیک کہا تھا آج کی تاریخ فیصلے کی تاریخ تھی، وہ نہیں جانتا تھا کہ جیت کس کی ہوئی، مگر بس یہ یقین ہو چکا تھا کہ وہ ہار چکا ہے، بھیانک طوفان سے بے پروا وہ بس چلتا جا رہا تھا، چلتا جا رہا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے، کسی بھی وقت برف اس کی قبر بن سکتی تھی مگر اس کی ساری حسیات مر چکی تھیں، برف بن چکی تھیں۔

برفانی ہواؤں کے جھکڑوں سے آنکھوں کو بچاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر دیکھا، اسے دور درختوں کے جھنڈ کے اوپر کچھ دھواں سا پھیلتا نظر آ رہا تھا، مزید اس جانب جاتے ہوئے اب وہ ایک چھوٹا سا کیبن دکھائی دینے لگا تھا، دھواں اسی کیبن کی چمنی سے نکل رہا تھا، اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ جنگل کے قریب ہے کیونکہ عموماً ایسے کیبن جنگل میں شکار کے لیے یا کیمپنگ کے لیے آنے والوں کی سہولت کے لیے موجود ہوتے تھے، یہ کیبن بھی کسی کی ذاتی ملکیت نہیں تھا، لہٰذا وہ طوفان سے بچنے کے لیے وہاں پناہ لے سکتا تھا، چمنی سے اٹھتے دھوئیں سے پہلے ہی یہ ظاہر تھا کہ کیبن میں کوئی انسان موجود ہے، دروازہ اندر سے لاک تھا، اس نے طوفان کے شور کی وجہ سے بہت زوردار آواز میں دروازے کو دھڑ دھڑا دیا تھا، ایک بار نہیں دو اور تین بار مگر دروازہ نہیں کھلا تھا۔ اندر سے کسی کے کھانسنے کی مدھم آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی، کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ اندر جو کوئی بھی تھا وہ اس کے لیے دروازہ نہیں کھولنا چاہتا تھا۔

"تم جو کوئی بھی ہو مجھے اس طوفان کے رکنے تک یہاں پناہ لینے دو، تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا"۔ اس بار دروازہ پیٹتے ہوئے وہ بلند آواز میں چیخا تھا اور کامیاب ہوا تھا، کیونکہ اس بار دروازہ اندر سے کھل گیا تھا۔ سرعت سے اندر داخل ہو کر اس نے بمشکل طوفانی ہوا کو پچھاڑتے ہوئے لکڑی کے دروازے کے ہینڈل کو دیوار میں نصب ہک میں اٹکا دیا تھا، اپنے لباس سے برف جھاڑتے ہوئے اس نے فر کی ٹوپی کو سر سے اتار کر اس انسان کو دیکھا تھا جو آتش دان میں لکڑیاں ڈال رہا تھا، اس کی پشت سے نظر ہٹا کر شیمو ئیل نے کیبن کا جائزہ لیا تھا جو کہ بہت چھوٹا سا تھا، کیبن میں آتش دان میں سلگتی آگ کی نارنجی روشنی ہی پھیلی تھی، یہ کیبن بہت بوسیدہ لگ رہا تھا، باہر طوفان کی بھیانک آوازیں عروج پر جاری تھیں، پتہ نہیں یہ کمزور سا کیبن طوفان کی شدت کو برداشت کر سکے گا بھی یا نہیں، فر کی ٹوپی دوبارہ پہنتے ہوئے وہ بے اختیار آگ کی حرارت لینے آتش دان کے قریب بڑھا تھا مگر اچانک اس کے قدم لکڑی کے فرش پر جم گئے تھے۔ نظریں اس کے چہرے پر ساکت تھیں جو یک ٹک آتش دان پر چٹختی لکڑیوں سے اڑتی چنگاریوں کو دیکھ رہی تھی۔ پتہ نہیں کتنے لمحوں تک وہ ٹرانس کی سی کیفیت میں اس کو پہچاننے

کی کوشش کر رہا تھا جو اس کی موجودگی سے بالکل غافل نظر آ رہی تھی، اس کے بڑھتے قدموں کی آہٹ پر بھی متوجہ نہیں ہوئی تھی۔

پنجوں کے بل بیٹھتا وہ چند لمحوں تک دنگ نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا تھا جو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی، مگر وہ اس کے چہرے کو کیسے بھول سکتا تھا، یکدم وہ اس کے شانوں کو ہاتھوں میں جکڑ کر اپنی طرف متوجہ کر چکا تھا۔

"میں صبح سے پاگلوں کی طرح تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں، تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" وہ نہیں جانتا اسے کیا ہوا تھا مگر وہ چیخ اٹھا تھا، وہ اسے اٹھا کر پٹخ دینا چاہتا تھا۔ بے رونق زرد آنکھیں پھیلائے وہ چند لمحوں تک اس کی آنکھوں میں چھلکتے غصے اور تیرتی نمی کو دیکھتی رہی تھی، اس کے سوکھے لب بھنچ گئے تھے، اگلے ہی پل وہ ایک جھٹکے سے اسے پرے ہٹا چکی تھی، ایک پل کو وہ شدید بے یقینی سے اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں اپنے لئے اجنبیت کو دیکھتا رہا تھا۔

"مجھے بتاؤ... تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اس بار وہ بولا تو لہجہ مدہم تھا۔

"اپنی موت کا انتظار..." اس کا برف جیسا یخ لہجہ شمویئل کو دنگ کر گیا تھا۔

"مگر کیوں...؟"

"کیونکہ یہی ایک ایسا کام ہے جس کے لئے مجھے دھکے، ٹھوکریں نہیں کھانی پڑیں گی، اور نہ ہی ذلت اٹھانی پڑے گی"۔ اس کے لرزتے سرد لہجے پر وہ بس ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، جس نے چمڑے کے ایک بیگ کو آتش دان کے قریب کیا تھا اور پھر اس پر سر رکھتی گٹھڑی بنی لیٹ گئی تھی۔

شمویئل کو وہ ایک لاش کی طرح نظر آ رہی تھی، اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

"طوفان رکنے کے بعد تم چلے جانا، اگر تم نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا، میں اپنی موت کا انتظار نہیں کروں گی، میری خودکشی کے ذمہ دار تم ہو گے، آج یا کل مجھے مرنا تو ہے، کھا لینا میری لاش کو ورنہ چھوڑ دینا بھوکے بھیڑیوں کے لئے"۔ بند آنکھوں کے ساتھ وہ کپکپاتی آواز میں بولی تھی اور چہرہ بازوؤں کی قینچی میں چھپا لیا تھا، سناٹے میں گھرا وہ اس کی گھٹی گھٹی کھانسی کی آوازیں سن رہا تھا، کیبن کی چھت سے درختوں کی ٹکراتی شاخوں کا شور گونج رہا تھا، باہر طوفان غضب ناک رخ اختیار کر گیا تھا۔

لکڑی کے فرش پر سکڑ کر لیٹی وہ گھٹی گھٹی کھانسی کے ساتھ کانپ بھی رہی تھی، اس کی طرف ایک نگاہ دیکھنے کے لیے بھی تیار نہیں تھی، جس کے دل و دماغ میں بھونچال اٹھ رہے تھے۔

"ساشا! مجھے بتاؤ، تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم کیوں مجھے پہچانتے ہوئے بھی نہیں پہچاننا چاہتیں؟" سوال کرتے ہوئے وہ رکا تھا، اسے ایک بار پھر کھانسی کا دورہ اٹھا تھا، شمویئل سرعت سے بیگ سے پانی کی بوتل نکالتا اس کی طرف گیا تھا۔

"پانی پی لو۔"

"مت آؤ میری موت کے راستے میں"۔ چہرہ بازوؤں میں چھپائے وہ چیخی تھی۔

"تم کیوں مرنا چاہتی ہو؟" چند لمحوں بعد شمویئل نے سوال کیا مگر اس نے جیسے سنا ہی نہ تھا۔

"اگر تم مرنا چاہتی ہو تو مجھے خودکشی سے کیوں روکا تھا تم نے؟ کیوں اپنی سنہری باتوں میں الجھا کر مجھے موت کے راستے سے بھٹکایا تھا؟" وہ بجھے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"میں تمہیں نہیں جانتی، اب اپنا منہ بند کر لو"۔ چہرے سے ہاتھ ہٹائے بغیر وہ غرائی تھی، یکدم شمویئل کو اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوا تھا، آخر وہ بھی تو اسی مرحلے سے گزرا تھا، جس میں موت اور مرنے کے علاوہ کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا، اس وقت بہت ضبط اور نرمی کے مظاہرے کی ضرورت تھی۔

''ساشا! تم نے مجھے دوست کہا تھا مگر سمجھا نہیں، لیکن میں نے تمہاری ہر بات مانی تھی، تم نے مجھے یقین دیا تھا کہ تم میرے ساتھ ہو... کیا تمہیں یاد ہے کہ ہمارے درمیان تین ماہ پہلے ایک عہد ہوا تھا، ایک مقابلہ بھی؟ تمہیں یاد ہے کہ آج فیصلے کی تاریخ تھی، تین ماہ پہلے ہم جدا ہوئے تھے آج کے دن ملنے کے لئے؟'' وہ اسے بولنے پر اُکسا رہا تھا مگر وہ بس چہرہ چھپائے ٹھنڈ سے ٹھٹھر رہی تھی۔

''کیا تم نہیں جاننا چاہو گی کہ تین ماہ میں، میں نے کیا، کیا کامیابیاں حاصل کی ہیں تمہارے لئے؟ میں کتنا خوش تھا یہاں آتے ہوئے کہ تم سے ملوں گا، بہت ساری باتیں کرنی تھیں تم سے اور...''

یکدم وہ خاموش ہوا تھا کہ ساشا ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی مگر وہ شموئیل کی طرف متوجہ نہیں تھی، کانپتے ہاتھوں سے اس نے اپنے بیگ سے کوئی چیز نکالی تھی اور شموئیل کی جانب پھینک دی تھی، وہ چیز اس کے سینے سے ٹکرائی اب نیچے پڑی تھی، خاموشی سے وہ اسے دیکھتا رہا تھا، جو ایک بار پھر بیگ پر سر رکھتی گٹھڑی بن چکی تھی، گہری سانس لے کر شموئیل نے اپنی رسٹ واچ اٹھائی تھی۔

''تم میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کر رہی ہو ساشا! میں یہاں تک صرف تمہارے لئے آیا تھا، تم کہیں نظر نہ آئیں تو میں پاگلوں کی طرح تمہارا نام لے کر چیخ رہا تھا، پکار رہا تھا تمہیں، یہ طوفان بھی مجھے واپس چلے جانے پر مجبور نہیں کر سکا، کیونکہ میرے دل کو یقین تھا کہ تم یہاں ہو، میں تمہیں ڈھونڈ لوں گا''۔

وہ تھکے تھکے لہجے میں بولتا اس کے لاغر وجود کو دیکھ رہا تھا کو جو ہر تھوڑی دیر بعد کھانس رہی تھی، شموئیل کا دل اس کی حالت پر پگھل رہا تھا جو بات تک کرنے کے لیے تیار نہیں تھی، تب ہی اسے دیکھتے ہوئے شموئیل کچھ چونکا تھا، ساشا کے سر پر وہی اونی اسکارف تھا، اس کے وجود پر وہی کوٹ تھا جو پہلی ملاقات میں اس نے زیب تن کیا ہوا تھا، اس کے جوتے بدرنگے اور مٹی دھول سے اٹے ہوئے تھے، شموئیل کی دنگ نظریں تیزی سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں، اسے دیکھ کر اندازہ لگانا اب مشکل نہیں تھا کہ اس نے کئی دنوں سے کوئی بہتر خوراک نہیں لی ہے، وہ فاقہ زدہ دکھائی دے رہی تھی، اس کے کمزور وجود پر موجود لباس بوسیدہ تھا جو اسے برفانی ہواؤں سے بچائے رکھنے کے لیے ناکافی تھا، وہ کون کون سی صعوبتیں اٹھاتی رہی ہے اور کیوں؟ یہ پوچھنے کیلئے شموئیل کو اس کی تاکید بھلا کر اس کے قریب جانا پڑا تھا، اس سے پہلے کہ وہ پھر کر مزاحمت کرتی شموئیل نے سرعت سے اس کے ہاتھ پکڑ کر روک لئے تھے۔

''جو پوچھ رہا ہوں، اس کا جواب دے دو، اس کے بعد میں تمہیں تنگ نہیں کروں گا، جواب نہیں دو گی تو ہاتھ نہیں چھوڑوں گا''۔ اس کے قطعی لہجے پر ساشا نے چند لحوں تک اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کی تھی مگر پھر ناکام ہو کر شعلہ بار نظروں سے اس کے چہرے کو گھورنے لگی تھی۔

''تم یہاں کب آئیں تھیں؟ اتنے خراب موسم میں تم کیسے یہاں پہنچیں؟'' اس پر جھکا وہ جواب اس کی آنکھوں میں بھی ڈھونڈ رہا تھا مگر ساشا سختی سے لب بھینچے چہرہ دوسری طرف پھیر گئی تھی۔

''میں اب تمہارے منہ پر تھپڑ مارنے والا ہوں، جواب دو مجھے، کیا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے؟ میں گھنٹوں سے یہاں بھٹک رہا ہوں تمہارے لئے اور تم مجھے پہچاننے سے انکار کر رہی ہو''۔ اس کی ضد اور ڈھٹائی نے شموئیل کا ضبط ختم کیا تھا جو وہ اس پر چیخا تھا۔

''صرف گھنٹوں میں گھبرا گئے، میں یہاں کئی دنوں سے اپنی موت کے لیے بھٹک رہی ہوں''۔ ساشا کے سرد لرزتے لہجے پر وہ ساکت رہ گیا تھا۔ دوسری جانب وہ اس کی کمزور پڑتی گرفت سے ہاتھ چھڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

"میں تین ماہ سے یہیں موجود اپنی موت کے انتظار میں ہوں کیونکہ میں اس دنیا میں واپس نہیں جانا چاہتی جہاں ہر دوسرا مرد مجھ پر ہاتھ صاف کرنے کی نیت رکھتا ہے، میں ڈر گز نہیں لینا چاہتی، اسٹریٹ واکر نہیں بننا چاہتی، میرے لئے دولت حاصل کرنا مشکل نہیں مگر میں زمین پر قدم جمانے کے لیے گندگی میں نہیں اتر سکتی... تم جہاں سے آئے ہو، واپس چلے جاؤ، مجھے میرے راستے پر جانے دو"۔ بلند آواز میں چیختی وہ پھٹ پڑی تھی۔ شموئیل بس دنگ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، جو یک آتش دان سے دور ہٹائی اب کیبن کے وسط میں کھڑی بن چکی تھی۔

اس جگہ پر چند دن سے زیادہ قیام کرنا ناممکن تھا، یہ جگہ ایک جیتے جاگتے انسان کے لیے برف کا جہنم تو بن سکتی تھی مگر زندگی گزارنا یہاں اپنے آپ میں خودکشی کی جانب پہلا قدم تھا، وہ تین ماہ سے دن رات یہاں کس طرح سانس لے رہی تھی، شموئیل کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ اب تک زندہ کیسے تھی؟ پتہ نہیں کتنے لمحوں تک وہ اس لرزتے، کانپتے وجود کو تکتا رہا تھا، حالات سے مقابلہ کرتے کرتے یہ تھک کر ٹوٹ جانے والی کمزور لڑکی اپنی موت کا انتظار کرتی اس کی روح تک کو جھنجھوڑ گئی تھی۔

باہر جاری طوفان کی چنگھاڑیں کیبن کی خستہ حال دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں، ساکت بیٹھا وہ وقتاً فوقتاً ابھرتی کھانسی کی آوازوں کو سن رہا تھا، دل میں کوئی چیخ رہا تھا کہ وہ اسے اس طرح سسک سسک کر موت کے راستے پر جاتا نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اس کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا اس سے کہیں زیادہ جو وہ اس کے لیے کر چکی تھی، اب اس کی باری تھی، کچھ چونک کر سر اٹھاتا وہ کیبن کی چھت کو دیکھنے لگا تھا، چھت کو سپورٹ دینے کیلئے بھاری لکڑیاں نصب کی گئی تھیں، خطرہ بھانپنے میں اسے دیر ہو گئی تھی، تیز چرچراہٹ کے ساتھ لکڑیوں کو ایک کے پیچھے ایک نیچے کی طرف آتے دیکھ کر اس کے حواس اڑ گئے تھے۔

"ساشا..." حلق کے بل چیختا وہ برق رفتاری سے کسی چھلاوے کی طرح اس تک پہنچا تھا، شدید تکلیف سے وہ کراہ اٹھا تھا، بھاری لکڑیاں ایک کے بعد ایک اس کی پشت پر گرتیں ریڑھ کی ہڈی کو چٹخا رہی تھیں، دونوں ہاتھ اس کے ساکت وجود کے اطراف فرش پر جمائے وہ جھکا بمشکل ان وزنی لکڑیوں کا بوجھ سنبھالے ہوئے تھا، اور وہ جو ایک لمحہ پہلے موت کو اپنی طرف آتا دیکھ کر نجات کا سوچ رہی تھی، اب بے حس و حرکت گنگ نگاہوں سے اس کو تک رہی تھی جو اس کی ڈھال بنا ہوا تھا۔

"جلدی نکلو، میں اور نہیں روک سکوں گا"۔ وہ اذیت سے چیخا تھا۔

ساشا کے ساکت وجود میں حرکت ہوئی تھی، تیزی سے رینگتی وہ اس کے حصار سے نکلتی چلی گئی تھی۔ ایک جھٹکے سے لکڑیوں کے بوجھ سے نکلتا وہ دیوار سے جا ٹکرایا تھا، گہری گہری سانسیں بھرتے ہوئے شموئیل نے چھت کو دیکھا تھا، وہاں سپورٹ کے لیے اب بھی کچھ لکڑیاں اپنی جگہ پر قائم تھیں، مگر کوئی بھروسہ نہیں تھا، یہ جگہ محفوظ نہیں رہی تھی، دوسری نگاہ شموئیل نے اس پر ڈالی تھی جو سامنے ہی کیبن کی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔

"کتنا اچھا ہوتا اگر تم یہاں نہ ہوتے"۔ ساشا نے کانپتی آواز میں دیوار کا سہارا لے کر چلنا چاہا تھا مگر بری طرح لڑکھڑائی تھی، شموئیل سرعت سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

"ہٹ جاؤ میرے راستے سے"۔ ہانپتے ہوئے وہ اسے پرے دھکیل گئی تھی۔

"رک جاؤ ساشا!" شموئیل کی آواز پر وہ اور تیزی سے دروازے کی سمت بھاگی تھی، مگر اگلے ہی پل وہ منہ کے بل فرش پر بکھر گئی تھی، شموئیل نے اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھنے میں مدد دینی چاہی تھی، تب ہی

کھانسی کے ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ اس کے منہ سے خون کی بوچھاڑیں نکل کر فرش پر پھیل گئی تھیں، شموئیل کے ہوش ایک پل کے لیے اڑے تھے مگر اگلے ہی پل خود کو سنبھال کر اس نے دوبار ساشا کو اٹھانا چاہا تھا، مگر ایک بار پھر خون کا فوارہ فرش کو رنگ گیا تھا، بلند کراہوں کے ساتھ وہ بے دم ہو کر سر واپس فرش پر گرا گئی تھی، اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شموئیل نے بمشکل پہلے خود کو سنبھالا تھا اور پھر اس کے نیم جاں وجود کو اٹھا کر آتش دان کے قریب لے آیا تھا، زار و قطار روتے ہوئے وہ پانی کے چند گھونٹ ہی پی سکی تھی، اس کا وجود پتے کی طرح کانپ رہا تھا، شموئیل نے اپنا اونی سوئٹر اور گرم کوٹ بھی اس کے گرد لپیٹ دیا تھا، اپنے دستانے اور فر کی ٹوپی بھی اسے پہنا دی تھی۔ آتش دان کی دیوار سے پشت لگا کر بیٹھتے ہوئے شموئیل نے اس کا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا تھا۔

''ہمت مت ہارو، سب ٹھیک ہو جائے گا، تم بھول گئی تھیں مگر مجھے یاد ہے کہ میں تمہارے ساتھ تھا اور اب بھی ہوں، تم نے مجھے تنہا نہیں چھوڑا تھا پھر میں کیسے تمہیں تنہا چھوڑ سکتا ہوں''۔ مدھم آواز میں وہ اسے تسلی دے رہا تھا جو دھونکنی کی طرح چلتی سانسوں کے ساتھ سسک رہی تھی۔

''کیوں اتنی اذیت اٹھائی تم نے؟ مجھے ایک نئی امید دے کر خود کیوں مایوسی کے اندھیروں میں چلی گئیں؟ مجھے سمیٹ کر خود کیوں بکھر گئیں؟ تین ماہ اتنا طویل عرصہ تو نہیں ہوتا، میرے لئے تھوڑا سا اور حالات سے مقابلہ جاری رکھتیں، کیوں کیا تم نے ایسا؟'' اس کے سوالوں پر ساشا کی سسکیاں بڑھ گئی تھیں۔

''کیا ہوا تھا میرے جانے کے بعد؟ ایسا کیا ہوا تھا کہ تم یہیں کی ہو کر رہ گئیں، دنیا سے ہر تعلق توڑ لیا؟'' اس کا چہرہ اپنی طرف اٹھاتے ہوئے شموئیل نے اس کی جل تھل آنکھوں میں جھانکا تھا۔

☆..........☆..........☆

زناٹے دار تھپڑوں کی بارش نے اس کے وجود کو سن کر دیا تھا، کانوں تک وہ ذلت و اذیت سے سرخ ہو گئی تھی۔

''میں نے تمہیں شریف اور تنہا لڑکی سمجھ کر اپنی بچیوں کی دیکھ بھال کے لیے اپنے گھر میں جگہ دی، مگر تم تو اول درجے کی آوارہ اور بدکردار ثابت ہوئی ہو، مجھے پہلے ہی تم پر شک تھا، تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی میرے شوہر کو ہراساں کرنے کی، اسے میرے خلاف ورغلانے کی؟'' گال پر ہاتھ رکھے وہ ساکت نظروں سے اس خونخوار عورت کے عتاب کو دیکھ رہی تھی، جو اس پر چیختی چنگھاڑتی الزامات کی بارش کرتی دونوں چھوٹی بچیوں کے سامنے اسے زمین میں اتار رہی تھی۔

''اچھی طرح جانتی ہوں میں تم جیسی عورتوں کو جو نوکری کے بہانے گھروں میں جگہ بناتی ہیں اور پھر گھر کی مالکن بننے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتی ہیں، اب دیکھنا میں تمہارا کیا حشر کرتی ہوں، یہاں سے واپس جاتے ہی پولیس کو کال کروں گی ایسی رپورٹ بنواؤں گی کہ کسی شریف گھرانے میں تمہیں نوکری نہیں ملے گی، پھر بھی مجھے اپنی شکل بھی مت دکھانا''۔ مزید اس کے پرخچے اڑاتی وہ عورت پلٹ کر اپنے شوہر کی طرف متوجہ ہوئی تھی، جو اپنی سانپ جیسی چمکتی آنکھوں سے ساشا کو دیکھتا اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''مجھے اپنی بچیوں کے ساتھ فوراً یہاں سے جانا ہے، مگر یہ ہمارے ساتھ نہیں جائے گی، سامان سمیٹو اب، ہو گئی کیمپنگ''۔ اپنے شوہر کو ہدایت دے کر اس نے شعلہ بار نظروں سے ساشا کو دیکھا تھا اور پھر سہمی کھڑی بچیوں کو کھینچتی ہوئی کیمپ کے اندر چلی گئی تھی۔ سپاٹ نظروں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی جو

زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سامنے آ رکا تھا۔
"دیکھا تم نے اپنی ضد کا انجام، تم چاہتیں تو انجام کچھ اور بھی ہو سکتا تھا مگر... خیر، مجھے افسوس تو ہے لیکن میرا کوئی قصور نہیں، میں نے تمہیں بہت وقت دیا تھا، مگر تم نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا، ویسے ابھی ایک راستہ باقی ہے تمہارے لئے، اپنے فون کی بیٹری کے ختم ہونے تک کا وقت ہے تمہارے پاس، اس جگہ سے تم ایک دن میں نہیں نکل پاؤ گی، بس ایک فون یا میسیج بھی کافی ہو گا، ساری مشکلیں حل کر دوں گا تمہاری"۔ شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ اسے کچھ سمجھاتا وہ سامنے سے ہٹ گیا تھا۔
اپنا بیگ اٹھا کر جانے سے پہلے اس نے یہ کیا تھا کہ بھاری پتھر سے اپنے فون کے پرخچے اڑا دیئے تھے، بے سمت چلتے ہوئے اس کے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے، بہت فرمانبرداری کر لی تھی اس نے زندگی کی مگر آج جو ہوا وہ سب اسے باغی کر گیا تھا، آر یا پار، موت یا زندگی، اس کے علاوہ کوئی سوچ اس کے ذہن میں نہیں تھی، کہ اب پار اسے ہونا نہیں اور زندگی کی اب ضرورت نہیں۔

☆............☆............☆

باہر بے قابو طوفان کا شور دھیرے دھیرے کم ہوتا جا رہا تھا، کیبن کی چھت سے ٹکراتیں درختوں کی شاخیں ابھی بھی بپھری ہوئی تھیں..... مگر پتہ نہیں کیوں سکون و طمانیت کی لہریں شموئیل کو اپنے دل میں بکھرتی محسوس ہو رہی تھیں، اسے فخر تھا کہ ایک بلند اور مضبوط کردار ہستی اس کے ساتھ اس کے قریب ہے۔
"تم نے یہ نہیں سوچا کہ وہ اپنی بیوی بچوں کو گھر چھوڑ کر واپس اس جگہ آ سکتا تھا، تمہیں یہاں تلاش کر کے کوئی نقصان پہنچا سکتا تھا، ایسا نہ ہوتا تب بھی یہاں خطرناک جانور ہیں، میں جانتا ہوں، تمہیں اپنی زندگی کی پرواہ نہیں تھی مگر تم نے ایک بار بھی میرے بارے میں نہیں سوچا؟ میرا تو ایسا کوئی دن نہیں گزرا جس میں، میں نے تمہارے بارے میں نہ سوچا ہو، کیا ایک بار بھی تمہیں مجھ سے کیا گیا وعدہ یاد نہیں آیا تھا؟"
شموئیل کے سوالوں پر وہ بس خاموش تھی۔
"تمہیں یہ تو یاد ہو گا آج ہمارے درمیان مقابلے کا فیصلہ ہونا تھا؟"
"تین ماہ تک میں کس جہان میں تھی مجھے خود خبر نہیں، کب دن ہوتا، کب رات کچھ پتہ نہیں...، تمہیں یہاں دیکھنے کے بعد..." اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی، کھانسی کا ہلکا سا اٹیک دوبارہ اٹھا تھا۔
"پانی پیو..."
"نہیں"۔ وہ انکار کر گئی تھی۔
"فیصلہ تو ہو گیا، میں تمہارے لئے کوئی اچھی کامیابی حاصل نہیں کر سکی، جہاں تھی وہیں ہوں، تم جیت گئے میں ہار گئی"۔ وہ لرزتے لہجے میں بولی تھی۔
"نہیں، کامیابی تو وہ ہے جو تم نے حاصل کی ہے، شیطان کے شر سے دور رہ کر، دولت اور آسائش کو ٹھوکر مار کر تم نے اپنے آپ کو میرے لئے بچا کر رکھا ہے، تمہاری یہ ایک کامیابی میری ہر کامیابی پر بھاری ہے"۔ شموئیل کی بات ادھوری رہ گئی تھی، ساشا پر کھانسی کا بھیانک حملہ ہو چکا تھا۔

☆............☆............☆

رات موسلا دھار بارش کے بعد صبح کی یہ ہلکی ہلکی نرم دھوپ بہت خوبصورت لگ رہی تھی، ہر منظر رات بھر بارش میں دھل کر نکھر گیا تھا، نم چمکتی سڑک پر آتی جاتی گاڑیاں، اپنی اپنی منزل کی سمت جاتے لوگ، سب کچھ آنکھوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا، ان سب لوگوں کے درمیان وہ بھی تھی، اسکارف گردن میں ڈالے سفید براق سوئٹر کی پاکٹس میں ہاتھ اڑسے ہر طرف کا جائزہ لیتی حالانکہ فلیٹ سے اسٹور تک کا واکنگ ڈسٹینس 5 منٹ سے تھوڑا ہی زیادہ ہو گا، مگر

جس طرح وہ ہر شاپ کے سامنے رک کر ڈسپلے میں رکھی چیزوں کو بغور دیکھ رہی تھی لگتا نہیں تھا کہ اگلے 10 منٹ میں بھی اسٹور پہنچ سکے گی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ آج پھر لیٹ ہو چکی ہے، اس کے انداز میں کوئی عجلت نہیں تھی۔

ایک شاپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے ڈسپلے میں رکھی ایک جیکٹ نے اس کے قدم روک لیے تھے۔ آگے بڑھنے کے بجائے وہ فوراً شاپ میں داخل ہو گئی تھی۔

"ہیلو ساشا! کیسی ہو؟" کپڑے ہینگرز میں لٹکاتی عورت نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"ایک دم پرفیکٹ"۔ وہ مسکرائی تھی۔

"لگتا ہے آج پھر کسی جیکٹ پر دل آ گیا ہے تمہارا؟"

"ہاں، تم بالکل ٹھیک سمجھیں، اس پر جیکٹس بہت سوٹ کرتی ہیں اور یہ والی تو اور بھی زیادہ اچھی لگے گی"۔ مسکراتے ہوئے اس نے وہ ڈارک بلیو جینز کی جیکٹ بھی ڈمی پر سے اتار لی تھی۔

"بل اسٹور پر ہی بھیج دینا براہ مہربانی"۔ جیکٹ بازو پر ڈالے وہ جانے کے لیے پلٹی تھی۔

اسٹور کے باہر حسب معمول اس نے فلاور شاپ پر رک کر اپنا من پسند ریڈ روز اٹھا لیا تھا۔

"کام کیسا چل رہا ہے؟"

"بہت اچھا مگر آج باس کا موڈ بہت خراب ہے، صبح صبح لیٹ آنے پر مجھے بہت ڈانٹ پڑی ہے اور تم مجھ سے بھی زیادہ لیٹ آئی ہو"۔ سیلز مین نے اسے خبردار کیا تھا۔

"اس کا موڈ ہمیشہ خراب ہی رہتا ہے، اس کی ساری خوش اخلاقیاں بس کسٹمرز کے لیے ہی ہوتی ہیں"۔ لاپروائی سے بولتی وہ اسٹور کی جانب بڑھی تھی۔

دھیرے سے گلاس ڈور کھولتی وہ اندر داخل ہوئی تھی، سامنے ہی وہ شاپ پر کام کرنے والے لڑکے کے سر پر کھڑا سامان کے کاٹن ترتیب سے رکھوا رہا تھا، ایک ہی گاہک تھا جو کاؤنٹر سے اپنا سامان سمیٹ کر جانے ہی والا تھا، دبے قدموں وہ کاؤنٹر کی جانب بڑھی تھی۔

"ساشا! یہاں آؤ"۔ عقب سے ابھرتی آواز پر اس کے قدم رک گئے تھے، گہری سانس لے کر اس نے کاؤنٹر کے پیچھے موجود سیلز مین کو دیکھا تھا جو مسکراتے ہوئے دوبارہ بل بنانے میں مصروف ہو گیا تھا۔

رسٹ واچ میں وقت دیکھنے کے بعد اس نے اسٹور سے نکلتے گاہک کو دیکھا تھا اور پھر کافی ناگواری سے اس کی طرف متوجہ ہوا تھا جو ہدایت کے مطابق سامنے آ رکی تھی۔

"مجھے ایک بات بتاؤ، تم اس اسٹور میں کام کرنے آتی ہو یا تفریح کرنے؟ دو دن پہلے ہی میں نے تمہیں وقت کی پابندی نہ کرنے پر اسٹور سے فارغ کرنے کی بات کی تھی، مگر مجھے اسی دن تمہیں یہاں سے نکال دینا چاہیے تھا، آج دیر سے آنے کا کیا بہانہ ہے تمہارے پاس؟" غصیلی نظروں سے اسے دیکھتا وہ پوچھ رہا تھا۔

"وہ..." ایک پل کو رک کر ساشا نے اسے دیکھا تھا۔

"میری طبیعت صبح کچھ ٹھیک نہیں تھی"۔

"میں کسی دوسرے سیارے سے نہیں آیا ہوں، جو تم مجھے اپنی طبیعت ٹھیک نہ ہونے کی اطلاع دے رہی ہو"۔ اس کے سفید جھوٹ پر وہ بھڑک اٹھا تھا۔

"تمہارے روز روز کے بہانے میرے گلے تک آ چکے ہیں، یہاں کام کرنا ہے تو ڈسپلن سے ورنہ من مانی کی اجازت کسی کو نہیں دوں گا"۔ اس کا لیکچر جو شروع ہوا تو سب ہی لپیٹ میں آنے لگے تھے۔

"اب رکی کیوں ہو، جاؤ جا کر اپنا کام سنبھالو"۔

اس کے بری طرح جھڑکنے پر ساشا کا چہرہ خفت سے مزید سرخ ہو گیا تھا، اگلے ہی پل اس نے بازو میں لٹکی جیکٹ اس کے ہاتھوں میں تقریباً پٹخی تھی اور پھر کاٹن کو اٹھاتے لڑکے کو آواز دی تھی۔

''یہ لو پکڑو اسے''۔ غصیلے انداز میں ساشا نے ریڈ روز اس لڑکے کی سمت بڑھایا تھا جو حق دق رہ گیا تھا، مگر اس سے پہلے شموئیل نے وہ ریڈ روز ساشا سے چھیننے والے انداز میں لے لیا تھا۔

''اپنا کام کرو''۔ شموئیل کے گھرکنے پر وہ لڑکا فوراً پیچھے ہٹ گیا تھا جبکہ ساشا پہلے ہی بگڑے تیوروں کے ساتھ کاؤنٹر کی طرف آ گئی تھی۔

''تم ناشتے میں اسے کتنی مرچیں دیتی ہو؟'' سیلز مین نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا اور اسٹور کا مخصوص ایپرن اور کیپ اس کے حوالے کیا تھا۔

''اسی سے ہی کیوں نہیں پوچھ لیتے؟'' ایپرن باندھتی وہ خشمگیں لہجے میں بولی تھی۔

''او کے... او کے، اب تم اپنا موڈ ٹھیک کر لو ورنہ کسٹمرز کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش نہ آنے پر تمہارے ساتھ ساتھ مجھے بھی لیکچر سننا پڑے گا''۔ سیلز مین نے ہنستے ہوئے التجا کی تھی، تھوڑی دیر بعد وہ واقعی مسکراتے ہوئے کسٹمرز کو ڈیل کر رہی تھی، اس ٹائم رش بہت بڑھ جاتا تھا، سیلز مین کے ساتھ ساتھ وہ بھی گھن چکر بنی رہتی تھی، شموئیل فارغ ہوتا تو وہ بھی ان دونوں کی مدد کے لیے کاؤنٹر پر آ جاتا تھا، وارننگ کے باوجود وہ اسٹور میں کام کرنے اپنی مرضی کے وقت پر آتی تھی مگر شام ہوتے ہی اسے اسٹور سے جانا ہوتا تھا، پھر اس کی جگہ مستقل شموئیل کو سنبھالنی ہوتی تھی۔

کاؤنٹر کی طرف جو سامان ختم ہوا تھا، اسے لینے وہ گودام میں آئی تھی، کاٹن ہاتھوں میں سنبھالے وہ پلٹی تھی جب شموئیل اسے اپنی طرف آتا دکھائی دیا تھا۔

''سنو! میرے لئے جیکٹ لیتے ہوئے تم نے اس کی قیمت پر نظر ڈالنے کی زحمت کی تھی؟''

''تم نے اس کی قیمت دیکھ لی، کیا یہ کافی نہیں؟'' وہ تنے ہوئے چہرے کے ساتھ بولی تھی۔

''ہاں صرف دیکھنا کافی نہ تھا، مجھے اس کی قیمت ادا کرنی پڑی ہے، لیکن پھر بھی تمہارا شکریہ''۔

''اب سامنے سے ہٹو، مجھے جانا ہے''۔ خاطر میں لائے بغیر وہ بولی تھی۔

''تم نے لنچ کرنے سے انکار کیوں کیا؟''

''یہ سوال کرنے کی اب بھی ضرورت ہے؟'' وہ ناگواری سے بولی تھی۔

''غلطی تمہاری تھی، اور میرے لئے اسٹور پر کام کرنے والا ہر ملازم برابر ہے، نہ میں غیر ذمہ دار ہوں اور نہ غیر ذمہ داری برداشت کر سکتا ہوں، یہ تم جانتی ہو، اب ناراضی دور کرو، یہاں لنچ نہیں کرنا تو میرے ساتھ باہر کہیں لنچ کے لیے چلو''۔

''نہ مجھے کہیں جانا ہے، نہ تم سے کوئی بات کرنی ہے، سامنے سے ہٹو ورنہ یہ کاٹن تمہارے سر پر دے ماروں گی''۔ وہ بھڑک کر بولی تھی۔

''صبح میرے غصہ کرنے کا تو صرف ایک بہانہ ہے، ورنہ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے کیوں تنگ کر رہی ہو''۔ اسے راستہ دیتا وہ شکایتی لہجے میں بولا تھا۔

''جب جانتے ہو تو مانتے کیوں نہیں میری بات؟'' وہ جھلائی تھی۔

''کیونکہ نہ میں وہاں جانا چاہتا ہوں اور نہ تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا''۔

''یہ بات تم پہلے بھی کر چکے ہو اس لیے بور مت کرو اب''۔ ساشا نے فوراً اس کی بات کاٹی تھی۔

''اس ویک اینڈ پر تم مجھے وہاں لے جا رہے ہو بس''۔ قطعی لہجے میں اس نے فیصلہ سنایا تھا۔

''سیش...'' شموئیل کی جھلائی آواز ان سنی کیے وہ کاؤنٹر کی جانب بڑھتی اس وقت یکدم رکی تھی جب اسٹور میں داخل ہوتا شخص خود بھی اسے دیکھ کر دنگ سا ہوا تھا، ساشا کا چہرہ بس ایک پل کے لیے ہی

سفید ہوا تھا، مگر اگلے ہی پل وہ اپنی طرف بھاگتی بچیوں کی طرف متوجہ ہوگئی تھی، جن کے لیے آج بھی اس کے دل میں بے تحاشہ محبت موجود تھی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے دونوں بچیوں کو گلے سے لگا لیا تھا اور پھر نظر اٹھا کر شموئیل کو دیکھا تھا جس کے لیے یہ بچیاں اور ان کا باپ کسی تعارف کا محتاج نہیں تھے۔ لہٰذا اس شخص کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھانے میں شموئیل نے دیر نہیں کی تھی۔

"ساشا سے آپ سب کا اتنا ذکر سنا ہے کہ کسی تعارف کی ضرورت نہیں رہی"۔ بظاہر وہ مسکراتے ہوئے اس شخص سے مخاطب ہوا تھا ورنہ حقیقتاً وہ اس شخص سے ہاتھ ملانے کے بجائے اس کے منہ پر گھونسے رسید کرنا چاہتا تھا۔ جس ہستی کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، یہ شخص کس طرح اس ہستی کو ہراساں کر کے موت کی آرزو کرنے پر مجبور کر چکا تھا، بہت مشکل تھا اس کے لیے ساشا سے کیے گئے وعدے کو نبھانا، کم از کم اس وقت جب وہ شخص اس کے روبرو موجود تھا۔ شموئیل کی خوش اخلاقی اس کی آنکھوں کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی اور یقیناً اسی لئے اُس شخص کا چہرہ فق تھا، اس کے لیے یہ صورتحال بہت اچانک تھی۔ شموئیل کے لہجے میں ساشا کے لیے جو استحقاق تھا، وہ اس شخص کو اتنا الجھا گیا تھا کہ کچھ بول بھی نہیں سکا تھا، شموئیل نے اس شخص کی نظروں کے تعاقب میں ایک نظر ساشا کو دیکھا تھا جو بچیوں سے باتیں کرتے ہوئے ان کو چاکلیٹس دے رہی تھی، وہ واقعی بچیوں سے مل کر بہت خوش تھی۔

"ساشا آپ کی بیٹیوں سے بہت پیار کرتی ہے، بہت خوبصورت بچیاں ہیں آپ کی"۔ شموئیل کی چبھتی نظروں نے اس شخص کو بوکھلاہٹ میں مبتلا کیا تھا۔

"وہ میری بچیوں پر بہت ہی مہربان رہی ہیں، وہ خود بہت اچھی خاتون ہیں"۔

"یہ بات میں زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں"۔ سرد لہجے میں شموئیل نے اس شخص کی بات کاٹی تھی، جبکہ وہ شخص اتنا گڑبڑایا کہ مزید کچھ کہے بغیر سامان کی لسٹ لگاتا سیلز مین کی طرف بڑھ گیا تھا، جب تک وہ کاؤنٹر پر رہا شموئیل وہیں رُکا اسے گھورتا رہا تھا۔ ساشا مستقل ہر طرف سے غافل بچیوں میں مگن تھی۔ اپنا سامان لے کر اس شخص نے غلطی سے بھی شموئیل یا ساشا کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کی تھی، عجلت میں اپنی بچیوں کو پکارتا وہ اسٹور کے گیٹ کی سمت بڑھ گیا تھا۔

بچیوں کو گیٹ تک ساشا خود چھوڑنے گئی تھی، جس وقت وہ واپس پلٹی چند گاہک ایک ساتھ ہی اسٹور میں آ گئے تھے، مگر شموئیل کے تاثرات دیکھنے کے بعد وہ اسے نظرانداز نہیں کر سکتی تھی۔

"تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کبھی اس شخص سے سامنا ہونے پر تم مشتعل ہرگز نہیں ہوگے"۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ساشا نے مدہم آواز میں یاد دلایا تھا۔

"تم مشتعل ہونے کی بات کر رہی ہو، میں انگاروں پر لوٹ رہا ہوں، میں اس آدمی کی گردن توڑنا چاہتا تھا"۔

"خود کو پریشان مت کرو اب، میں جانتی ہوں تم میرے لئے کتنے پوزیسو ہو"۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ساشا نے اس کے تنے چہرے کو دیکھا تھا جبکہ ناگواری سے سر جھٹکتے ہوئے شموئیل کی نظریں اسٹور میں داخل ہوتی شخصیت پر ساکت ہوگئی تھیں، کچھ حیرت کے ساتھ ساشا نے اس نازک اندام سی لڑکی کو دیکھا تھا جس کا چہرہ ریشمی لانبی زلفوں کے درمیان چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اگلے ہی پل ساشا بری طرح چونکی تھی جب اس نے شموئیل کو بے اختیاری سی کیفیت میں اس لڑکی کی جانب بڑھتے دیکھا تھا۔

"میں بتا نہیں سکتی کہ تمہیں اچانک اپنے

سامنے دیکھ کر میں کس قدر خوش ہوں، جانتے ہو میں کچھ دن سے تمہیں ڈھونڈ رہی تھی مگر ناکام رہی، مجھے لگا میں نے اپنے سب سے اچھے دوست کو کھو دیا ہے، آخر تم کہاں تھے؟" اس لڑکی کی چہکتی آواز ساشا تک پہنچ رہی تھی مگر وہ خود شمویئل کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے چھپ سی گئی تھی، ہونقوں کی طرح وہ شمویئل کی چوڑی پشت کو دیکھتی بہت آکورڈ سا فیل کر رہی تھی، جب سیلز مین نے اسے پکار لیا تھا، ناچار اسے کاؤنٹر کی طرف آنا پڑا تھا کیونکہ کسٹمرز کا رش بڑھنے لگا تھا۔

کسٹمرز سے ڈیل کرتے ہوئے وہ کافی بے چینی کے ساتھ انتظار کرتی رہی تھی کہ شمویئل ضرور اپنی دوست سے اسے ملوائے گا، مگر ایسا نہیں ہوا تھا، کچھ دیر بعد ساشا نے دیکھا وہ دونوں اسٹور سے نکلتے سڑک کی طرف جا رہے تھے، وہ بالکل سناٹے میں رہ گئی تھی، رگوں میں لہو ابلنے لگا تھا۔ دو گھنٹے اس نے کانٹوں پر گزارے تھے، جس وقت شمویئل واپس آیا بالکل نارمل نظر آ رہا تھا جبکہ ساشا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ دیتی مگر اس وقت وہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی لہٰذا اس نے فوراً ہی اسٹور سے جانے کا اعلان کر دیا تھا۔

"تم وقت سے پہلے جا رہی ہو، میرا منہ بند کرنے کیلئے کوئی بہانہ ہی کر دو"۔ شمویئل نے کچھ ناراضی سے اسے دیکھا تھا۔

"مجھے یہاں سے جانے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت نہیں، اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ میں تمہاری محتاج ہوں"۔ مدہم آواز میں غراتی وہ اسے دنگ کر گئی تھی اور پھر تیز نظروں سے اسے دیکھتی سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

"سیش! دو منٹ رکو، میں تمہیں گھر تک چھوڑ آتا ہوں"۔ اسٹور کے باہر شمویئل نے اس کا راستہ روکا تھا۔

"نہیں"۔ ساشا نے غضیلی نظروں سے دیکھا تھا۔

"کیا مطلب، نہیں...؟" وہ حیران پریشان ہوا تھا۔

"نہیں کا مطلب ہے نہیں، نہیں، نہیں"۔ حلق کے بل چیختے ہوئے ساشا نے ایک جھٹکے سے اسے سامنے سے ہٹایا تھا اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی تھی۔

☆............☆............☆

سرخ رنگ کی ہلکی پھلکی سی نائٹی میں ملبوس وہ آئینے کے سامنے آ بیٹھی تھی، بالوں میں برش پھیرتے ہوئے وہ مستقل اپنے غصے کو کم کرنے کی کوشش اس لئے بھی کر رہی تھی کہ وہ نہیں چاہتی تھی شمویئل ساری رات گھر کے باہر گزار دے، ازدواجی زندگی کی یہ پہلی جھڑپ کافی شدید قسم کی اس لئے بھی ثابت ہو رہی تھی کہ یہ ایک خاموش جھڑپ تھی، کم از کم ساشا کی طرف سے تو مکمل خاموشی تھی۔ شمویئل کی کوشش کے باوجود نہ وہ اس سے بات کر رہی تھی نہ ہی وہ اس کی کوئی بات سننے کے لیے تیار تھی۔ آج کا عجیب دن اور اتفاقات، سب کچھ کافی حیران کن تھا، ایسا نہیں تھا کہ شمویئل کو اس کی ناراضی کی وجہ معلوم نہیں تھی اور وجہ تو صاف صاف ساشا کے چہرے پر اس وقت بھی نظر آ رہی تھی جب وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ اسٹور سے نکلی تھی۔ ساشا اسے کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر اسے نظرانداز کئے جا رہی تھی، ضبط ختم ہوا تو غصے میں وہ بھی گھر سے باہر چلا گیا تھا۔

بالوں کو ہیئر بینڈ میں قید کرتے ہوئے اس کے کانوں سے پھر ایک آواز ٹکرائی تھی، ایک پل کو رک کر اس نے گہری سانس لی تھی اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیڈروم کی کھڑکی کی سمت آ گئی تھی۔

باہر گہری رات کا سناٹا تھا، کھمبے کے پاس ہی وہ اسے ٹہلتا دکھائی دیا تھا، لب بھینچے وہ اسے دیکھتی رہی

تھی جو سگریٹ کا بچا ہوا ٹکڑا ایک طرف اچھالنے کے بعد واپس کھمبے کی طرف آیا تھا اور ایک بار پھر ایسی زوردار ٹھوکر ماری تھی کہ کھمبا جھنجھنا اٹھا تھا۔

"اب کھمبے پر لاتیں برساتے رہو گے یا اوپر بھی آؤ گے؟" ساشا کی غصیلی آواز پر اس نے سر اٹھایا تھا مگر تب تک وہ پردہ چھوڑ کر کھڑکی سے ہٹ گئی تھی۔

ناخنوں کی تراش خراش کرتے ساشا نے بس ایک نگاہ اس پر ڈالی تھی جو کمرے میں داخل ہوتا شکایتی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"اُکھاڑ آئے کھمبا؟" اس کے سرد لہجے نے شیموئیل کو سلگا دیا تھا۔

"اگر مزید کچھ دیر تم مجھ سے لاتعلق رہتیں تو اکھاڑ دیتا"۔

"اب اندازہ ہوا تمہیں کہ لاتعلقی اور نظرانداز کر دینے کی تکلیف کیا ہوتی ہے"۔ سرعت سے اٹھ کر اس کے مقابل آتی وہ چبھتے لہجے میں بولی تھی۔

"مجھے بھی تکلیف ہوئی تھی اس وقت جب تم سب کچھ بھلائے اس ڈائن کے پیچھے پیچھے چلے گئے تھے، تم تو خوشی سے پاگل ہوا ٹھے ہو گے کہ تمہاری سابقہ ناکام محبت تمہیں ڈھونڈتے ہوئے تم تک آ پہنچی ہے، ویسے اسے دیکھنے کے بعد مجھے پتہ چل گیا کہ اس کی بے وفائی کے تم نے تمہیں کیوں خودکشی کے لیے تیار کر دیا تھا"۔

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم میری نیت پر شک کر رہی ہو، میں ماضی کی غلطیوں کو دوبارہ کیسے دہرا سکتا ہوں ساشا! مجھے اپنا حال اور مستقبل عزیز ہے کیونکہ ان میں تم میرے ساتھ ہو، تم سے پہلے اور نہ ہی تمہارے بعد کوئی ایسا چہرہ رہا ہے جسے میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوں"۔

"تو پھر وہ سب کیا تھا جو آج ہوا ہے؟" ساشا نے اس کی بات کاٹی تھی۔

"میں جب سے گھر آیا ہوں، تم سے اسی بارے میں بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر تم کچھ کہنے سننے کے لیے تیار نہیں تھیں"۔ گہری سانس لے کر شیموئیل نے اس کے ناراض چہرے کو دیکھا تھا اور پھر اسے شانوں سے تھام کر قریب کر لیا تھا۔

"اس عورت کا آج مجھ سے ملنا، میرے لئے بالکل ایسا تھا جیسے کوئی پرانا دوست اچانک سرِ راہ مل جائے، اگر مجھے موقع ملتا تو میں ضرور اسے تمہارے پاس لاتا، تمہارا تعارف اس سے کرواتے ہوئے مجھے بہت فخر محسوس ہوتا اور مجھے فخر کرنا بھی چاہیے۔ دراصل وہ بہت عجلت میں تھی اور مجھ سے اپنی پریشانیوں کا تذکرہ کرنا چاہتی تھی، اسٹور میں رک کر وہ ان معاملات پر بات نہیں کر سکتی تھی، میری غلطی یہ تھی کہ میں اسے انکار نہیں کر سکا، ایک دوست اور شناسا کی حیثیت سے وہ اگر آئندہ کبھی بھی اپنا کوئی مسئلہ لے کر میرے پاس آئی تو میں آگے بھی انکار نہیں کر سکوں گا، لیکن آگے میں تمہیں اعتماد میں لے کر ہی کوئی قدم اٹھاؤں گا، جو آج ہوا وہ آئندہ کبھی نہیں ہو گا"۔

"مسائل اور پریشانیاں شیئر کرنے کے لیے صرف تم ہی کیوں؟" ساشا نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"شاید... اسے اب احساس ہوا ہو کہ میں اس کے ساتھ مخلص تھا، وہ مجھ سے ہی اتنی ذاتی باتیں کر سکتی ہے"۔

"وہ مسائل، پریشانیاں اور ذاتی باتیں تم مجھے بتانا پسند کرو گے؟"

"اس کی شادی شدہ زندگی کافی حد تک بگڑ چکی ہے، وہ اپنے شوہر سے ناخوش ہے، ہر دن کے لڑائی جھگڑوں سے بیزار ہو کر وہ اب اپنے شوہر سے الگ ہونا چاہتی ہے"۔

"پھر تم نے اسے کیا مشورہ دیا؟"

"اس کی ساری باتیں سننے کے بعد مجھے معلوم ہوا

کہ ساری غلطی اس کے شوہر کی نہیں ہے، میں نے اسے کافی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ کسی بھی طرح اپنی شادی کو نہ توڑے، مگر وہ میرے اس مشورے سے خوش بالکل نہیں تھی"۔

"ظاہر ہے وہ اس قسم کے مشورے لینے تمہارے پاس آئی بھی نہیں تھی"۔ ساشا نخوت سے بولی تھی۔

"کیا مطلب؟" شموئیل نے جس طرح چونک کر پوچھا تھا، ساشا کو وہ اول درجے کا احمق دکھائی دیا تھا۔

"مطلب کو جہنم میں بھیجو، تم نے اسے میرے بارے میں بتایا؟"

"ہاں، کافی دیر تک تو اسے یقین ہی نہیں آیا تھا"۔ اس کے سادہ سے لہجے پر ساشا کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"تمہاری ناراضی نے مجھے بہت ڈسٹرب کر دیا تھا، اب اگر تم نے مجھ سے بات کرنا ختم کیا تو میں پاگل ہو جاؤں گا، تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ میری زندگی کا سب سے اہم مقصد اور وجہ تم ہو"۔

"میں یہ کبھی بھول بھی نہیں سکتی"۔ ساشا نے مسکراتے ہوئے اس کے گریبان پر ہاتھ رکھے تھے۔

"ایسا نہیں ہے کہ مجھے تمہاری نیت پر شک ہوا تھا، مجھے خود سے زیادہ تم پر بھروسہ ہے مگر سچ یہ ہے کہ تم بہت معصوم اور سادہ ہو، تمہیں کوئی بھی عورت بہت آسانی سے بے وقوف بنا سکتی ہے"۔

"ہاں، یہ تو ہے"۔ وہ فوراً بولا تھا جبکہ ساشا بری طرح چونک کر اسے گھورنے لگی تھی جو بالوں پر ہاتھ پھیرتا بمشکل مسکراہٹ چھپا سکا تھا۔

☆......☆......☆

بہت اچانک اس کی آنکھیں کھلی تھیں، سر کو حرکت دیئے بغیر اس نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی تھی، چند لمحوں تک وہ نیم تاریکی میں بوسیدہ دیواروں کو تکتا رہا تھا، دل، دماغ بالکل خالی تھے، اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ وہ کس جگہ موجود ہے، جانے اس پوزیشن میں وہ کب سے بیٹھا تھا کہ سارا جسم اس تاریک اور یخ بستہ ماحول میں اکڑ چکا تھا، اپنے سن وجود کو ذرا حرکت دیتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کا ذہن بیدار ہونے لگا تھا، اس نے بغور تاریکی میں چیزوں کو پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ آتش دان میں بس چنگاریاں سلگ رہی تھیں، اگلے ہی لمحے اس کی نظریں ایک ساکت بکھرے وجود پر جم گئی تھیں، ایک جھٹکا سا اسے لگا تھا۔ ایک طویل خوبصورت خواب سے واپس اس کے حواس حقیقت کی دنیا میں اسے کھینچ لائے تھے، اب کسی طوفان کا شور کیبن کی بوسیدہ دیواروں سے نہیں ٹکرا رہا تھا، موت جیسے سناٹے میں اسے صرف اپنی سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی، دماغ میں بس ایک ہی نام گونج رہا تھا، قریب ہی اس بے حس و حرکت پڑے وجود کو تکتے ہوئے اسے یاد آیا تھا کہ کئی بار پکارنے کے باوجود وہ بالکل خاموش اور ساکت تھی، خوف کا غلبہ اس پر طاری ہو گیا تھا، وہ خود میں ہمت نہیں پاتا تھا کسی بھیانک حقیقت کا سامنا کرنے کی۔ اسے یاد تھا رات میں طوفان کا زور قدرے کم ہوا تھا مگر وہ تھما نہیں تھا، ایسے میں کسی مدد کی تلاش یا اپنی مدد آپ... سب لاحاصل تھا، اسے یاد تھا، ساشا کی خاموشی اور بے حس و حرکت وجود نے اسے بھی پتھرا دیا تھا، ہڈیوں کو کڑکڑا دینے والی ٹھنڈ سے بھی وہ لاتعلق بس آنے والے وقت کے لیے خود کو تیار کرنے کی کوشش میں تھا، نیند کب اس پر غالب آئی وہ نہیں جانتا تھا۔

ایک بار پھر ہمت کر کے اس نے ساشا کو پکارا تھا مگر کوئی جواب اب بھی نہیں آیا تھا، اسے یاد تھا، رات میں کھانسی کے حملے کے دوران ساشا نے اس کے گھٹنے سے سر ہٹا لیا تھا، جس پوزیشن میں شموئیل نے آخری بار اسے دیکھا تھا وہ اب بھی اسی پوزیشن میں نظر آ رہی تھی، ایک ایک لمحہ قیامت لگ رہا تھا، وہ اسے جھنجوڑ کر اٹھانا چاہتا تھا مگر حقیقتاً اس کی جانب

ہاتھ بڑھاتے ہوئے شموئیل کے ہاتھ انجانے خوف کے تحت کانپ رہے تھے، اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا، بمشکل وہ اپنے پیروں پر اٹھا تھا، نظریں اس کے ساکت وجود پر جمائے وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹتا چلا گیا تھا، کیبن کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کا ہاتھ بدستور کانپ رہا تھا، وحشت سے دل حلق میں آ رہا تھا، اس نے پہلے اپنے باپ اور پھر ماں کو موت کی آغوش میں جاتے دیکھا تھا، ان کے چہروں پر وہ موت کی اذیت دیکھ چکا تھا، اور اب اس مقام پر جبکہ وہ اپنی منزل کے انتہائی قریب تھا، اگر ایک بار پھر موت کے سیاہ شکنجے نے اس سے زندہ رہنے کا یہ ایک مقصد بھی چھین لیا، یہ آخری سیڑھی بھی گر گئی تو وہ جانتا تھا وہ کبھی نارمل نہیں ہو سکے گا، شاید زندہ بھی نہ رہ سکے گا، وہ بہت مایوس تھا، شدید مایوس، بے حس و حرکت اس وجود کی جانب وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا، کوئی کیسے اپنے ہی وجود کو قبر میں دھکیل سکتا ہے؟ مگر اسے یہ کام کرنا تھا۔

کیبن کا دروازہ کھل چکا تھا، باہر طوفان کے گزر جانے کے بعد گہری خاموشی کا راج تھا، آسمان صاف تھا، ہر سمت برف کی دبیز چادر پھیلی ہوئی تھی، کھلتے دروازے سے اندر آتی تیز روشنی نے کیبن کی تاریکی کو مکمل ختم کر دیا تھا، دروازے کا سہارا لیے وہ بمشکل اپنے قدموں پر کھڑا کسی خوفزدہ سہمے بچے کی طرح سر جھکائے ہوئے تھا، اسے اپنی سزا کا سامنا کرنا تھا، برف کے جہنم میں وہ پسینے میں شرابور ہو چکا تھا، وہ جانتا تھا سب کچھ ختم ہو چکا ہے، اسے خود سے نفرت ہو چکی تھی، وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکا تھا اس ہستی کے لیے جس کے ساتھ رات بھر وہ ایک خوبصورت خواب میں جیتا رہا تھا، وہ خوابوں اور حسرتوں میں ہی جینے کیلئے اس دنیا میں آیا تھا، کل رات وہ آخری خواب اس کی آنکھوں میں اُترا تھا، اس ایک خواب میں اس نے اپنی پوری زندگی جی لی تھی، اب اس لمحے وہ بستر مرگ پر پڑے ایک ضعیف العمر وجود کی طرح لاغر اور بے بس تھا، انسان پیدا ہونے کے بعد اس دنیا میں جگہ اور مقام بنانے کے لیے سختیاں جھیلتا ہے، روپیہ، مکان، کامیابی حاصل کر کے سمجھتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کا حق ادا کر دیا ہے... اور پھر بس ایک ٹھوکر کافی ہوتی ہے اس خوش فہمی سے باہر آنے کے لیے، ایک ساتھ کئی گرم قطرے اس کی آنکھوں سے گرتے لکڑی کے خستہ حال فرش پر غائب ہو گئے تھے، اس کی بھی ساری جدوجہد اور کامیابیاں بے معنی ہو چکی تھیں، معنی تو وہ ہستی رکھتی تھی جس کے لیے اس نے کامیابیاں حاصل کی تھیں، دل کی بڑھتی اذیت اسے کراہنے پر مجبور کر چکی تھی جب ایک آہٹ نے اس کی سانسیں روک دی تھیں، ایک پل کو وہ ساکت رہا تھا مگر پھر ایک جھٹکے سے سر اٹھایا تھا، دھندلائی نظریں اس پر جم گئی تھیں جو اپنے نحیف وجود کو سمیٹتی اٹھ بیٹھی تھی، شموئیل کی آنکھوں کے سامنے پھر کوئی خواب چل رہا تھا یا پھر ایک اور دھوکہ۔

”تم جا رہے ہو؟“ مدہم کمزور سی آواز شموئیل کے سکتے کو نہیں توڑ سکی تھی۔

”کل رات کئی دن بعد میں اتنی بے خبر اور گہری نیند سوئی تھی، تمہاری آواز مجھے سنائی دے رہی تھی، مگر میں بس سونا چاہتی تھی“۔ ایک بار پھر کانوں سے ٹکراتی آواز نے شموئیل کو زمین و آسمان کے درمیان معلق کر دیا تھا، ساکت نظروں سے فرش پر بیٹھی ساشا کو دیکھتے ہوئے اس کا چہرہ بھیگ گیا تھا، وہ اور کیا بول رہی ہے، اس بار اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا، بغیر پلک جھپکائے اسے تکتا وہ بمشکل اپنے قدموں کو اس کی جانب کھینچ رہا تھا۔

”ابھی موسم ٹھیک ہے، تمہیں اب جانا چاہیے“۔ ساشا کی آواز حلق میں گھٹ گئی تھی۔ الجھی نظروں سے وہ اس کی سرخ آنکھوں میں دیکھ رہی تھی، جو گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا تھا، شدت ضبط سے اس کی

گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں، چہرہ انگارہ ہو رہا تھا۔

"ہاں، میں اب جانا چاہتا ہوں، خواب کے ہر لمحے کو حقیقت میں بدلنے کے لیے"۔ اس کے لرزتے بھاری لہجے نے ساشا کو گنگ کر دیا تھا، ساکت نظروں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی جو اس کے ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگا رہا تھا، عورت کے آنسو مرد کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیتے ہیں، لیکن ایک مرد کے آنسو عورت کو کس حد تک کمزور کر سکتے ہیں، وہ اب یہ جان چکی تھی۔

☆............☆............☆

کیمپ لگانے کے لیے وہ پتھر کے ذریعے ایک مضبوط لکڑی کو بھربھری زمین میں گاڑ رہا تھا، جب اسے اپنے قریب کوئی چیز حرکت کرتی محسوس ہوئی تھی، ایک بہت صحت مند سا خرگوش زمین کو سونگھتا ہوا اس کے پیروں کے نزدیک آ چکا تھا، ہڑبڑا کر اٹھتا وہ دور ہو گیا تھا۔

"ساشا! میں یہاں کیمپ نہیں لگا سکتا"۔ جھلائے انداز میں وہ اسے بتا رہا تھا جو ان سنی کر گئی تھی۔

"سیش! میں تم سے بات کر رہا ہوں، تم سن رہی ہو؟" جوتے سے اس خرگوش کو پیچھے دھکیلتا وہ تقریباً چلایا تھا اور پتھر ایک طرف پھینکتا تیز قدموں سے اس کی جانب بڑھ گیا تھا، جو یخ بستہ پانی کے چھوٹے سے تالاب کے کنارے سے ذرا ہٹ کر نرم گھاس پر اطمینان سے بیٹھی تھی، سرخ سرخ گاجروں کا ڈھیر اس کے سامنے رکھا تھا جو وہ اپنے ساتھ لے کر آئی تھی، ہر تھوڑی دیر بعد وہ گاجر تالاب کے دوسرے کنارے کی طرف اچھال رہی تھی جہاں خرگوشوں کا خاندان اچھل کود کر رہا تھا۔

"تمہیں یہ سب اچھا لگ رہا ہو گا مگر میں یہاں کچھ دیر کے لیے بھی ٹھہرنا نہیں چاہتا"۔ شدید ناراضی سے بولتا وہ اس کے قریب آ بیٹھا تھا۔

"شیموئیل! میری خوشی کے لیے جب تم یہاں آ ہی گئے ہو تو اپنے عمل سے بھی اس احسان کو ظاہر کرو، چھوٹی چھوٹی سی بات کو لے کر یہ اچھا وقت برباد نہ کرو، تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ یہاں آ کر تم مجھ سے کوئی بحث نہیں کرو گے"۔ سمجھانے والے انداز میں وہ اسے یاد بھی دلا رہی تھی۔

"مجھے بحث کرنے کا شوق نہیں ہے ساشا! مگر مجھے جانوروں کی اس نسل سے شدید وحشت ہے اور یہاں ان کی تعداد نے مجھے پریشان کر دیا ہے"۔ وہ کوفت سے بولا تھا۔

"یہ اتنے معصوم ہیں شیموئیل! تمہیں تو ان پر رحم کرنا چاہیے، یہاں ایسا سازگار موسم ان کے لیے بہت نایاب ہے، ورنہ برف کے طوفان ان کو بلوں سے نکلنے ہی نہیں دیتے، دیکھو، سب کتنے خوش ہیں، میں ان سب کو پہچانتی ہوں اور یہ مجھے کیونکہ میں نے کافی وقت ان کے ساتھ گزارا ہے"۔

"اسی لئے تمہیں مجھ سے زیادہ ان کی پرواہ ہے، میں ان سب سے واقعی اب جیلس ہو رہا ہوں"۔

"تم کب جیلس نہیں ہوتے؟ تمہارے اسٹور کے کسی کسٹمر سے اگر میں ایک سے دوبار مسکرا کر بات کر لوں تو یہ تک بھی تمہیں جیلس کر دیتا ہے"۔ ساشا نے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"مجھے یہ سچ قبول کرنے میں کوئی شرمندگی نہیں، لیکن پوزیسو تو تم بھی میرے لئے بہت ہو، اسی لئے تو گھر میں بور ہونے کا بہانہ کر کے روز اسٹور میں کام کرنے آ جاتی ہو، مگر مجھے پتہ ہے کہ تم مجھ پر نظر رکھنے آتی ہو کہ میں اسٹور پر آنے والی عورتوں سے کتنی خوش اخلاقی سے پیش آ رہا ہوں"۔ مسکراتے ہوئے شیموئیل نے اس کی چڑھتی ابرو کو دیکھا تھا۔

"تمہیں جو سمجھنا ہے سمجھو مگر سچ تو یہ ہے کہ میں اسٹور پر تمہاری مدد کرنے اس لئے آتی ہوں کہ کہیں تم اسٹور پر کسی سیلز گرل کو نہ رکھ لو، تاکہ تمہارا اور تمہارے ملازمین کا دل بھی خوب لگا رہے"۔ اس کے جلے کٹے

انداز پر وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔

"میں تم سے بھی یہ سننے کے لیے بے تاب تھا، مگر میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اسٹور میں کبھی کوئی سیلز گرل نہیں رکھوں گا، تمہیں مجھ پر اعتبار ہونا چاہیے"۔ اسے بازو کے گھیرے میں لیتا وہ بولا تھا۔

"اگر میں برا ہوتا تو کبھی تم جیسی نیک دل اور وفادار ساتھی زندگی بھر کے لیے میری نہ ہوتی"۔ اس کے ملائم بالوں کی خوشبو سانسوں میں اتارتا وہ بولا تھا۔

"مجھے تم پر مکمل اعتبار ہے مگر مجھے اسٹور پر تمہارے ساتھ کام کرنا اچھا لگتا ہے، تم جانتے ہو مجھے کتنی نوکریاں کرنی پڑی تھیں، کام کے بغیر میرا گزارہ مشکل تھا، اب مجھے تم نے اتنی آسائشیں مہیا کر دی ہیں کہ مجھے کام کرنے کی ضرورت نہیں، مگر مجھے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی عادت ہو چکی ہے"۔ وہ بولی تھی۔

"مگر میں چاہتا ہوں کہ اب تم اپنی اس عادت کو ترک کرنے کی کوشش کرو، کام کو خود پر سوار کرنے کے بجائے آرام کرو، میرے لیے اچھے کھانے بناؤ، مجھ پر توجہ دو، ویسے تمہارا کیا خیال ہے ہم چار پانچ بچے افورڈ تو کر سکتے ہیں؟" اس کے سوال پر ساشا نے جس طرح کرنٹ کھا کر اس کے شانے سے سر اٹھایا تھا، وہ کھل کر ہنستا پیچھے گھاس پر گرا تھا۔

"مجھے سمجھ نہیں آتا تمہیں ہر کام اتنی جلدی جلدی کیوں کرنا ہوتا ہے"۔ حیرت و خفگی سے وہ اس کے مسکراتے چہرے کو گھور رہی تھی۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے جب تم مجھے یہاں سے لے گئے تھے مجھ میں جان بھی باقی نہیں تھی، میں ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھی اور تم نے وہیں مجھے شادی کی رنگ پہنا دی تھی، اس بات کو چھ ماہ گزر چکے ہیں، مگر مجھے تمہاری جلد بازی پر آج بھی غصہ ہے، کم از کم میرے ہاسپٹل سے ڈسچارج ہونے کا تو انتظار کر لیتے"۔ ساشا کو اچانک ہی دل کا غبار نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

"مجھے بھی یاد ہے، ہاسپٹل میں اس وقت نرس نے میری درخواست پر ہماری ایک یادگار تصویر بھی اتاری تھی، جو کہ ہر وقت میرے والٹ میں موجود رہتی ہے، تم دیکھنا چاہو گی؟"

"ہرگز نہیں"۔ وہ چیخ اٹھی تھی۔

"میں اس تصویر کو دوبارہ کبھی نہیں دیکھنا چاہوں گی۔ اف... میں اس میں کس قدر بھیانک لگ رہی ہوں شموئیل! اگر تم ایک بار غور سے مجھے دیکھ لیتے تو شادی کی رنگ وہیں پھینک کر بھاگ جاتے"۔ صدمے سے بولتی وہ اس وقت ہول اٹھی تھی جب شموئیل نے اس کی گردن میں لپٹا اسکارف اپنی طرف کھینچا تھا، وہ کراہ اٹھی تھی جب سر نرم گھاس سے ٹکرایا تھا، جھنجلائی نظروں سے وہ اسے دیکھنے لگی تھی جو فوراً ہی اس کی جانب جھکا تھا۔

"ہاں، میں نے اس وقت تمہارا چہرہ نہیں دیکھا تھا، مگر اب تو دیکھ سکتا ہوں، بس تم چڑ چڑ مت کرنا"۔ اس کے معنی خیز لہجے پر وہ مسکرائی تھی۔

"میں چڑ چڑ نہیں کروں گی، لیکن اب اگر غور سے دیکھنے پر تمہیں مجھ میں کوئی کمی نظر آئی، تو میں تمہیں قتل کر دوں گی"۔ اس کے دھمکانے پر وہ مسکرایا تھا۔

"تمہیں قتل کیے بغیر بھی روح کھینچ لینا آتا ہے، تمہاری آنکھیں یہ کام بہت آسانی سے کرتی ہیں، ان آنکھوں کے علاوہ نہ میں نے پہلے کچھ دیکھنا چاہا تھا نہ اب کچھ اور دیکھنا چاہتا ہوں"۔ اس کے خوابناک لہجے اور لو دیتی نگاہوں نے ساشا کے چہرے کو سرخ کر دیا تھا، اس کی بند پلکوں کو لبوں میں جذب کرتا وہ اس وقت ہوش میں آ گیا جب کوئی چیز اس کی پشت سے ٹکرائی تھی، آنکھیں کھولتے ہوئے ساشا نے حیرت سے اسے دیکھا تھا جو اپنے عقب میں کچھ دیکھتا پیچھے ہوا تھا، قریب ہی اس موٹے تازے خرگوش نے اسے اس طرح ہڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور کیا تھا کہ ساشا بے ساختہ کھلکھلاتی ہوئی اٹھ بیٹھی تھی۔

"میں تمہیں پوری سنجیدگی سے بتا رہا ہوں کہ ان

خرگوشوں سے میری جان جاتی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کاکروچ سے ڈر کر تم میری جان عذاب میں ڈال دیتی ہو، میں اب چند منٹ بھی یہاں نہیں رکوں گا"۔ وہ بے طرح خراب موڈ میں فیصلہ سناتا وہاں سے گیا تھا۔

"ٹھیک ہے ہم یہاں سے سامان سمیٹ کر تمہاری پسند کی جگہ پر کیمپ لگاتے ہیں، مگر تم مجھے طعنہ دینے کا بہانہ مت ڈھونڈا کرو، کاکروچ سے ڈرنا دنیا کی ہر لڑکی کا حق ہے"۔ خفگی سے اسے جتاتی وہ اس کے پیچھے ہی جا رہی تھی۔

ملگجا اندھیرا ہر سمت چھانے لگا تھا، کھلے آسمان کی وسعتوں میں ٹمٹماتے ستارے بہت تیزی سے نمودار ہوتے جا رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ یخ بستہ خنکی بھی فضا میں ڈیرے جما چکی تھی۔ گرم دستانے ہاتھوں پر چڑھاتی وہ کیمپ سے نکل آئی تھی، سامنے ہی شموئیل آگ کے چھوٹے سے الاؤ کے گرد بیٹھا اس میں مزید لکڑیاں ڈال رہا تھا، آگ کی رنگ بدلتی روشنی میں وہ ساشا کو بہت اچھا لگا تھا، چند لمحوں تک وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

"تم تھکن محسوس کر رہی ہو شاید؟" اس کی جانب متوجہ ہوتا وہ بولا تھا۔

"نہیں، میں بہت اچھا محسوس کر رہی ہوں، کیونکہ اس وقت تمہارے لئے یہاں مجھ سے زیادہ اہم کچھ نہیں ہے، تمہارے کام بھی نہیں"۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ساشا نے اسے دیکھا تھا جو دھیرے سے ہنسا تھا۔

"اب یہ شکایت تو نہ کرو، زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے کام ضروری ہے، جبکہ زندہ رہنے کے لیے میرے لئے تمہاری ضرورت زیادہ اہم ہے"۔ ہاتھ جھاڑتا وہ آگ کے پاس سے اٹھ گیا تھا۔

"اب اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو، کیا میری بات پر یقین نہیں آیا؟" اس کی خاموشی پر وہ بولا تھا مگر اس وقت حیران ہوا تھا جب جواب دینے کے بجائے ساشا نے اس کے سینے سے سر لگا دیا تھا۔

"مجھے تمہاری ہر بات پر یقین ہے، تم بہت اچھے ہو، میرے لئے بہت اہم ہو مگر تمہاری طرح میں یہ سب لفظوں میں تمہیں نہیں سمجھا سکتی"۔ مضبوط بازوؤں کے حلقے میں وہ مدھم لہجے میں بولی تھی۔

"تمہیں لفظوں کی ضرورت نہیں ہے، میں جانتا ہوں جس طرح تم جانتی ہو کہ تم میرے لئے کیا ہو"۔ فر کی ٹوپی میں چھپے اس کے سر کو دھیرے سے تھپتھپاتا وہ بولا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں کیمپ میں چلنا چاہئے، باہر تو یہ ٹھنڈ برداشت سے باہر ہونے والی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم پر اس کا برا اثر ہو"۔

"مگر میں ابھی باہر کچھ دیر چہل قدمی کرنا چاہتی ہوں، انکار مت کرنا"۔ اس کے اصرار بھرے انداز پر شموئیل کو راضی ہونا پڑا تھا۔

آج بھی رات پورے چاند کی رات تھی اور اپنے جوبن پر تھی، حد نظر تک برف کی مہین سفید چادر بچھی تھی، دودھیا روشنی میں نہائے درخت ساکت کھڑے اس رات کے طلسم میں قید دکھائی دے رہے تھے، ہاتھ تھامے دھیرے دھیرے چلتے وہ دونوں آسمان کی جانب متوجہ تھے، جہاں جھلملاتے لاتعداد ستارے آنکھوں کو مبہوت کر رہے تھے۔

"دیکھو! یہاں سب کچھ کتنا حسین لگتا ہے، اب تو بتا دو کہ تم یہاں کیوں نہیں آنا چاہتے تھے؟" چلتے چلتے ساشا نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"کوئی خاص وجہ نہیں"۔

"مجھے ٹال رہے ہو؟" ساشا نے اس کی بات کاٹی تھی۔

"خاص نہ ہو مگر کوئی وجہ تو ہے، ورنہ تم نے اس سے پہلے کبھی میری کوئی بات ماننے سے انکار نہیں کیا تھا"۔ اس کے شکایتی لہجے پر شموئیل نے اسے دیکھا تھا۔

"شاید میرے اندر موجود خوف مجھے یہاں آنے سے روک رہا تھا، مجھے وہی رات یاد آجاتی ہے جب میں دوبارہ مایوسی کا شکار ہوتا کیبن تک پہنچا تھا، وہی طوفانی رات جب تمہاری حالت نے میرا دل بند کر دیا تھا اور تم موت کے انتظار میں کچھ سوچنے سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھیں، میں جب جب اس جگہ کے بارے میں سوچتا ہوں مجھے وہی بھیانک رات یاد آجاتی ہے، اس سچ سے قطع نظر کہ میں نے یہاں ایک بار نہیں دو بار تمہیں پایا تھا"۔ گہری سنجیدگی سے وہ بتا رہا تھا۔

"لیکن یہ بھی تو سچ ہے کہ اگر تم اس بھیانک رات کا سامنا نہ کرتے تو میں اس خوبصورت رات میں تمہارے ساتھ نہ ہوتی"۔ ساشا نے کہا تھا۔

"ہاں، یہ بات بھی قابل غور ہے"۔ وہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔

"کیا تم نے کبھی یہ سوچا کہ ہم اپنے بچوں کو یہ کیسے بتائیں گے کہ ہم کن حالات میں ملے تھے؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ساشا نے اچانک کہا تھا۔

"ان پر کیا اثر پڑے گا یہ جان کر کہ ان کے ماں باپ نے اپنی اپنی زندگی سے بیزار ہو کر کس طرح خود کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی، ہم کس طرح ان کو یہ تربیت دیں گے کہ حالات کی سختیوں سے تنگ آکر زندگی سے نفرت کرنا غلط ہے؟" وہ مدہم تشویش زدہ لہجے میں بولی تھی۔

"میرا یقین کرو، وہ ہم پر فخر کریں گے، جب ہم ان کو یہ بتائیں گے کہ ہم نے کس طرح واپس خود کو زندگی کی طرف موڑا تھا، کس طرح ایک دوسرے کو سہارا دے کر ایک دوسرے کی سوچ کو بدلا تھا، زندگی سے پیار کرنا سکھایا تھا، اپنے تجربے کے بعد ہم ان کو زیادہ گہرائی سے سمجھا سکیں گے کہ زندگی سے مایوس ہونے کے بعد بھی واپس پلٹنے کا ایک راستہ موجود ہوتا ہے، کبھی وہ راستہ خود تلاش کرنا پڑتا ہے اور کبھی وہ خود ہی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، جیسے تم میرے سامنے آگئی تھیں، میری نئی زندگی اور نئی کامیابیاں بن کر"۔ شیموئیل نے چاہت سے بھرپور نگاہوں سے چاندنی میں نکھرے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔

"اور تم میری زندگی میں مسیحا بن کر آگئے، محبت کے مسیحا"۔ قدم روکتے ہوئے ساشا نے بانہیں اس کی گردن میں حمائل کی تھیں، اگلے ہی پل وہ بری طرح چونک اٹھی تھی، سرعت سے شیموئیل نے اپنے چہار اطراف محتاط نظروں سے دیکھا تھا۔

"یہ کیسی آواز تھی؟" اس کے بازو سے لگی وہ خوفزدہ لہجے میں بولی تھی۔

"ظاہر ہے یہ کسی موسیقی کی آواز تو ہرگز نہیں تھی، یہاں خونخوار جانوروں سے تمہاری دوستی ہو گی مگر وہ مجھے بالکل برداشت نہیں کریں گے، تمہاری باتوں میں مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں بغیر کسی ہتھیار کے اتنی دور نکل آیا ہوں"۔ اس کا ہاتھ گرفت میں جکڑے تیز قدموں سے واپس کیمپ کی طرف جاتا وہ اسے گھرک رہا تھا۔

"اگر میں ان خونخوار جانوروں کی دوست ہوں تو تمہیں فکر نہیں کرنی چاہئے، میں ان کو سنبھال سکتی ہوں"۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

"میں فکر کرنے پر مجبور ہوں، کیونکہ تمہارے خوبصورت ہتھیار مجھے تمہارے قدموں میں ڈھیر کر سکتے ہیں، مگر تمہارے دوستوں سے مجھے نہیں بچا سکتے"۔ شیموئیل کے خشمگیں لہجے پر وہ بے ساختہ ہنسی تھی، سحر انگیز سناٹے میں اس کی ہنسی کی جلترنگ کسی ساز کی طرح دور تک پھیلی تھی، تقریباً دوڑتے ہوئے وہ دونوں کیمپ کی طرف جا رہے تھے۔ کل ایک اور روشن، سنہرا دن ان کی زندگی میں آنے والا تھا جس کی گواہ یہ جگمگ کرتی رات بھی تھی۔

☆..........☆..........☆

امبرین ناز

افسانہ

محبت یا مذاق



یونیورسٹی سے نکلتے ہی آج پھر اس کی نظر اسی چہرے پر پڑی، وہ کافی دنوں سے نوٹ کر رہی تھی کہ یہ چہرہ مسلسل اسے ہی گھورتا ہے، اور آج تو اس لڑکے نے عین اس کے سامنے بائیک روک دی، وہ محض اتفاق سمجھ کر نظریں جھکا کر چل پڑی۔

ہانیہ بی کام II کی اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ ایک شریف فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ چار بھائیوں کے بعد اپنے ماں باپ کی وہ ایک ہی بیٹی تھی۔ یونیورسٹی سے آکر ہانیہ نے ریسٹ کرنا چاہا تب ہی اس کے موبائل پر میسیج موصول ہوا۔

''ہائے ہانیہ!'' اجنبی نمبر تھا اس نے Reply کیا۔

''آپ کون''؟ فوراً ہی جواب آیا۔

''تم مجھے نہیں جانتیں ہانیہ! پر میں تمہیں جانتا ہوں''۔

''کون ہو اور میرا نمبر کس سے لیا؟'' ہانیہ نے سوال کیا۔

''تم نے آج مجھے دیکھا تھا''۔ جواب میں اس لڑکے نے کہا۔

''میں تمہیں جانتی نہیں پھر کیسے دیکھ سکتی ہوں''۔ ہانیہ نے ٹیکسٹ کیا۔

''میں یونیورسٹی کے باہر تھا، اسکائی شرٹ میں تھا یاد آیا کچھ؟''

''تم......'' ہانیہ حیران رہ گئی۔

''تم کون ہو اور میرا نمبر بھی مل گیا تمہیں مجھے گھورتے کیوں ہو؟'' ہانیہ نے ایک ساتھ ہی سوالات کر ڈالے۔

''تمہاری قاتلانہ آنکھیں مجھے جینے نہیں دیتیں، قتل کر دیں گی یہ تو مجھے''۔ اس لڑکے نے ٹیکسٹ کیا۔

''تو پھر دیکھتے کیوں ہو؟'' ہانیہ نے کہا۔

''ان نشیلی آنکھوں کے نشے میں ڈوب جانا چاہتا ہوں''۔ اس لڑکے نے کہا۔ ''میں تمہیں نہیں جانتی پلیز مجھے تنگ مت کرو''۔ ہانیہ نے کہا۔

''جاننے میں کتنا وقت لگتا ہے، میں ساحل خان ہوں...... ایم اے کیا ہے، تمہاری طرح کراچی میں رہتا ہوں''۔ اس نے اپنا تعارف کروایا۔

''تم جو بھی ہو I am not intrested'' ہانیہ نے میسیج لکھ کر سینڈ کیا۔

......☆......

اگلے دن پھر واپسی میں وہ وہیں کھڑا تھا۔ ہانیہ اسے نظر انداز کر کے نظریں جھکا کے جانے لگی، تھوڑی دور چل کر اسے محسوس ہوا کوئی اس کے پیچھے ہے مڑ کر دیکھا تو وہی لڑکا بائیک پر اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گھبرا کر وہ تیز قدم اٹھانے لگی۔ ''اوہ خدایا؟ اس نے گھر بھی دیکھ لیا''۔ وہ بڑبڑائی۔

گھر آتے ہی اسے میسیج ملا۔ ''تم تو بہت پیاری ہو''۔

''تمہاری آنکھوں کا تو دیوانہ ہوں میں، تمہارے لمبے بال مجھے بہت پسند ہیں''۔

اتنے سارے کمنٹس ایک ساتھ...... ہانیہ نے کمنٹس کو نظر انداز کیا اور کہا۔

''مسٹر ساحل! تم نے آج اچھا نہیں کیا میرا پیچھا کر کے''۔

''یار پلیز! معاف کر دو پلیز، آئندہ پیچھا نہیں کروں گا''۔ ''میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں کیا حرج ہے اگر تم مجھ سے دوستی کر لو''۔

......☆......

ہانیہ اور ساحل کی دوستی کو 3 ماہ ہو گئے۔ آج ہانیہ نے چھٹی کر لی یونیورسٹی سے ساحل کے کہنے پر دونوں پارک میں گھاس پر بیٹھے تھے۔

''ہانیہ! تم نے مجھ پر جادو کر دیا ہے جہاں دیکھوں تم ہی تم نظر آتی ہو''۔ ساحل نے کہا۔ ''ایسا کیا ہے مجھ میں؟'' ہانیہ نے معصومیت سے کہا۔

''تم بہت معصوم ہو بہت پیاری''۔ ساحل نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

''ساحل! جب سے تم میری لائف میں آئے ہو میں بہت خوش ہوں، تم مجھے کبھی چھوڑو گے تو نہیں''۔ ہانیہ نے اپنا سر ساحل کے کندھے پر رکھا۔

''نہیں ہانی! میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں''۔ ساحل نے پیار بھری نظر اس پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''میں کیسے مان لوں کہ تم مجھ سے پیار کرتے ہو۔''
ہانیہ نے اسے دیکھا۔
''ہانیہ! میں کیا کروں کہ تمہیں یقین آجائے، میں کچھ بھی کرسکتا ہوں تمہارے لئے کچھ بھی''۔ ساحل نے اسے اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے کہا۔
''بولو میں کیا کروں چھت سے کود جاؤں، اپنا ہاتھ کاٹ لوں؟''
نہیں ساحل! میں تو ویسے کہہ رہی تھی''۔ وہ پریشان ہی ہوگئی۔
''ہانیہ! بائی گاڈ آئی لو یو''۔
اس نے ہانیہ کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔
''آئی لو یو ٹو ساحل اینڈ آئی ٹرسٹ یو''۔
ہانیہ ساحل کی محبت میں پوری طرح کھو چکی تھی، اس کی قربت میں وہ خود کو بہت خوش قسمت تصور کرتی، یوں تو چاہے جانے کا احساس انسان کو مغرور کردیتا ہے، مگر غرور اس کی ذات میں کہیں بھی نہیں تھا وہ تو سادہ طبیعت اور معصومیت کا پیکر تھی۔

☆......☆......☆

وہ موسم سرما کی ایک دلفریب، خوب صورت اور سنہری سا پہر تھا فضا میں گلاب کے پھولوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی، بالکونی میں کھڑی وہ اسے ہی یاد کررہی تھی کہ اس کی کال آگئی۔
''کیسی ہو ہانی؟ آئی مس یو یار''۔
مس کال ریسیو ہوتے ہی ساحل نے کہا''آئی مس یو ٹو''۔ ہانیہ نے کہا۔
''تم میری Princess ہو ہانی''۔
''اور تم میرے Prince''۔
ہانیہ نے جواباً کہا۔
''تمہارا تو دیوانہ ہوں میں''۔ ساحل نے کہا۔
''ساحل! اگر تم مجھے پسند کرتے ہو تو اپنے گھر والوں کو بھیجو ناں ہمارے گھر مجھے اس طرح فون پر بات کرنا چھپ کر ملنا اچھا نہیں لگتا''۔ ہانیہ نے کہا۔

''ہاں، ہاں میں بھیجوں گا ناں، تم بس تھوڑا انتظار کرو، تم میری ہو صرف میری''۔ ساحل نے کہا، کچھ دیر بعد پھر اس نے کہا۔
''ہانی کل ملو ناں''۔
''نہیں ساحل! مجھے اچھا نہیں لگتا ہماری فیملی میں یہ سب اچھا نہیں سمجھا جاتا''۔ ہانیہ نے کہا۔
''ہانی پلیز! میری خاطر کیا تمہیں بھروسا نہیں مجھ پر''۔ ساحل نے کہا۔
''بھروسہ ہے ساحل''۔
''تو پھر ڈن کل ملتے ہیں اسی جگہ''۔ ساحل نے کہہ کر فون بند کردیا اور ہانیہ سوچنے لگی۔
''ساحل لفظوں کا کھلاڑی ہے، اپنی بات منوانا اسے اچھی طرح آتا ہے''۔

☆......☆......☆

وہ گھاس پر بیٹھا ہانیہ کا انتظار کررہا تھا، دور سے نظر آتی ہانیہ کو دیکھ کر اسے تسلی ہوئی، اسکائی بلیو سوٹ پر پنک اسکارف اڑتے ہوئے آنچل کو سنبھالتے دھیرے دھیرے وہ اس کے پاس آئی۔ سرخ و سفید چہرہ چھوٹی سی ناک آنکھوں میں سلیقے سے کاجل لگائے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی، وہ اسے دیکھتا رہا۔
''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' ہانیہ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔
''تمہیں دیکھ رہا ہوں اپنی جان کو''۔ ساحل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔
''تم بالکل چائنیز لگتی ہو''۔ ساحل نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔
''ایسے تو نہ دیکھو''۔ وہ شرمائی۔
''پھر کیسے دیکھوں؟'' اس نے شرارت سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑا۔
''ساحل! مجھے اس طرح چھپ چھپ کر ملنا اچھا نہیں لگتا''۔ ہانیہ نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچا۔
''ساحل! میں اب نہیں رہ سکتی تمہارے بغیر، تمہاری عادت ہوگئی ہے مجھے پلیز تم اپنے گھر والوں کو میرے گھر

رشتہ لے کر بھیجو"۔ کہتے ہوئے ہانیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ارے ہانی! ان آنکھوں کو کبھی مت رلانا جس پر ساحل فدا ہے"۔ اس نے ہانیہ کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"پر ساحل......" ہانیہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"میری جان میں ہوں ناں تمہارے ساتھ تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں"۔ ساحل نے گویا اسے اطمینان دلایا۔

.......☆.......

کافی دن ہو گئے ساحل نے نہ کوئی کال کی نہ ایس ایم ایس ہانیہ نے سوچتے ہوئے اس کا نمبر ڈائل کیا۔ نمبر Off جا رہا تھا۔

کئی بار اس نے ٹرائی کیا لیکن ناکام رہی، وہ اس کی یادوں میں کھوئی کھوئی سی رہتی۔

وہ بستر پر لیٹی ساحل کو یاد کر رہی تھی کہ اچانک ہی فون کی رنگ ٹون بجی وہ چونک کر اٹھی سوچا کہ ساحل ہی ہوگا، آج تو بہت شکایت کروں گی۔ مگر اسکرین پر تو کوئی اجنبی نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"ہیلو!" کسی لڑکی کی آواز تھی۔

"جی آپ کون؟" ہانیہ نے پوچھا۔

"میں انا بات کر رہی ہوں"۔

"کون انا؟"

"میں ساحل کی گرل فرینڈ ہوں"۔

"واٹ؟" ہانیہ نے حیرانگی کا اظہار کیا۔

"ہانیہ میں اور ساحل 3 سال سے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، مگر ہمارے بیچ لڑائی ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے اس نے تم سے دوستی کی اس نے تم سے صرف مجھے جلانے کے لئے دوستی کی تھی"۔ انا نے کہا۔

"تم مذاق کر رہی ہو، ساحل تو مجھ سے بہت محبت کرتا ہے"۔ ہانیہ نے کہا۔

"وہ تم سے محبت نہیں کرتا، بہتر ہوگا کہ تم اسے بھول جاؤ، ہمارے بیچ ایک شرط لگی تھی جس کی وجہ سے اس نے تم سے پیار کا کھیل کھیلا"۔ انا نے سخت لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔ مگر ہانیہ کو ایک دھچکا لگا بھروسہ اور اعتبار، امید اور یقین کے ٹوٹنے کا دھچکا۔

نیند تو اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

"میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی ساحل! تم نے مجھے دھوکا دیا میرے جذبات سے کھیلا"۔ وہ روتی رہی۔

.......☆.......

کافی دن گزر گئے اس نے ہانیہ کی کوئی خبر نہ لی۔

ہانیہ نے بات کی گہرائی جاننے کے لئے خود کال کی۔

"ہیلو!" ساحل نے کال ریسیو کی۔

"ساحل......!" ہانیہ نے کہنے کے لئے لب کھولا ہی تھا کہ ساحل نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں انا نے تم سے بات کی ہے، اس نے جو کچھ کہا سچ کہا ہے۔ میں اور انا ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں"۔ ساحل نے بڑی بے رحمی سے کہا۔

"تو پھر میرا پیچھا کیوں کیا وہ سب کیا تھا؟" ہانیہ نے کہا۔

"وہ سب ایک مذاق تھا، تم نے رشتہ بھیجنے کی بات کی اس لئے مجھے یہ کھیل ختم کرنا پڑا"۔ ساحل نے کہا۔

"مذاق میرے جذبوں کا مذاق میری محبت کا مذاق؟" ہانیہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی ساحل ہے، جو روز ہی اس کا انتظار کرتا تھا۔

اس نے Cell آف کیا اور چھت پر جا کر بہت روئی۔

"ہانی ان آنکھوں کو کبھی مت رلانا جس پر ساحل فدا ہے"۔ وہ اس کی باتوں کو یاد کر کے روتی رہی۔

.......☆.......

6 ماہ گزر گئے اس صورت حال سے نکلنے کے لئے اس نے قریب ہی اسکول جوائن کر لیا، بچوں کو پڑھا کر خود کو مصروف رکھنے لگی۔ گرمیوں میں اسکول سے پکنک کا پروگرام بن گیا۔ میڈم نے کہہ دیا تمام ٹیچرز کو جانا ضروری ہے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جانا پڑا۔ سب سمندر کے پانی سے لطف اندوز ہوتے رہے اور وہ دور سے دیکھ رہی تھی سب کو۔

"تم یہاں اکیلی کیوں کھڑی ہو ہانیہ! چلو پانی

میں''۔ میڈم نے اس کا ہاتھ پکڑا۔
''نہیں میم! میں نہیں جاؤں گی''۔
''چلو ناں''۔ تھوڑی دیر میڈم نے زبردستی اسے کھینچا۔ سب انجوائے کر رہے تھے اچانک ہی اس کی نظر ساحل پر پڑی جو دور سے کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ہانیہ نے اسے دیکھا، ایک شکایت تھی بہت سے سوالات تھے جن کا جواب وہ چاہتی تھی پر ہونٹ خاموش رہے اس نے اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے چہرہ پھیر لیا۔
''ہانی......!'' اس نے مڑ کر دیکھا پیچھے ساحل تھا اس سے کچھ نہ بولا گیا بس دیکھتی رہی۔
''ہانی! مجھے معاف کردو''۔ ساحل نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ کتنا درد تھا اس کے چہرے پر وہ دیکھتا رہا۔
''ہانیہ! مجھے احساس ہے میں نے غلط کیا ہے میرا یقین کرو میں تم سے محبت کرتا ہوں''۔
''محبت یا مذاق؟'' ہانیہ نے اسے اس کا مذاق یاد دلایا۔
''ہانی! ثنا میری لائف میں 3 سال سے ہے''۔ ساحل نے کہا۔
''تو جاؤ اس کے پاس''۔ ہانیہ نے غصے سے کہا۔
''اس میں وہ بات نہیں جو تم میں ہے''۔ ساحل نے کہا۔
''میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتا ہانیہ! وہ بہت چالاک ہے جب کہ تم ایک معصوم لڑکی ہو''۔ ساحل اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔
''یو نو مسٹر ساحل! تم کسی سے محبت نہیں کرتے تم صرف اپنے آپ سے محبت کرتے ہو۔ دو کشتیوں کے مسافر کبھی کامیاب نہیں ہوتے''۔ ہانیہ نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔
''میں ایک بار دھوکا کھا چکی ہوں اب نہیں، میرا معصوم محبت مر چکی ہے ساحل! جس طرح شیشے میں دراڑ آ جائے تو مکمل چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔ اسی طرح میری محبت دوبارہ پہلے جیسی نہیں ہو سکتی، تم نے بہت دیر کر دی لوٹنے میں اب میرے دل میں تم کہیں بھی نہیں ہو''۔ اعتبار اگر ایک بار ٹوٹ جائے تو دوبارہ واپس نہیں آ سکتا ساحل''۔ وہ بڑی روانی سے کہتی ہوئی چلی گئی۔

......☆......

مصباح مسکان رؤف

افسانہ

کہاں ہے بنت حوا

آمنہ اپنے گھر کے دروازے کو تالا لگا کے جلدی سے سیڑھیاں اتری، جمعے کا دن تھا اور جمعہ کو بچوں کو اسکول سے جلدی چھٹی ہوتی تھی، وہ آج معمول سے لیٹ ہوگئی تھی اس لئے تیز تیز قدم اٹھاتی طویل گلی عبور



کرنے لگی۔

جب وہ گلی کی نکڑ پر پہنچی تو سامنے سے آتی دو لڑکیوں کے حلیے نے اس کے قدم سست کردیئے، وہ دونوں لڑکیاں اس کے گھر کی پچھلی گلی میں رہتی تھیں، ایک نویں کلاس (9 th) اور دوسری بارہویں کی طالبہ تھی۔ نویں کلاس والی لڑکی نے ڈھیلی پونی کرکے بال دائیں کندھے پر ڈال رکھے تھے، آنکھیں کاجل اور مسکارے سے سجی، کانوں میں جگ مگ کرتے ٹاپس، لبوں پہ پنک لپ اسٹک لگائے، فل فٹنگ کی قمیض پہنے، دائیں کندھے سے بائیں طرف جاتے بیگ کے ساتھ، کندھے پہ جھولتے یونیفارم کے سفید دوپٹے سے بے پروا باتیں کرتی ہوئی آرہی تھی، جبکہ کالج والی لڑکی نے عبایا پہنا ہوا تھا، سیاہ عبایا اوپر سے قمیض کی فٹنگ کا اور نیچے سے کسی فراک کی طرح گھیرے دار تھا جو کہ اس کے پاؤں میں آرہا تھا، اس عبایا کی آستینوں پہ کندھے سے کلائی تک لمبائی میں جگمگاتے موتی اور نگینے لگے ہوئے تھے جس سے وہ عبایا کم اور ایک فینسی ڈریس زیادہ لگ رہا تھا۔ عبایا کے ساتھ کا دوپٹہ



جو کہ بمشکل اتنا تھا کہ صرف سر کو ہی ڈھانپ سکتا تھا، وہ بھی اس کے سر کی بجائے گلے میں لٹکا ہوا تھا جبکہ چہرے کی سجاوٹ دوسری لڑکی سے ذرا بھی مختلف نہ تھی۔ وہ دونوں طالبات کی بجائے فیشن شو کی ماڈلز لگ رہی تھیں، آمنہ حیران ہوئی کہ واقعی یہ لڑکیاں کسی تعلیمی ادارے سے آرہی ہیں یا کسی فنکشن میں شرکت کرنے جارہی ہیں۔ جب وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی اس کے قریب سے گزریں تو تیز خوشبو نے اس کے گرد حصار باندھ لیا۔

وہ بے ساختہ سوچنے لگی کہ اسکول کالج تو وہ بھی جاتی تھی، دولت کی ریل پیل اور حسن بے مثال تو اس کے پاس بھی تھا، بلکہ اب بھی ہے مگر اس نے بھی ایسے گھٹیا انداز و اطوار تو نہ اپنائے، اس نے تو تعلیم کے حصول کے لئے گھر سے باہر گزرنے والے وقت میں خود کو سنبھال کے اور دنیا سے چھپا کے رکھا، ہمیشہ اپنی اور اپنے ماں باپ کی عزت کی حفاظت کی اور ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچایا۔ آمنہ کو تو اپنا عبایا، اس کا بڑا دوپٹہ اور نقاب ایک محفوظ پناہ گاہ محسوس ہوتا تھا جسے پہن کر وہ خود کو دنیا اور دنیا کی بری نظروں اور ہر برائی سے محفوظ محسوس کرتی، تحفظ کے اسی احساس نے اسے اعتماد دیا اور یونیورسٹی تک پہنچایا۔ اس نے اپنے والدین کی لاج رکھی اور اس کے صلے میں اس کے پاس اچھا نیک شوہر، سلجھی ہوئی، تمیزدار اور فرمانبردار اولاد تھی۔ وہ خود بھی ایک اچھی بیٹی، اچھی بیوی اور اچھی ماں تھی۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ یوں بج سنور کے اپنی نمائش کروانے والی، نامحرم مردوں کو متوجہ کرنے والی لڑکیاں آخر کس معاشرے اور کس مذہب کی نمائندگی کرتی ہیں یا کرنا چاہتی ہیں؟

......☆......

جویریہ کے شوہر کو آفس کے کام سے کچھ دنوں کے لئے دوسرے شہر جانا تھا، اس لئے وہ دونوں بچوں کے ساتھ اپنی امی کے گھر آئی تھی، بھابھی اسے فورس کر رہی تھیں کہ وہ ان کے ساتھ ان کی سہیلی کی بہن کی منگنی پہ چلے، بھائی چونکہ مصروف تھے اس لئے بھابھی اسے ساتھ لے جانا چاہ رہی تھیں، لہٰذا جویریہ بچوں کو ان کی نانو کے حوالے کر کے انعم بھابھی کے ساتھ منگنی کے نائٹ فنکشن میں چلی آئی۔

عروج کی فیملی کافی ویل آف تھی، منگنی میرج ہال میں تھی، جب وہ دونوں ہال میں پہنچیں تو ڈھیر سارے مہمانوں کو دیکھ کر دروازے میں ہی رک گئیں۔ مکس گید رنگ تھی، فل آواز میں گانے چل رہے تھے، دونوں کو سمجھ نہ آیا کہ وہ کس طرف جائیں، اتنے میں سامنے سے عروج آگئی، سلیولیس بلیک ڈریس میں، دوپٹے سے بے نیاز، کھلے بال دائیں کندھے پہ ڈالے، تیز میک اپ میں عروج تو بالکل بھی پہچانی نہیں جارہی تھی۔ انعم تو ایک پل کے لئے حیران رہ گئی کہ کیا یہ واقعی اس کی وہی دوست ہے، جو اپنی ڈیسنٹ ڈریسنگ کی وجہ سے اسے اچھی لگتی تھی۔ جویریہ نے خاصی پریشانی سے عروج کو سرتاپیر دیکھا۔ بھابھی کی یہ دوست اس کی امی کے گھر کے قریب ہی رہتی تھی، اس لئے جویریہ کی اس سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی تھی، مگر سامنے موجود عروج تو اس عروج سے بالکل مختلف تھی، اسے افسوس ہوا۔

عروج نے ان کو اسٹیج کے فرنٹ ٹیبل پر بٹھایا، کچھ ہی دیر میں لڑکا لڑکی کو اسٹیج پر بٹھایا گیا، ان کے بیٹھتے ہی ڈھیروں لڑکے لڑکیاں اسٹیج پر کچھ صوفے کے پیچھے تو کچھ دائیں بائیں کھڑے ہو گئے، لڑکا لڑکی مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے سب کزنز اور فرینڈز ہوٹنگ کر رہے تھے، عجیب سا شور مچا ہوا تھا، پھر لڑکے کی والدہ نے لڑکے کو انگوٹھی تھمائی جو اس نے مسکرا کے کچھ بولتے ہوئے لڑکی کو پہنائی تو لڑکی کھلکھلا کے ہنسی اور "ہوہو" کے شور سے ہال گونج اٹھا، اسی شور میں لڑکی نے بھی لڑکے کو انگوٹھی پہنائی، سب بڑوں نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی، اسٹیج پر موجود لڑکے لڑکیوں نے نئے منگنی شدہ جوڑے کو کھینچ کے نیچے اتارا اور ان

کے گرد دائرے کی شکل میں کھڑے ہو گئے، ڈی جے نے گانا چینج کیا۔

جونہی ہال میں ''ڈسکو دیوانے'' کا میوزک گونجا تو سب نے میوزک کے ساتھ ہلتے ہوئے دائرے میں چلنا شروع کر دیا۔ باقی سب بڑے ان کو دیکھ کر تالیاں بجا رہے تھے، وہ سب مسکراتے ہوئے دائرے میں ڈانس کر رہے تھے۔

''کسی ایک بھی لڑکی کے پاس دوپٹہ نہیں ہے کتنا عجیب لگتا ہے بغیر دوپٹے کے''۔ جویریہ نے انعم بھابھی کے قریب ہو کے سامنے ڈانس کرتی لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے کہا تو انعم سخت شرمندہ ہوئی۔

''تم ملے تو جینا آ گیا، ......تم ملے تو جادو چھا گیا......'' گانا بدلا تو دائرہ توڑ کے سب کپلز بن کے ڈانس کرنے لگے۔

انعم نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا فنکشن ہو سکتا ہے، نجانے جویریہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی کہ کیسی دوست ہے اس کی۔

''دروازے کو کنڈی مارو، کوئی نہ بچ کے جانے پائے''......گانا پھر بدلا تو ہال میں رنگ برنگی روشنیاں گھومنے لگیں، کپلز کا ڈانس بھی چینج ہو گیا۔

''ایسا لگتا ہے کہ ہم منگنی کے فنکشن میں نہیں بلکہ کسی ڈانس پارٹی یا ڈسکو میں آئے ہیں، کتنے آرام سے یہ لڑکیاں غیر نامحرم لڑکوں کے ساتھ ڈانس کر رہی ہیں اور سامنے بیٹھے ان کے لبرل اور براڈ مائنڈڈ والدین خوشی و فخر سے تالیاں بجا رہے ہیں''۔ جویریہ نے پریشانی سے سامنے ہوتے تماشے کو دیکھتے ہوئے انعم بھابھی سے اپنا خیال ظاہر کیا، جو خود بھی پریشان تھیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ منگنی کوئی شرعی رشتہ تو نہیں ہے اور نہ ہی یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے محرم ہیں جو یہ یوں اتنے قریب......

کیسے والدین ہیں ان کے جو اپنی بیٹیوں کو یوں سب کے سامنے غیر لڑکوں کے ساتھ ڈانس کرتا دیکھ کر فخر کر رہے ہیں۔ انہیں اپنی عزت کا ذرا بھی خیال نہیں ہے، کہاں ہے ان کی غیرت؟ کیا ان کے ضمیر زندہ ہیں؟

''ہم تیرے بن اب رہ نہیں سکتے، تیرے بنا کیا وجود میرا''۔ ان لڑکے لڑکیوں کا ڈانس ہر بدلتے گانے کے ساتھ بدل رہا تھا، بالکل ایسے جیسے انہوں نے اس سب کی پہلے سے ریہرسل کی ہو۔

''یہ ماڈرن سوسائٹی کے پڑھے لکھے دولت مند لوگ سائنسی ترقی کے ساتھ ذہنی طور پر اس قدر پستی اور تنزلی کا شکار ہو چکے ہیں کہ اپنے اچھے برے اور غلط صحیح کی تفریق ہی بھلا بیٹھے ہیں''۔ انعم نے دل میں سوچا۔

جویریہ کے ذہن میں سوال اٹھ رہے تھے کہ کیسے لوگ ہیں یہ، ان کی غیرت کیسے یہ گوارہ کر رہی ہے کہ ان کی بیٹیاں یوں سارے خاندان کے سامنے دوپٹوں سے بے نیاز بے حیائی کے اس مظاہرے میں مگن ہیں۔

کیا فرق رہ جاتا ہے ان لڑکیوں میں اور باقاعدہ ناچنے والیوں میں؟

انعم کا دل چاہ رہا تھا کہ فوراً یہاں سے چلی جائے مگر یوں اچانک فرنٹ سے اٹھ کے چلے جانا، مناسب نہ تھا، مگر مزید بیٹھنے اور برداشت کرنے کا اس میں حوصلہ بھی نہ تھا، جویریہ کے تاثرات بھی انتہائی سنجیدہ اور سپاٹ تھے۔ انعم اٹھ کے عروج کے پاس گئی اور بہانا بنایا کہ امی کا فون آیا ہے، بچے انہیں تنگ کر رہے ہیں، اس لئے ہم اب گھر جائیں گے۔

عروج نے انہیں کھانے کے لئے روکنا چاہا مگر انعم نے بمشکل اسے راضی کر ہی لیا اور معذرت کر کے جویریہ کو لئے گھر آ گئی۔ دونوں سارے راستے خاموش ہی رہیں۔ انعم میں اسے مخاطب کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

جبکہ جویریہ سوچ رہی تھی کہ ماڈرنزم اور براڈ مائنڈڈ ہونے کا کیا یہ مطلب ہے کہ انسان اپنی روایات اور اخلاقیات کو بھول جائے، کیا دولت انسان سے اس کی

غیرت چھین لیتی ہے؟ یا اس کو بے ضمیر کر دیتی ہے جو اسے اپنے اردگرد ہوتے اچھے برے کا احساس نہیں ہوتا۔ اپنی اولاد کو دولت اور آسائشات دے کر اور ایسی آزادی دے کر جو کہ بے راہ روی میں شمار ہوتی ہے، امیر لوگ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے والدین ہونے کے تمام حقوق ادا کر دیئے ہیں۔

جویریہ نے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی اولاد کو ابھی سے اچھے برے میں فرق سکھائے گی، اپنے مذہب اور اس کی پاکیزہ تعلیمات سے ان کے اخلاق و کردار سنوارے گی، تاکہ کل کو اس کا ضمیر ان لوگوں جیسا نہ ہو اور وہ فخر سے اپنی اولاد کا سامنا کر سکے۔ اس کی اولاد جو اس کے خاندان کی آئندہ نسل ہے، باکردار اور بااخلاق ہوتا کہ اس کے خاندان کی عزت و شرافت پہ بھی آنچ نہ آئے اور نہ ہی روز محشر اسے بارگاہ الٰہی میں شرمسار ہونا پڑے۔

......☆......

گرمی دن بدن بڑھتی ہی جا رہی تھی، سدرہ نے دو چار لون کے سوٹ لینے کا سوچا اور فراغت پاتے ہی چھوٹی بہن کے ساتھ بازار آ گئی، چونکہ چھٹی کا دن تھا اس لئے بازار میں رش معمول سے زیادہ تھا، ہر طرح کے لوگ سڑکوں پر دکھائی دے رہے تھے، کچھ خواتین شاپنگ میں مصروف تھیں تو کچھ صرف ونڈو شاپنگ میں جبکہ کچھ دکاندار آتے جاتے لوگوں بالخصوص خواتین کو دیکھ کے لطف اندوز ہو رہے تھے، وہ دونوں سوٹ لے کر کپڑوں کی دکان سے نکل کر کتابوں والی دکان کی طرف بڑھیں کہ صباء نے اپنی کتابیں لینی تھیں، چلتے چلتے سدرہ کی نظر سامنے سے آتی خواتین پر پڑی تو اس نے تاسف وافسوس سے انہیں دیکھا۔

ٹک سک سے تیار وہ دونوں عورتیں جن میں سے ایک قدرے کم عمر تھی، ہائی ہیل کی ٹک ٹک کرتیں ان کے قریب سے گزریں تو انہوں نے بغور دیکھا، کہ ان دونوں نے یوں میک اپ کیا ہوا تھا جیسے وہ کسی شادی میں شرکت کے لئے آئی ہوں۔

''آپی کتنی عجیب لگ رہی تھیں یہ دونوں عورتیں، اتنا میک اپ کر کے بازار آنے کی بھلا کیا ضرورت ہے''۔ صباء نے حیرت سے بہن سے پوچھا تو سدرہ لاجواب ہو گئی۔ اب وہ اس بات کا کیا جواب دے بچی کو، وہ تو خود حیران تھی بازار میں تو ویسے بھی طرح طرح کے لوگ ہوتے ہیں، یوں خود کو نمایاں کرنے کا کیا مقصد ہوا بھلا؟ بازار تو شیطان کا گھر ہے، ایک انتہائی غیر محفوظ اور ضرر رساں جگہ، شر کا ٹھکانہ۔

وہ دونوں تو خود انتہائی ضرورت کے وقت بازار کا رخ کرتی تھیں اور ایک ہی چکر میں ساری ضروری شاپنگ کر لیتی تھیں، تاکہ جلد از جلد دوبارہ نہ آنا پڑے۔ اسے بازار آتے ہوئے سخت کوفت ہوتی تھی، خوامخواہ ہر کوئی گھورتا محسوس ہوتا اور یہ عورتیں کیسے سج سنور کے مردوں کو دعوت نظارہ دے رہی ہیں۔

بے پردہ اور بے حجاب عورتیں، اگر کوئی برقعہ پہنتی بھی ہے تو صرف فیشن کے لئے جو صرف کپڑوں کو چھپائے اور چہرہ اسی طرح عیاں رہے۔

دوپٹے کو تو سر پہ لپیٹنے کا بڑا فیشن چلا ہے، مگر کیا فائدہ اس فیشن کا کہ جس سے صرف سر ڈھانپتے ہوں اور سینہ دوپٹے سے خالی رہے، آج کل تو حجاب فیشن کا حصہ بن چکا ہے، ایسے ایسے برقعے دیکھنے کو ملتے ہیں کہ ڈریس اور برقعے میں فرق کرنا مشکل ہے رنگ برنگے، فٹنگ والے، مختلف ڈیزائننگ کے نت نئے عبائے بازار میں موجود ہیں۔ جن سے پردے کا اصل مقصد تو کہیں پس پردہ ہی رہ گیا ہے اگر باقی رہا ہے تو صرف فیشن......

ایسی فیشن زدہ عبایا کی شوقین خواتین نے اصل پردے والیوں کو بھی بدنام کر دیا ہے، لوگ سب کو ایک سا ہی سمجھنے لگے ہیں۔

''نجانے کیا ہو گیا ہے ہماری مسلمان خواتین کو، کیوں یہ اپنی روایات اور اخلاقیات کو بھلا بیٹھی ہیں''۔

قریب سے بلند آواز میں باتیں کرتی اور قہقہے لگاتی لڑکیوں کے گزرنے پر سدرہ نے دل میں تاسف سے سوچا اور گھر جانے کے لئے رکشے کی طرف بڑھیں جہاں پچھلی سیٹ پر ٹائٹ جینز، چھوٹی شرٹ اور گلے میں اسٹول لٹکائے بیٹھی لڑکی کو دیکھ کر اس کی کوفت میں مزید اضافہ ہوگیا۔

......☆......

عائشہ گھر کے کام کاج سے فارغ ہوئی تو تھکن اتارنے کی غرض سے T.V آن کر کے صوفے کی پشت سے سر لگا کے بیٹھ گئی، 360 چینل پر ماڈلز برائیڈل ڈریسز میں باری باری اسٹیج پر آرہی تھیں، ان کے ڈریسز سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کس ملک کی خواتین ہیں، گہرے گلے، سلیولیس، اکثر ڈریسز کے پچھلے گلے بھی کافی گہرے اور کھلے تھے کہ پوری کمر عیاں ہورہی تھی، ان ڈریسز نے تو ان ماڈلز سے ان کے مسلمان ہونے کی شناخت ہی چھین لی تھی، جبکہ ایسے ڈریسز کی اکثر ڈیزائنرز خود سرتاپا ڈھکی ہوتی ہیں۔

کوئی یقین نہیں کرسکتا کہ یہ لڑکیاں کسی اسلامی ملک کی، کسی مسلمان گھرانے کی بیٹیاں ہیں، برائیڈل ڈریسز کے بعد ماڈلز جن کپڑوں میں دوبارہ ریمپ پر آئیں، وہ تو بے حیائی کی حد تھے۔ عائشہ نے گھبرا کے فوراً چینل بدلا۔

''کونسی دلہنیں ایسے کپڑے پہنتی ہوں گی؟ ہمارے ملک میں کہاں ایسے لباس کا استعمال ہوتا ہے، اور اگر کہیں خواتین ایسے لباس استعمال کرتی ہیں تو کیا ان کے گھر والے انہیں کچھ نہیں کہتے؟ کیا انہیں اس عریاں لباس اور اس بے حیا فیشن پر اعتراض نہیں ہوتا؟'' عائشہ نے پریشانی سے خود کلامی کی۔

دوسرے چینل پر نئی بیوٹی کریم کا کمرشل چل رہا تھا، جس میں ایک مشہور و معروف T.V ایکٹریس بغیر آستینوں کے کھلے گلے والے فراک میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔ وہ کمرشل ختم ہوا تو Coke کا کمرشل شروع ہوگیا، جس میں مختلف جگہوں پر لڑکے لڑکیوں کو Coke پی کے اکٹھے ڈانس کرتے دکھایا جارہا تھا، سب لڑکیوں نے ٹائٹ پینٹس اور فٹنگ والی چھوٹی چھوٹی شرٹس پہنی ہوئی تھیں۔ عائشہ تاسف سے سر پکڑے انہیں دیکھتی رہی، ایک کے بعد ایک کمرشل چلتے رہے۔

ہر کمرشل میں ایک دو عورتیں ضرور تھیں، چاہے پراڈکٹ زنانہ ہو یا مردانہ، یوں لگتا ہے جیسے اشتہارات میں عورت کی موجودگی پراڈکٹ سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

''سمجھ نہیں آتی ایسا کیوں ہے، کیوں عورت کے وجود کو اتنا بے مول اور ارزاں سمجھ لیا گیا ہے کہ ہر جگہ اس کو اشتہار بنادیا جاتا ہے، چاہے وہ کسی دکان کی دیوار ہو، بازار میں لگا سائن بورڈ ہو یا کسی پراڈکٹ کا ریپر، عورت کی موجودگی لازمی ہے، صابن، صرف کے ریپرز پر عورتوں کی تصاویر ہوتی ہیں''۔ عائشہ کڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

اب اسی چینل پر ایوارڈ شو شروع تھا اور ایک مشہور سنگر مغربی لباس زیب تن کئے گانا گارہی تھی، بلکہ باقاعدہ ڈانس بھی کررہی تھی، جس پر ہر طرف سے تالیوں کی آوازیں ہال میں گونج رہی تھیں، اس کا گانا ختم ہوا تو دوسرا مشہور سنگر اسٹیج پر آیا، اس کے پیچھے آٹھ نو لڑکیاں بھی اسٹیج پر آئیں اور گانے پر ڈانس کرنے لگیں، ان لڑکیوں نے فل فٹنگ والی قمیضیں زیب تن کی تھیں اور دوپٹے ندارد تھے۔

سنگر کے آگے اسٹیج کے فرنٹ پر ڈانس کرتی وہ لڑکیاں اور تماشائیوں میں بیٹھے مرد، جوان کے ڈانس سے محظوظ ہوتے ہوئے تالیاں بجارہے تھے۔ یہ سارا منظر بظاہر تو ماڈرن سوسائٹی کا تھا جو کہ معاشرے کے عزت دار شہری اور شرافت کے علم بردار تھے، مگر کچھ ایسا ہی منظر ان بدنام زمانہ گلیوں کے چوباروں کا ہوتا ہے

ایک طرف لڑکیوں کا ڈانس اور دوسری طرف مرد تماشائی۔ معاشرے کے یہ عزت دار لوگ ایک طرف تو ان گلیوں اور ان کے رہنے والوں کو قابل عزت نہیں گردانتے، جبکہ دوسری طرف اپنی لڑکیوں کے ڈانس سیکھنے اور کرنے پر فخر کرتے ہیں اور اسے ماڈرنزم کا نام دیتے ہیں۔

عائشہ کا یہ سوچ سوچ کر سر درد کرنے لگا کہ کیوں ہمارا معاشرہ، ہمارے ہم وطن و ہم مذہب اپنے اللہ اور اس کے محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کو بھلا چکے ہیں؟ ہمارے محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت کی خاطر اتنی قربانیاں دیں، اتنی تکلیفیں سہیں، رو رو کے دعائیں کیں اور یہ احسان فراموش امت انہیں اور ان کے احکامات کو ہی بھلا بیٹھی ہے۔

اسلام نے عورت کو پردے میں رہنے والی کہا اور آج کی عورت پردہ تو دور سرے سے اپنے مذہبی احکامات و تعلیمات کو فراموش کر کے مغرب کے رنگ میں ڈھل چکی ہے۔ اسلام نے عورت کو اپنی خوبصورتی اور زینت کو چھپا کر رکھنے کا حکم دیا مگر اس دور کی عورت نے اپنے لباس میں سے دوپٹے کو بوجھ سمجھ کر نکال کر اپنی نمائش کو ضروری مان لیا۔

اس اسلامی مملکت میں عورت کے اس قدر سستا، بے وقعت اور بے پردہ ہونے پر، آدم کی بیٹی کی یوں عریانی اور بے حیائی پر ہر زندہ دل اور باضمیر مومن مسلمان کا دل کڑھتا ہے اور بے اختیار اس کے دل و دماغ سے یہ سوال اٹھتا ہے کہ کہاں ہے بنت حوا؟

وہ جو شرم و حیا کا پیکر ہو، اس قدر مقدس و پاکیزہ ہو کہ اسے دیکھ کر اس کی عزت کرنے کا دل چاہے اور اس پر اٹھنے والی نگاہ اس کے احترام میں خود بخود جھک جائے۔

”کہاں ہے وہ بنت حوا“؟

......☆......

تبسم فیاض

افسانہ

محبت کا بھرم

"بی بی جی! کمرہ خالی کر دیں مجھے صفائی کرنی ہے"۔ ماسی کی آواز پر دونوں نے مڑ کر دیکھا۔

"تم آج پھر آ گئیں، رضیہ کہاں ہے؟ یہ روز روز چھٹی کیوں کرتی ہے؟" اریبہ نے کام والی سے پوچھا۔



"باجی! اب وہ نہیں آئے گی میں ہی آؤں گی، رضیہ بھاگ گئی ہے اپنے گھر والے کو چھوڑ کر"۔ رضیہ کی بہن نے ان لوگوں کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"کیا؟ کیوں بھاگ گئی؟" اب کے ثمن نے تشویش سے سوال کیا۔

"وہ جی اس کا مرد اس کی پرواہ ہی نہیں کرتا تھا، بے چاری خود ہی کما کر جیسے تیسے اپنا اور اپنے مرد کا پیٹ پالتی تھی لیکن پھر بھی اس کا مرد اس پر پیار بھری نظر نہیں ڈالتا تھا"۔ وہ بھی رضیہ کا پورا قصہ سنائے بغیر نہ رہ سکی۔

"عجیب ہے اگر اس کی پرواہ نہیں کی تو وہ گھر ہی چھوڑ کر بھاگ گئی؟" ثمن نے استہزائیہ انداز میں کہہ کر اریبہ کو دیکھا۔

"کیا عجیب ہے۔ صحیح تو ہے اتنا سب کرنے کے باوجود اس کا شوہر اس کی قدر پیار اور پروا نہ کرے تو وہ کیا کرتی، ہر شخص اظہار چاہتا ہے، اگر اظہار نہیں بھی ملتا تو وہ احساس مانگتا ہے اپنے لئے"۔ اریبہ نے ثمن کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

"میں نہیں مانتی کہ اگر وہ اظہار نہیں کرتا اور دنیا دکھاوے کو اس کی پروا نہیں کرتا تو کوئی اپنا گھر ہی چھوڑ



دے"۔ ثمن بھی اپنے موقف پر ڈٹ گئی۔
ادھر وہ کام چور ماسی ان کی بحث دیکھتے ہوئے ایک بار پھر کام میں ڈنڈی مار کر چلتی بنی۔
"دیکھو ثمن! ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے سراہا جائے، تعریف کی جائے، ضروری نہیں الفاظ سے بلکہ اپنے انداز سے بھی اس پر ظاہر کر سکتا ہے اور رہا سوال رضیہ کا وہ غلط عورت نہیں تھی، 4 سال سے اس گھر میں کام کر رہی ہے میں اچھی طرح جانتی ہوں وہ ذرا سا صفائی سے کام کرنے کی تعریف پر اتنا خوش ہو جاتی تھی، تو پھر وہ اپنے بارے میں ایسی ہی sensetive ہو گی اور ویسے بھی کون سا اس کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں جو وہ کچھ سوچتی"۔
"بیڑیاں؟" ثمن نے اریبہ کا لفظ سوالیہ انداز میں دہرایا۔
"ارے یار بچے بھی تو کسی بیڑیوں سے کم نہیں ہوتے، اولاد ہوتے ہی ماں کے پاؤں زنجیر سے بندھ جاتے ہیں"۔ اریبہ نے وضاحت کی۔
"خیر آپ کی یہ فلاسفی میں ابھی بھی نہیں مانتی"۔ ثمن نے یہ کہتے ہوئے اپنی بکس سمیٹیں اور گھر جانے کے لیے قدم بڑھا دیئے۔
ثمن اور اریبہ دو بیسٹ فرینڈ تھیں اور ساتھ میں دور کی رشتہ دار بھی، کراچی یونیورسٹی میں ایک ساتھ اکنامکس ماسٹرز کی اسٹوڈنٹ تھیں اور ان کا یہ ساتھ میٹرک سے تھا اس لئے یہ دونوں دو جان یک قالب تھیں۔ بہت ساری جگہ پر اختلاف اور بحث ان کی الگ الگ سوچ اور نظریئے کی وجہ سے تھا لیکن ان کی بحث ایک دوسرے کو قائل کرنے کے لیے ہوتی تھی جو کہ اکثر ادھوری رہ جاتی تھی، کبھی اریبہ کو اینڈ پر اختلاف ہو جاتا تو کبھی ثمن زچ ہو کر انکار کر دیتی لیکن دونوں میں اریبہ کی سوچ بہت وسیع النظر اور حقیقت سے بھرپور دلائل پر مبنی ہوتی تھی۔ جبکہ ثمن اپنی لاپروا طبیعت کی بنا پر جھنجھلا کر بات آگے بڑھانے سے رک جاتی تھی۔

☆.........☆.........☆

دن تیزی سے گزر رہے تھے آخر کار فائنل ایگزام کی ڈیٹ بھی قریب آ گئی اور ان دونوں کی توجہ صرف امتحان پر مرکوز ہو گئی۔
جیسے تیسے پیپرز سے فارغ ہوئیں تو ثمن کے سسرال والوں نے شادی کے لیے شور مچا دیا، چارو ناچار ان کو ہامی بھرنی ہی پڑی اور یوں ثمن کی شادی کی تاریخ طے پا گئی۔
زبیر، ثمن کی پھپھو کا بیٹا تھا، وہ شروع سے ہی ثمن کو پسند کرتا تھا، آہستہ آہستہ یہ پسند محبت میں تبدیل ہو گئی، یہ بات ثمن بھی اچھی طرح جانتی تھی لیکن کبھی ثمن نے زبیر کو کوئی رسپانس نہیں دیا تھا۔
زبیر اسے ثمن کی شرم و حیا تصور کرتا تھا، لیکن یہ ثمن کی شرم و حیا نہیں اس کی طبیعت کی بے اعتنائی تھی۔ وہ کبھی کسی چیز سے جلد نہ تو متاثر ہوتی تھی اور نہ ہی خاطر میں لاتی تھی۔
شادی کا دن بھی آ پہنچا اور ثمن، زبیر کی سنگت میں میکے کی دہلیز چھوڑ گئی۔
زبیر نے بہت چاؤ سے ثمن کا استقبال کیا اور اس سے زندگی بھر محبت میں کمی نہ آنے کے وعدے کیے، زبیر کی محبت کے بھرپور اظہار اور اعتبار نے ثمن کو ایک ایسی رونق بخشی کہ ثمن خود اپنی قسمت پر رشک کیے بنا نہ رہ سکی۔

☆.........☆.........☆

دن دھیرے دھیرے گزرتے جا رہے تھے اریبہ بھی شادی ہو کر ملک سے باہر جا چکی تھی اور ادھر ثمن ماں بننے کے عمل سے گزر رہی تھی۔
ثمن نے زبیر کو کبھی محبت کے جواب میں محبت بھری باتیں نہیں کہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ زبیر سے محبت نہیں کرتی تھی، کئی بار زبیر کے اصرار پر بھی اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ مجھ سے اظہار کی امید نہیں رکھئے گا، مجھ سے یہ سب نہیں ہوتا، لیکن اپنے

معاملے میں اسے ہر وقت بھی توقع رہتی تھی کہ زبیر اسے ہر بات پر ہر انداز پر سراہے جو کہ زبیر اپنی عادت کے مطابق وقتاً فوقتاً کرتا رہتا تھا۔

لیکن ثمن اپنے مزاج سے نہ ہٹ سکی۔

ثمن اور زبیر کی زندگی میں عروبہ جیسی ننھی پری نے قدم رکھا دونوں خوشی سے جھوم اٹھے، دونوں کی سوچ کا محور عروبہ کی ذات بن گئی۔

آہستہ آہستہ ثمن عروبہ میں اتنی مگن ہو گئی کہ اس نے زبیر پر توجہ دینی بھی چھوڑ دی، عروبہ کی پرورش کے چکر میں زبیر کے کاموں میں کوتاہی ہونا شروع ہو گئی، زبیر کسی بات کی امید رکھتا تو ثمن چڑ جاتی کہ اب ہم ٹین ایج نہیں ہیں۔

زبیر خاموش سا ہو جاتا، عروبہ کے بعد زندگی میں اریشہ بھی شامل ہو گئی، ثمن کی مصروفیت میں اور اضافہ ہو گیا۔

''ثمن پلیز! مجھے بھی تمہاری توجہ چاہیے، تم ہر وقت بچوں میں لگی رہتی ہو''۔ زبیر نے دھیمے انداز میں ثمن سے شکایت کی۔

''اور میں کس سے توجہ مانگوں؟'' ثمن نے پلٹ کر زبیر سے سوال کیا۔

''میں دوں گا تمہیں توجہ، میں کہتا تو ہوں کہ تم ہر وقت گھر کے کام اور بچوں کو اپنے اوپر حاوی نہ کرو اور لوگ بھی تو ہیں، وہ بھی تو بچے پال رہے ہیں اور اپنے لئے ٹائم بھی نکالتے ہیں، تم بھی بنو سنورو، میرے آنے سے پہلے سارے کام نمٹا لو، پھر ہم کبھی باہر کھانے کے لیے چلیں گے، تو کبھی آؤٹنگ کے لیے، اس طرح میرا تمہارا ذہن بھی فریش رہے گا''۔ زبیر نے بہت پیار سے سمجھانا چاہا۔

''پلیز زبیر! ہماری شادی کو 5 سال ہو گئے ہیں، میں کوئی نئی نویلی دلہن نہیں ہوں جو ہر وقت شام میں تیار ہو کر میاں کا انتظار کروں، اب آپ حقیقت کی دنیا میں واپس آ جائیں، یہ آؤٹنگ یہ ہوٹلنگ صرف وقت اور پیسہ کا ضیاع ہے اور ویسے بھی مجھے پسند نہیں''۔ ثمن نے رُکھائی سے جواب دیا۔

''پھر تم خود ہی بتاؤ کہ ہم اپنی لائف میں کس طرح بھی خوشیاں لا سکتے ہیں؟'' زبیر نے پھر ثمن سے سوال کیا۔

''کیا ہو گیا زبیر! ہمارے یہ بچے ہی ہماری خوشیاں ہیں، ان سے زیادہ بڑی خوشی اب اس لائف میں اور کیا ہو گی؟'' ثمن اپنی طبیعت کے مطابق آخر میں جھنجھلا گئی۔

زبیر، ثمن کو دیکھ کر بس دل میں افسوس کر کے رہ گیا۔ زبیر زندگی کو بھرپور انداز میں انجوائے کرنے والا ایک زندہ دل شخص تھا، ہر چیز اس کی پسند مرضی کے مطابق اسے ملی حتیٰ کہ بیوی بھی لیکن زبیر، ثمن کا مزاج آج تک چینج نہیں کر سکا تھا، لاکھ چاہنے کے باوجود بھی وہ اپنے آپ کو ثمن کے مزاج سے کمپرومائز نہیں کر پا رہا تھا۔

زبیر نے ثمن کی طرف سے خاموشی اختیار کر لی اور خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف کر لیا۔

زندگی ایک مشینی انداز سے آگے بڑھنے لگی، اس سے ثمن کو تو کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا، لیکن زبیر اس لائف سے اکتاہٹ کا شکار ہو گیا، ایسی زندگی سے اس کا دم گھٹنے لگا اور وہ راہ فرار ڈھونڈنے لگا۔

☆.........☆.........☆

''ہیلو ثمن! کیسی ہو اتنے عرصے بعد کیسے یاد کر لیا؟'' اریبہ نے ثمن کی کال ریسیو کرتے ہی شکوہ کیا۔

''بس بہت یاد آ رہی تھیں میں نے سوچا تمہیں فون کر لوں''۔ ثمن نے بوجھل آواز میں جواب دیا۔

''چلو یاد کے بہانے تم نے فون تو کیا کم از کم، اور سناؤ زبیر بھائی کیسے ہیں، آج بھی وہی انداز ہے ان کی چاہت کا یا پھر وہ لیا بن کر بدل گئے ہیں؟'' اریبہ نے کہا۔

''نہیں زبیر اب وہ زبیر نہیں رہے، اب وہ بدل گئے ہیں، مجھے بدلنے کی کوشش میں اب وہ میرے ہی مزاج

میں ڈھل گئے ہیں"۔ ثمن نے کھوئے انداز میں کہا۔

"کیا... تم میں تو بڑھیا کی روح تھی، اچھے خاصے جوان بندے کو بوڑھا بنا دیا، ضرور اس میں تمہاری بے اعتنائی اور لاپرواہی کا ہاتھ ہوگا"۔ اریبہ نے سارا الزام ثمن کو دے دیا۔

"چلو خیر، ہم مزاج بندے کے ساتھ کیسی گزر رہی ہے؟ عروبہ اور اریشہ کیسی ہیں؟"

"سب ٹھیک ہیں تم پاکستان کب آ رہی ہو؟" ثمن نے اس انداز سے پوچھا کہ اریبہ ٹھٹک گئی، اسے محسوس ہوا کہ ثمن اس سے کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔

"کیا بات ہے ثمن! کوئی پریشانی ہے کوئی بات ہے، کیوں اتنی اداس لگ رہی ہو آج مجھے؟" اریبہ کے لہجے میں فکر آ گئی۔

"ارے نہیں کچھ نہیں، بس تم آج یاد بہت آ رہی ہو، تم جلد پاکستان آ جاؤ میں چاہتی ہوں کہ ہم پھر سے ڈھیر ساری باتیں کریں، چلو میں پھر بعد میں بات کروں گی اپنا خیال رکھنا، اللہ حافظ"۔ ثمن نے تو فون بند کر دیا، لیکن اریبہ کو اپنی طرف سے پریشانی میں مبتلا کر دیا۔

"زبیر آج کل آفس میں کام میں اتنا بزی ہو گئے ہیں کہ گھر ٹائم سے آنا بھول گئے ہیں"۔ ثمن نے گھڑی میں رات نو بجے کا ٹائم دیکھ کر سوچا۔

ٹھیک 10 بجے زبیر کی گاڑی کا ہارن بجا، ثمن کی آنکھ لگ گئی تھی، ہارن کی آواز پر آنکھ کھول کر نظر سیدھی گھڑی پر جا ٹکی، ہڑبڑا کر اٹھی اور دروازہ کھولا۔

"زبیر! اتنی دیر کر دی، کیا آج میٹنگ تھی کوئی؟" ثمن نے زبیر کو دیکھتے ہی کہا۔

"ہاں آج ایک اہم میٹنگ تھی، عروبہ اور اریشہ سو گئیں؟" زبیر نے سرسری سا جواب دیا۔

"جی، میں کھانا نکالتی ہوں"۔ ثمن پلٹ کر کچن کی طرف مڑ گئی۔

"نہیں میں کھانا کھا کر آیا ہوں"۔ زبیر نے یہ کہہ کر ٹائی کی ناٹ لوز کی اور آگے بڑھ گیا۔

ثمن کے بڑھتے قدم رک گئے اور بھوک جیسے کہیں اُڑ گئی۔ خاموشی سے جا کر اپنے بستر پر کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

"زبیر! آج آپ نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں کہ میں نے کھانا بھی کھایا یا نہیں"۔ یہ سوچتے ہی ایک آنسو ثمن کے گال پر ڈھلک گیا۔

آج کل ثمن زبیر کے انداز اور مزاج کو لے کر بہت حساس ہو رہی تھی، یہی وجہ تھی کہ اس نے اریبہ کو فون کیا، وہ اریبہ سے باتیں کر کے اپنا دل بہلانا چاہ رہی تھی، لیکن کچھ کہہ نہ سکی۔

☆..........☆..........☆

"زبیر! سردیاں آنے والی ہیں بچوں کے لیے کچھ گرم کپڑے لینے ہیں، اگر آج آپ لیٹ چلے جائیں تو؟" ثمن نے بات ادھوری چھوڑ کر زبیر کو دیکھا۔

"نہیں ثمن! آج میری بہت اہم ڈیلنگ ہے، پلیز تم خود جا کر شاپنگ کر لو، کچھ پیسے رکھ لو اپنے اور بچوں کے لیے کپڑے لے لینا"۔ بھاری رقم ثمن کے ہاتھ پر رکھ کر زبیر اپنی تیاری میں لگ گیا۔

ثمن بغیر کسی جرح کے زبیر سے پیسے لے کر مڑ گئی جبکہ زبیر کو توقع تھی کہ ثمن ضرور اس سے بحث کرے گی، زبیر اسے جاتا دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔

مال سے نکل کر ثمن، اریشہ کو گود میں لیے جوں ہی آگے بڑھی گلاس ڈور کے ساتھ سامنے کافی شاپ پر جیسے نظریں جمیں تو ہٹانا ہی بھول گئیں۔ ایک لمحے کو ثمن کو یقین ہی نہ آیا کہ زبیر کسی لڑکی کے ساتھ کافی انجوائے کر رہا ہے، لڑکی کافی ڈیسنٹ سی تھی جیولری کپڑوں سے لے کر ہر انداز میں۔

ثمن کے قدم من بھر کے ہو گئے، وہ کس طرح گھر واپس آئی اسے پتہ ہی نہیں چلا۔

ساری گتھی سلجھ گئی تھی اب ثمن کی سمجھ میں سب آ رہا تھا، زبیر کا اکھڑا اکھڑا انداز، زبیر کا گھر دیر سے آنا، زبیر کا کھانا کھا کر آنا، اہم میٹنگ کا کہہ کر شاپنگ پر نہ جانا۔

اس بری طرح سے اعتبار ٹوٹنے سے ثمن بکھر سی گئی، اس سے اپنا آپ سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔

"زبیر تو مجھے اتنا چاہتا تھا پھر کوئی اور کیسے اس کے دل میں آکر بس سکتا ہے؟" آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے اور ثمن کا دھیان اس منظر سے ہٹ نہیں رہا تھا۔

"مرد ذات پر اتنا اعتبار بھی ٹھیک نہیں ہوتا"۔ ماضی میں کبھی کہا ہوا اریبہ کا جملہ آج ثمن کے کان میں گونج رہا تھا۔

"میں یہاں اتنی محنت سے زبیر کا گھر بنائے بیٹھی ہوں اور اُدھر زبیر اپنی کمائی اپنا ٹائم اور اپنے جذبات دوسروں سے شیئر کر رہا ہے؟" ثمن کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ زبیر اسے دھوکہ بھی دے سکتا ہے۔

"آج ہو گئی آپ کی میٹنگ؟" ثمن نے چبھتے ہوئے انداز میں زبیر سے پوچھا۔ زبیر چونک سا گیا۔

"آں ہاں ہو گئی، بہت اچھی رہی، تم سناؤ شاپنگ کر لی بچوں کی؟" زبیر نے ثمن کے سوچتے ہوئے چہرے کو بغور دیکھ کر پوچھا، اپنی طرف بغور دیکھتے ہوئے زبیر کو ثمن نے رخ موڑ لیا، وہ ظاہر نہیں کرنا چاہ رہی تھی کہ زبیر کو کچھ پتہ چلے۔

"جی ہو گئی"۔ سرسری سا جواب دے کر ثمن نے سونے کی تیاری شروع کر دی، لیکن دل زبیر کی طرف سے بہت دُکھا ہوا تھا، اب ثمن کو زبیر کی بے دلی زیادہ محسوس ہونے لگی تھی لیکن وہ بات نہیں کر پا رہی تھی اس بارے میں۔

فون کی بیل پر ثمن نے ہیلو کہا۔

دوسری طرف سے آتی اریبہ کی آواز پر ثمن اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکی، ثمن کو ویسے ہی کسی ہمدرد کی ضرورت تھی، کیونکہ وہ اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔

"خیریت ثمن! تم رو رہی ہو؟" اریبہ نے پریشانی سے پوچھا۔

"ہاں اریبہ! تم بہت یاد آ رہی تھیں"۔ ثمن نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو ثمن! تم اپنی یہ عادت ختم کر لو جو بات دل میں ہوتی ہے، وہ کہہ دیا کرو، میں تمہیں اور تمہاری عادتوں کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں، کوئی نئی دوست تو نہیں تمہاری بچپن کا ساتھ ہے ہمارا"۔ اریبہ نے رسان سے سمجھایا۔

"اریبہ! زبیر بہت چینج ہو گئے ہیں، گھر میں بھی بہت کم ٹائم گزارتے ہیں، بچوں پر بھی اب ویسی توجہ نہیں دے رہے"۔ ثمن نے اصل بات چھپاتے ہوئے کہا۔

"زبیر کو تو تم نے ہی چینج کیا ہے اور رہا سوال بچوں پر توجہ کا تو ہو سکتا ہے آج کل ان کے آفس میں کام کا لوڈ ہو جس کی وجہ سے وہ گھر اور بچوں کو ٹائم نہیں دے پا رہے ہوں"۔ اریبہ نے سمجھایا۔

"نہیں اریبہ! اب زبیر کو میری اور اس گھر کی ضرورت نہیں رہی، شاید اس لئے وہ اپنا ٹائم بہت اچھے طریقوں سے spend کر رہے ہیں"۔ ثمن نے ڈھکے چھپے لفظوں میں زبیر کی سچائی بتائی۔

"کیا مطلب، کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" اریبہ چونکی۔

"اریبہ! زبیر کسی اور لڑکی میں انٹرسٹڈ ہیں اور وہ مجھ سے جھوٹ بول کر اس کے ساتھ کافی شاپ میں کافی انجوائے کرتے رہے ہیں، یہ سب میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس کے علاوہ وہ گھر آکر بھی موبائل پر لگے رہتے ہیں، گھر آنے کا ٹائم بھی بہت دیر سے کر دیا ہے، بچوں پر وہ توجہ نہیں ہے، ایسا لگ رہا ہے کہ وہ گھر اور بچوں اور میری بس ذمہ داری پوری کر رہے ہیں"۔ ثمن سے رہا نہیں گیا اور پوری بات اریبہ کے گوش گزار کر دی۔

"تم نے کبھی سوچا ہے کہ یہ سب کیوں ہوا ثمن! زبیر بھائی ایسے نہیں تھے، لیکن تمہارے مزاج نے شاید ان کی سوچ کا رخ موڑ دیا اور یہ جو "میں" ہے ناں انسان کو خود پسند اور مغرور کر دیتی ہے، دیکھو

تمہاری ذرا سی بے اعتنائی نے انہیں چینج کر دیا، تمہیں یاد ہے ثمن! رضیہ اپنے گھر سے کیوں بھاگ گئی تھی؟ اس لئے کہ وہ خالی در و دیوار کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی اور نہ ہی ساری زندگی ان در و دیوار کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہتی تھی۔ اُسے اس وقت جو صحیح لگا اس نے کیا، وہ کیوں پالتی اپنے شوہر کو جو اس کی نہ قدر کرتا تھا اور نہ ہی محبت، اسے ایک جیتا جاگتا وجود چاہئے تھا جو اسے محبت دیتا، چاہت دیتا اور اس پر توجہ دیتا اور یہی سب کچھ تم نے کیا زبیر بھائی کے ساتھ"۔ ثمن کو یہ ساری باتیں کسی ہتھوڑے سے کم نہیں لگ رہی تھیں، لیکن آج اسے اریبہ کی ساری باتیں ایک سو دس فیصد سچی لگ رہی تھیں، سچ تو کہہ رہی تھی اریبہ۔

"میں نے کیا دیا ان چھ سالوں میں زبیر کو، ایک محبت بھرا جملہ تک تو دے نہیں سکی، صرف اس لئے کہ یہ سب میرے مزاج کا حصہ نہیں تھا"۔ یہ سوچتے ہی ندامت کے کتنے آنسو ثمن کے گال پر ڈھلک گئے پتہ ہی نہیں چلا۔

"دیکھو ثمن! میں نے پہلے بھی سمجھایا تھا کہ محبت اظہار توجہ اور احساس چاہتی ہے، تم پہلے یہ بات نہیں مانتی تھیں، لیکن اب تو تجربہ کر چکی ہو، ایک ایسا تجربہ جس سے تمہاری زندگی تنکوں کی طرح بکھر سکتی ہے، محبت کچھ دینے کا نام ہے، لینے کا نہیں، کبھی کبھی ہمیں اپنے مزاج اور موڈ سے ہٹ کر دوسرے کے لیے کچھ کرنا پڑتا ہے، اس لئے نہیں کہ یہ سب زبردستی کا سودا ہے بلکہ اس لئے کہ ہمیں دوسرے کی خوشی عزیز ہے"۔ آج اریبہ کی باتوں سے ثمن کو ذرا برابر بھی اختلاف نہیں تھا۔

"لیکن ابھی بھی دیر نہیں ہوئی ثمن! تم اپنا گھر بچا سکتی ہو، اس کے لیے تمہیں اپنا آپ بدلنا ہوگا، اپنے لئے نہیں اپنی بچیوں اور اپنے گھر کے لیے، جس طرح سے زبیر بھائی لائف گزارنا تمہارے ساتھ پسند کرتے ہیں اسی طرح سے رہو، جس انداز سے زبیر تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں اسی انداز سے بنو۔ تم زبیر کی پہلی محبت ہو اور پہلی محبت کم تو کیا ختم بھی نہیں ہوتی، جب وہ اپنی محبت کو اپنے ہی روپ میں دیکھیں گے تو یقیناً وہ پلٹ آئیں گے"۔

"تھینک یو اریبہ! آج تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا، مجھے بہت بڑی مشکل سے نکالا ہے، زبیر کی طرف سے جو بدگمانیاں میرے اندر پیدا ہو گئی تھیں آج تمہاری وجہ سے مجھے آئینہ دیکھنے کو ملا، اس میں زبیر کا واقعی کوئی قصور نہیں یہ سب میری لاپرواہی کی وجہ سے ہوا ہے"۔ ثمن نے بہت شرمندگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے میں نے تو دوستی کا حق ادا کر دیا، لیکن یہ حق اب تم پر قرض ہے اور یہ میرا قرض تم جبھی ادا کر سکو گی جب تم میری ان سب باتوں پر عمل کرو گی اور اب مجھے جب فون کرو گی جب تم یہ سب معاملات بہت اچھے طریقے سے نبھاؤ گی"۔ اریبہ نے ثمن کو کانفیڈنس دیا اس معاملے سے نمٹنے کے لیے۔

آج ثمن کے دل کا بوجھ بہت ہلکا ہو گیا تھا کیونکہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ابھی اسے دیر نہیں ہوئی۔

"تم ٹھیک تھیں اریبہ، رضیہ بھاگنے میں کیوں دیر کرتی، اس کے پاؤں میں کوئی بیڑی نہیں تھی، لیکن میرے پاؤں میں دو بیڑیاں ہیں جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہیں، شاید اپنے آپ سے بھی زیادہ اور یہ میری سب سے بڑی طاقت بھی ہیں، اور سب سے بڑی کمزوری بھی۔ میں ان کی خاطر سب کچھ بدل سکتی ہوں، اپنا مزاج تو کیا اپنی خود پسندی کی عادتیں بھی"۔

ثمن آج ایک عزم کے ساتھ اک نیا گھر بنانے کھڑی ہوئی تھی جس کی بنیاد اور اسٹرکچر زبیر کی پسند کے مطابق تھا۔

"زبیر! آج میں نے آپ کے لیے اچار گوشت بنایا ہے"۔ گھر میں آتے ہی ثمن نے زبیر کے پسندیدہ کھانے کا بتایا۔

"کیا... اچار گوشت، یار! فٹافٹ کھانا نکالو، کتنا عرصہ ہو گیا گھر کا اچار گوشت کھائے ہوئے، لیکن تم

کیا کھاؤ گی، تمہیں تو سخت ناپسند ہے اچار گوشت؟"
زبیر کے ان الفاظ سے ثمن پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔
واقعی اسے تو خود بھی یاد نہیں تھا کہ اس نے کتنے سال پہلے یہ ڈش بنائی تھی۔
"نہیں آج میں سوچ رہی تھی کہ اس کے ٹیسٹ میں ایسا کیا ہے جو آپ کو اتنا پسند ہے، میں بھی آپ کے ساتھ کھا کر دیکھوں گی"۔ ثمن نے کہا تو زبیر حیران رہ گیا اور جلدی سے چینج کر کے کھانے کا انتظار کرنے لگا۔
آج زبیر کی پسند کا کھانا کھا کر ثمن کو تو ایک راحت ملی ہی تھی جبکہ زبیر کے چہرے پر ایک انوکھی خوشی دیکھنے والی تھی۔
آج ثمن کو بہت سکون ملا تھا زبیر کے مطابق رہنے کا پہلا چیپٹر جو اسٹارٹ ہو گیا تھا۔
"زبیر اس ویک اینڈ پر ہم ڈنر باہر کریں گے"۔
ثمن کی اس بات پر زبیر کو دوسرا شاک لگا تھا۔
"لیکن تمہاری فضول خرچی والی بات؟" زبیر نے سر کھجاتے ہوئے ثمن کو یاد دلایا۔
"ہاں وہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہی، چلیں رہنے دیں"۔ ثمن نے چڑایا۔
"ارے نہیں نہیں، میں تو مذاق کر رہا تھا"۔ زبیر نے ثمن کی ناراضی کے ڈر سے فوراً کہا۔
بہت موڈ میں آج دونوں نے ڈنر کیا، زبیر کو ثمن کا یہ چینج بہت پسند آرہا تھا۔
"ویسے بائی داوے آپ میں اتنی بڑی تبدیلی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" زبیر نے ثمن کی طرف بڑے شوق سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
"زبیر! اب ہمارے بچے بڑے ہو رہے ہیں، اور اب میں چاہتی ہوں کہ انہیں دنیا کا کچھ طریقہ اور سلیقہ آنا چاہیے، باہر کی دنیا کیا ہے کیسی ہے اور کیا کیا ہوتا ہے، اب انہیں اس لائف کی ضرورت ہے اور پھر اس سے بڑھ کر آپ کو یہ سب ایکٹیویٹی پسند ہیں"۔
ثمن نے بڑی صفائی سے وضاحت دی جس کا زبیر قائل ہو گیا۔
واپسی پر زبیر نے ثمن اور بچوں کو شاپنگ بھی کرائی۔
"واقعی میں کتنی بے وقوف تھی اتنی اچھی لائف چھوڑ کر اپنے خول میں قید ہو کر ایک ایسی لائف گزار رہی تھی جس میں نہ کوئی چارم تھا، نہ ہی زندگی کا کوئی مزہ"۔
رفتہ رفتہ ثمن نے گھر کے بہت سے معاملات زبیر کے مطابق ڈھال لئے اور زبیر کی توجہ بھی گھر کی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہو گئی، لیکن ایک پھانس تھی ثمن کے دل میں جو اکثر فارغ بیٹھے وقت اسے ٹینس کر دیتی تھی اور یہ سوچنے پر مجبور کرتی تھی کہ اگر میں یہ سب زبیر کی پسند کے مطابق نہ کرتی، تو زبیر اپنی زندگی میں میری جگہ کسی اور کو دے دیتا۔
اپنی بے وقتی پر ثمن کے آنسو خود بخود اڈ آتے تھے اور اس کا ذکر وہ بارہا ریبہ سے کرتی رہتی تھی اور اریبہ اس کی ڈھارس بندھاتی رہتی تھی۔
"یار ثمن! مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے"۔ زبیر نے ثمن کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھایا، ایک لمحے کو ثمن کا دل کسی انجانے خدشے کے تحت بہت تیزی سے دھڑکا، وہ زبیر کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔
"یار! مجھے پتہ ہے کہ تم بھیڑ اور لوگوں کے جھمیلوں سے بہت گھبراتی ہو اور کوفت محسوس کرتی ہو، لیکن میں کئی دنوں سے ایک بات تم سے کہنا چاہ رہا تھا پر کہہ نہیں پا رہا تھا"۔ زبیر نے تمہید باندھی۔ لیکن ثمن اس کی تمہید پر الجھن کا شکار نظر آنے لگی۔
"کیا بات ہے زبیر! پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہیں؟" ثمن نے ایک الجھن سے کہا۔
"ثمن! میں تمہیں بتاتا تھا ناں کہ میرا ایک بیسٹ فرینڈ ہے وارث وہ ملک سے باہر تھا اور اب آج کل ان کی پوری فیملی پاکستان آئی ہوئی ہے، اس نے میرا بہت ساتھ دیا ہے ہر معاملے میں، اب میں چاہتا

ہوں کہ ہم ان کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑیں۔ اگر تم کہو تو کل میں انہیں کھانے پر انوائٹ کرلوں؟" زبیر نے سوالیہ نظروں سے ثمن کو دیکھا۔

"آپ یہ کیسی بات کر رہے ہیں، اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے فوراً بلالیں، ویسے بہت عرصہ ہوا ہمارے ہاں کوئی مہمان نہیں آیا" ثمن نے خوشدلی سے کہا جس سے زبیر بھی خوش ہوگیا۔

☆..........☆..........☆

گھر کی صفائی اور ڈیکوریشن سے فارغ ہوکر ثمن کچن میں مصروف ہوگئی، تمام زبیر کی پسند کی چیزیں بنا کر ثمن نے گھڑی کی طرف نگاہ ڈالی، شام کے ساڑھے چھ ہو رہے تھے اور زبیر نے 7 بجے کا ٹائم دیا تھا سب کے آنے کا۔

فوراً ثمن اپنا حلیہ درست کرنے کے خیال سے باتھ روم کی طرف بھاگی، سب کام سے اور اپنی اور بچوں کی تیاری سے فارغ ہوکر ثمن، زبیر کا انتظار کرنے لگی۔ تقریباً 8 بجے سب مہمان انٹر ہوئے، ساتھ میں زبیر بھی تھا۔

آخر میں آتی لڑکی کو دیکھ کر ثمن کو شاک لگا، اسے زبیر سے یہ توقع نہیں تھی کہ اس لڑکی کے بہانے وہ اس کے پورے گھر کی دعوت کروائے گا۔

سب بہت خوش اخلاقی سے ملے اور مجبوراً ثمن کو ناچاہتے ہوئے بھی مسکرا کر ملنا پڑا۔

لیکن ثمن کا دل بہت خراب ہوگیا تھا، کیونکہ زبیر کا انداز سب سے بہت فرینکلی تھا اور خاص طور پر اس لڑکی کے ساتھ۔

جیسے تیسے ثمن نے یہ دعوت نمٹائی اور سب کے جانے کے بعد روم میں تھک کر لیٹ گئی، دو آنسو ثمن کے گال پر ڈھلک گئے جو کہ زبیر نے دیکھ لئے۔

"کیا بات ہے ثمن! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟ دو گھنٹے سے دیکھ رہا ہوں تم کچھ مرجھائی اور پریشان ہو؟" زبیر نے تشویش سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

بس پھر کیا تھا ثمن کو ایک ہمدرد اور کاندھے کی ضرورت تھی سو زبیر سے لگ کر ثمن رو پڑی۔

"زبیر! میں بہت تھک گئی ہوں اور دل بھی بہت گھبرا رہا ہے"۔

"اوہو یار! آج تم بہت بزی رہیں ناں، میری وجہ سے سوری یار"۔ زبیر کو ثمن کے اس انداز پر بہت پیار آیا، کیونکہ ثمن نے کبھی بھی زبیر پر اپنی تھکن ظاہر نہیں کی تھی۔

"چلو باہر لان میں چل کر باتیں کرتے ہیں، بہت دن ہوگئے ہیں ایک دوسرے کی باتیں سنے ہوئے"۔ زبیر زبردستی ثمن کو باہر لان میں لے آیا، ثمن کے دل میں بھی بہت غبار تھا اس لئے وہ بھی چپ چاپ ساتھ چلی آئی۔

"یار! یہ جو حارث ہے آج کل بہت پریشان ہے، عینا کی وجہ سے بلکہ پوری فیملی، میں نے ان لوگوں کا دل بہلانے کے لیے ہی یہ دعوت رکھی تھی، آج کل بہت کرائسس میں ہیں یہ لوگ عینا کی وجہ سے" زبیر نے اچانک حارث کی بات نکالی۔

ثمن نے زبیر کو فکر میں دیکھا تو اپنی پریشانی بھول گئی۔

"خیریت؟ عینا وہی ناں جو آپ سے بہت فرینکلی بات کر رہی تھی"۔ ثمن نے تصدیق چاہی۔

زبیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا ہوا اسے جو سب اس کی وجہ سے پریشان ہیں، دیکھنے میں تو بہت خوش باش تھی"۔ ثمن نے کریدا۔

"یار! وہ اپنے اوپر ظاہری خول چڑھائے ہوئے ہے، اصل میں عینا کی منگنی اس کے ایک فرینڈ کے ساتھ ہوئی تھی اور دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے، ابھی لاسٹ ایئر اس لڑکے کی ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہوگئی اور عینا ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ ہوگئی تھی، بہت علاج کروایا بہت ذہن بٹایا لیکن وہ آج تک علی

کی ڈیتھ قبول کرنے کو تیار نہیں ہے، ان سب کے پاکستان آنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ یہاں آ کر شاید کچھ بھول جائے۔ حارث کی وجہ سے وہ مجھ سے بہت کلوز رہی ہے بچپن سے اور میں نے بھی بہت کوشش کی کہ اسے حقیقی زندگی کی طرف لے کر آؤں لیکن سب ناکام رہے، ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس کا ذہن کسی ایک چیز کی طرف لگا دیں، لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کدھر اس کا مائنڈ کریں"۔ زبیر نے تشویش سے ساری بات بتائی۔

اور ادھر ثمن کے دل پر پڑا الجھنوں کا غبار زبیر کی اس بات سے پل میں ختم ہو گیا اور وہ اپنی عقل پر ماتم کرنے لگی۔

"جیسا ہم دیکھتے ہیں اور جیسا ہم سوچتے ہیں، بعض دفعہ ویسا نہیں ہوتا"۔ دور کہیں سے اریبہ کی آواز ثمن کے کانوں میں گونجی۔

اور ثمن اپنی سوچ پر شرمندہ ہو کر رہ گئی کہ میں نے اپنے شوہر کی محبت پر شک کیا اور اپنی زندگی کو اپنی سطحی سوچ سے کونین سے بھی زیادہ کڑوا کر لیا۔

"کیا ہوا کس سوچ میں گم ہو یار! ایک تو تم بھی ناں ہر کسی کی ٹینشن کو اپنی ذات کا حصہ سمجھنے لگتی ہو، اس لئے تمہیں میں ان سب مسائل سے دور رکھنا چاہ رہا تھا لیکن ابھی بیٹھا تو سوچا تم سے ڈسکس کر لوں شاید تم کوئی اچھا مشورہ دے دو"۔

زبیر نے ثمن کو گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کہا۔ زبیر کی سوچ دیکھتے ہوئے ثمن پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"پریشانی کی تو بات ہے اتنی اچھی لڑکی کے ساتھ اتنی بڑی ٹریجڈی ہو گئی، تو ہر بندہ سوچنے پر مجبور ہو گا، میں نے بھی اس کے لیے کچھ سوچا ہے۔ کیوں ناں اسے ایجوکیشن میں بزی کر دیا جائے وہاں اس کے فرینڈز بنیں گے، کولیگ اور یونیورسٹی کے ماحول میں وہ آہستہ آہستہ زندگی کی طرف آ جائے گی"۔ ثمن نے نیک نیتی اور خلوص دل سے اچھا مشورہ دیا، جسے سنتے ہی زبیر کے چہرے پر ایک خوشی جھلکنے لگی۔

"ثمینا کو پڑھائی کا بہت خبط تھا اور یہ ایک بہترین آئیڈیا ہے اس کا مائنڈ ایک طرف کرنے کا، یہ تو کسی نے سوچا ہی نہیں، سب اس کی شادی کا سوچتے رہے کہ کسی طرح اس کی شادی ہو جائے، ایک دو سال ایجوکیشن سے وابستہ رہے گی تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ میں ابھی حارث کو یہ مشورہ دیتا ہوں فون کر کے۔ تھینک یو ثمن تمہاری وجہ سے کوئی فیملی اتنی بڑی ٹینشن سے بچ جائے گی"۔ یہ کہہ کر زبیر نے ثمن کے ماتھے پر اپنے پیار کی مہر ثبت کر دی اور اندر حارث کو کال ملانے چلا گیا۔

"تھینک یو تو مجھے آپ کا کرنا چاہئے زبیر! میری محبت کا بھرم رکھنے کا، آج آپ نے مجھے بہت بڑی ٹینشن سے نکالا ہے، میں بے وقوف تھی ساری زندگی نہ آپ سے کچھ کہتی نہ پوچھتی، بدگمانی دل میں لئے اپنی زندگی خراب کر لیتی، اتنا پیار کرنے والا شوہر اور ہنستا بستا گھر میری اس بدگمانی کی بھینٹ چڑھ جاتا "کچھ باتیں چھپانے میں بھلائی ہے" اور "بعض دفعہ سامنے والے کو آپ کی ٹیلنگو کا اندازہ نہیں ہو پاتا کہہ دینے سے دل کا بوجھ اور بدگمانیاں ختم ہو جاتی ہیں"۔ آج اریبہ کے جملے ثمن کے تجربوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر لگ رہے تھے، ثمن کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آ گئی۔

"کتنا اختلاف تھا میری اور اریبہ کی سوچ میں اور آج میں ثمن زبیر اقرار کرتی ہوں کہ اریبہ تم سوچ اور سمجھداری میں مجھ سے بڑھ کر ہو، تم صحیح کہتی تھیں کہ محبت اظہار اور احساس مانگتی ہے جو کہ میں آج تک زبیر کو نہ دے سکی، لیکن تم نے بروقت اپنی دوستی کا حق ادا کیا اور مجھے غلط سمت جانے سے روک دیا"۔ تشکر کے آنسو ثمن کی آنکھوں میں جھلملانے لگے اور وہ بھی اریبہ کو تھینکس کی کال کرنے اندر چلی گئی۔

☆..........☆..........☆

ایقان علی

مکمل ناول



رات کی مخصوص ہوا بادلوں کو ادھر سے اُدھر اڑاتی پھر رہی تھی، تاریک سیاہ، انتہائی سیاہ آسمان پر کوہِ نور جیسے تارے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے، ہر تارہ اپنی چمک دمک میں چاند کو مات دیتا تھا، ساحل سمندر کی طرف

سے آنے والی اس نمدار ہوا میں ریت کی باس بھی شامل تھی۔ یہی تھکی ماندی ہوا جب روشنیوں سے جگمگاتے ریسٹورنٹ کے پاس سے گزری تو اس میں کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو بھی شامل ہو چکی تھی۔ سیاہ رات کی تاریکیوں کو مات دیتے اس جگ مگ کرتے ریسٹورنٹ میں معمول کی گہما گہمی تھی، لوگ آجا رہے تھے، دعوتیں اڑائی جا رہی تھیں، مستعد سے ویٹر قسم ہا قسم کے کھانے لئے آجا رہے تھے، اس اوپن ریسٹورنٹ کے ایک کونے میں لگی میز کے گرد کرسیوں پر وہ دو لوگ موجود تھے۔ ایک چوبیس سالہ خوش شکل سا لڑکا تھا جس کے چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی، وہ بلو نائٹ پر سفید اوپن شرٹ پہنے ہوئے تھا، وہ مسلسل باتوں میں مصروف تھا، اس کا مخاطب اس کا دوست تھا جو کہ عمر میں اس سے تین چار سال بڑا تھا، گندمی سی رنگت اور جاذب سے نقوش کے ساتھ ذہین آنکھوں کے مالک اس لڑکے نے گلاس لبوں سے لگا رکھا تھا۔

''تو تو واقعی جا رہا ہے؟ پاگلوں کو ٹھیک کرنے، میرا مطلب ہے خدمت کرنے؟'' اس نے آخری فقرے پر زور دے کر کہا۔ وہ مسکرا دیا۔



''ہاں''۔ کانٹے میں فش فرائیڈ کے آخری ٹکڑے کو لیتے ہوئے اس نے کہا۔

''یار! وہ پاگل ہوتے ہیں لیکن ہوتے تو انسان ہیں ناں، تیرے اور میرے جیسے انسان، دو آنکھیں، دو کان، ایک دل اور ایک دماغ، کسی انتہائی مرحلے سے گزرے بے چارے انسان، ان کا پاگل پن انتہائی شاک تو ہوتا ہے''۔ وہ رسان سے کہتا چلا گیا۔

''اینڈ آئی لو مائی پروفیشن، پاگل خانوں میں موجود ہر انسان ایک نئی کہانی ہوتا ہے، ہر کہانی کو ورق در ورق کھولنا، پڑھنا، سمجھنا، پرکھنا، الجھن تک پہنچنا اور پھر اس الجھن کو سلجھا دینا، یہی میرا کام ہے''۔

''جی جی، تبھی تو آپ کی لاہور ٹرانسفر ہوئی تو آپ نے ایک لمحہ بھی سوچے بغیر ہاں کر دی ڈاکٹر شاہ زیب صاحب!'' وہ مسکرا دیا۔

''بالکل''۔ اس نے دوسری ڈش میں سے ایک لقمہ لیا۔

''اس میں مرچیں بہت ہیں''۔

''ڈاکٹر شاہ زیب مصطفیٰ! اسے چکن چلی کہتے ہیں اس میں مرچیں نہیں ہوں گی تو کیا گلوکوز ہوگا؟'' ڈاکٹر شاہ زیب مسکرایا اور مشروب کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

''آپ سنائیں جناب علی حیان! دی گریٹ رائٹر، کب سرپرائز دے رہے ہیں اپنی نئی تصنیف کا؟'' روشن آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔

''بہت جلد''۔ وہ دونوں ہنس دیے تھے۔

رات کی مخصوص پرنم ہوا ہولے ہولے چلتی، خوشبوئیں اپنے اندر اسیر کرتی دور آسمانوں کا رخ کر رہی تھی، بھیانک تاریک آسمان پر اب چاندی جیسی روشنی پھیلاتا چاند نکل آیا تھا، اپنی اپنی ذات میں مگن تارے نجانے کہاں چلے گئے تھے، رات کا دوسرا پہر دم توڑنے کو تھا۔

☆..........☆..........☆

ابھی پچھلے ہفتے کی بات تھی جب اسے ٹرانسفر لیٹر ملا تھا، اسے لاہور کے ایک بڑے میڈ ہوم (المعروف پاگل خانہ) میں ٹرانسفر کر دیا گیا تھا۔ اس ٹرانسفر سے کوئی مسئلہ نہیں تھا، اسے کام سے غرض تھی، وہ چاہے یہاں کراچی میں ہو یا لاہور میں۔ چوبیس سالہ ڈاکٹر شاہ زیب مصطفیٰ کو ابھی صرف تین سالہ تجربہ رکھتا تھا لیکن اس کی ذہانت اور علم کے چرچے بہت تھے، ملک کے چند مشہور ماہر نفسیات میں اب اسے گنا جاتا تھا۔ نجانے کتنے حالات کے ستائے، مشکلات کے گھبرائے مریض اس کے ہاتھوں شفایاب ہو کر نارمل زندگی کی طرف لوٹ آئے تھے۔ سامان وہ پیک کر چکا تھا، کل چار بجے کی فلائٹ سے اسے لاہور جانا تھا، وہ تیار تھا۔

☆..........☆..........☆

لاہور میں ابتدائی کچھ دن تو اسے سیٹ ہونے میں لگے تھے۔ ایک اچھے علاقے میں اسے ایک فلیٹ مل گیا تھا، ایک دن لگا کر اس نے سارا فلیٹ دھویا تھا، سارے فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کی تھی۔ ایک کمرے کو بیڈ روم کی شکل دے کر اس نے باقی سارا اضافی سامان دوسرے کمرے میں بھر دیا تھا۔ لاؤنج میں ٹی وی اور صوفے سیٹ کر کے لاؤنج کی صورت دی تھی، کچن میں سارا سامان رکھ لیا تھا۔ دو کمروں کا فلیٹ ''گھر'' میں بدل گیا تو اس نے جاب کی طرف توجہ دی، لاہور کے اس معروف ہسپتال کے شعبہ نفسیات میں وہ ہیڈ کی حیثیت سے تعینات کیا گیا تھا۔ ابھی تک اس نے جوائننگ نہیں دی تھی، اسے ایک ہفتے کا وقت دیا گیا تھا، اس کے پاس ایک ہفتے کی فراغت تھی

سو اس نے تاریخی شہر کی سیر کی تھی اور کھل کر ہر شے انجوائے کی تھی، قسم قسم کے کھانے، تاریخی عمارتیں، تھیٹرز... روشنیوں کے شہر کا باسی تاریخی شہر کی گلیوں میں سرگشت کرتا پھرا تھا۔

☆.........☆.........☆

آج وہ پہلے دن ہسپتال آیا تھا۔

اس کے اعزاز میں تقریب منعقد کی گئی تھی۔

"آپ کی لاہور آمد ہمارے لئے باعث مسرت ہے، امید کرتے ہیں آپ کا ساتھ ہمارے لئے باعث فخر ہو گا"۔ ڈاکٹر دانیال نے جو کہ اس کے اسسٹنٹ تھے اعزازیے میں کہا تھا۔

یہ اس کی لاہور کے اس معروف ہسپتال میں ابتداء تھی۔

اور یہی ابتداء ہے ہماری اس داستان کی بھی۔

☆.........☆.........☆

وہ اسٹاف کے کچھ لوگوں کے ساتھ وزٹ پر نکلا تھا، وہ ایک لمبا کوریڈور تھا جس کے دونوں اطراف میں کمرے تھے، اندر کمروں میں موجود نفوس کی حرکات و سکنات سے باخبر رہنے کے لیے ہر کمرے میں ایک بڑی جالی دار کھڑکی تھی جس سے وہ اندر دیکھ سکتے تھے۔ وہ ہر کھڑکی کے پاس رُکتا اور اس کے ساتھ موجود ڈاکٹر دانیال اسے مریض (پاگل) کی تھوڑی سی بائیوگرافی بتاتے تھے، اس وسیع کوریڈور کے آخری کونے میں بنے کمرہ نمبر 21 کے سامنے وہ رُکا تھا۔

"یہ میمونہ بلال ہیں، ذہنی حالت بہت خراب ہے، لاہور کے پاس ہی دیہات سے ہیں"۔ ڈاکٹر دانیال نے بتایا۔ اس نے اندر نظر ڈالی، اندر ملگجا سا اندھیرا تھا، سامنے دیوار سے ٹیک لگائے وہ لڑکی بیٹھی تھی، اس کے اُلجھے بال اس کے شانوں پر بکھرے تھے، اس نے ٹیک لگا کر سر دیوار سے لگا رکھا تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں، پپڑیاں جمے ہونٹ تھے، وہ آہٹ پر بھی نہیں چونکی تھی، ویسے ہی بیٹھی رہی تھی آنکھیں موندے، حال سے بے حال، ہوش و حواس سے بیگانہ، فہم و ادراک سے پرے، دنیا سے بہت دور، کسی اور ہی دنیا میں۔ اس کی بند آنکھوں میں بھی وحشت تھی، حلقہ زدہ ان بند آنکھوں میں اداسی تیر رہی تھی۔

ڈاکٹر شاہ زیب نے ترحم بھری نگاہ اس پر ڈالی تھی، اداسیوں کے سائے پر پھیلانے لگے تھے، ایک بے بس سی نظر اس بے بس لڑکی پر ڈال کر وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا تھا، شاعر کی غزل سی وہ لڑکی فقیروں کے سے حالوں میں تھی۔

☆.........☆.........☆

"میمونہ بلال

عمر: اٹھائیس سال

وارث: بلال فاروق"

وہ اس کی رپورٹ دیکھ رہا تھا وہ پچھلے تین سالوں سے اس حال میں تھی، پچھلے سال اسے یہاں داخل کروایا گیا تھا۔

"میموری لاسٹ (Memory Losst) کا کیس نہیں ہے ڈاکٹر۔ فزیکلی وہ ٹھیک ہے، مینٹلی کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے"۔ ڈاکٹر دانیال کی بات پر اس نے ہنکارا بھرا اور پیچھے کو ہوا۔

''وہ کسی سے پیار کرتی ہے شاید اسی لئے...'' ڈاکٹر دانیال نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
''چوکیدار بتا رہا تھا راتوں کو کسی کا نام لے کر روتی ہے، اس کے گھر والوں نے کچھ نہیں بتایا، غریب لیکن شریف اور عزت دار لوگ ہیں، اپنے منہ سے کیا بتاتے اور کیسے بتا دیتے ڈاکٹر۔ ہو گا کوئی پیار و محبت کا چکر یقیناً''۔

وہ سوچوں میں گم تھا۔
''ٹھیک ہے ڈاکٹر! آپ میرے کچھ سیشن رکھیں ان کے ساتھ، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟'' اس نے فائلیں سمیٹتے ہوئے کہا۔

☆..........☆..........☆

شام کی نارنجی زردیاں سیاہی مائل تاریکیوں میں ڈھل رہی تھیں۔ وہ ہاتھ میں کافی کا مگ لئے بالکونی میں کھڑا تھا، نیچے سڑک پر روشنیوں کا سیلاب بہہ رہا تھا، اس کا ذہن انہی انسانوں کے درمیان اٹکا تھا جن کا آج وہ وزٹ کر کے آیا تھا۔

قسمت کے کھیل بھی عجیب اور نرالے ڈھنگ کے ہوتے ہیں اور انسان مہرے ہوتے ہیں ان کھیلوں میں جنہیں قسمت اور وقت اپنی مرضی سے استعمال کرتے ہیں۔

یونہی سوچتے سوچتے وہ دور، بہت دور نکل آیا تھا، اس کے ہاتھ میں جکڑا کافی کا مگ یخ بستہ ہو چکا تھا۔

☆..........☆..........☆

وہ آج بھی ویسے ہی بیٹھی تھی۔
دیوار سے ٹیک لگائے، آنکھیں موندے۔
چوکیدار نے بتایا وہ کل سے ایسے ہی بیٹھی ہے۔
''ایسے ہی کرتی ہے یہ، روتی ہے تو بس روتی رہتی ہے، چپ ہو گی تو مہینوں چپ رہے گی''۔

وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا اور اس کے پاس فرش پر ہی بیٹھ گیا، اسے غور سے دیکھا، وہ نزدیک سے بھی ویسی ہی تھی، مخبوط الحواس، بدحال سی... وہ کھنکارا، ہولے سے سلام کیا، وہ چونکی نہ آنکھیں کھولیں۔ وہ اسے اپنے بارے میں بتانے لگا، چھوٹی چھوٹی باتیں، اپنا نام، اپنی جاب کی باتیں۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' آپ سے تم تک کا سفر اجنبیت کی ایک دیوار گرا دیتا ہے لیکن اس نے کوئی دیوار نہیں گرائی تھی، ویسے ہی بے حس سی خاموش بیٹھی رہی تھی۔ ڈاکٹر شاہ زیب نے اس سے ڈیڑھ گھنٹے باتیں کی تھیں اور درمیان میں 6 سے 7 سوال کئے لیکن وہ کوئی بھی جواب دیئے بغیر آنکھیں موندے بیٹھی رہی تھی۔

وہ ڈیڑھ گھنٹے بعد باہر نکل آیا تھا، یہ پہلا سیشن تھا۔

☆..........☆..........☆

اور اگلے چھ دن تک وہ اس کے کمرے میں سیشن کے لیے جاتا رہا تھا، روز اس سے نئی باتیں کرتا، اسے چھوٹی چھوٹی باتیں بتاتا اور اسے بھی بات کرنے پر اُکساتا، لیکن وہ بنا جواب دیئے، بنا اپنے تاثرات بدلے بیٹھی رہتی۔
وہ پتھر تھی یا شاید پتھر سے بھی آگے کی کوئی چیز... لیکن وہ تھکا نہیں تھا، یہ سارا کھیل ہی اعصاب کا تھا۔

☆..........☆..........☆

وہ اپنے آفس میں بیٹھا کچھ فائلز اسٹڈی کر رہا تھا جب اچانک ہونے والی چیخ و پکار کی آوازوں نے اس کی

توجہ اپنی طرف مبذول کروائی تھی، وہ تیزی سے باہر آیا، کوریڈور کے آخری کونے میں بنے کمرہ نمبر اکیس کے سامنے مجمع تھا، ڈاکٹر، نرسیں اور چوکیدار... وہ بھاگتا ہوا ادھر آیا۔

میمونہ بلال بے قابو ہو رہی تھی، وہ مسلسل چلا رہی تھی اور اپنا سر آہنی جنگلے پر مار مار کر زخمی کر چکی تھی، اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا لیکن اس کی جنونی حالت سے ڈر کر کوئی بھی اس کے نزدیک نہیں جا رہا تھا۔ وہ تیزی سے کمرے کی طرف آیا اور اندر داخل ہوا جب نرس چلائی تھی۔

"ڈاکٹر! شی از ڈینجرس"۔

وہ سنے بغیر اندر آیا۔ وہ کھڑکی کی سلاخوں سے سر ٹکرا رہی تھی۔

"میمونہ... میمونہ پلیز ادھر سے ہٹو، ادھر آؤ"۔ وہ ہولے ہولے پچکارتے ہوئے کہہ رہا تھا، وہ تو پاگل تھی، پاگل کہاں سنتے ہیں؟ پاگل سننے سمجھنے لگیں تو پاگل کیوں کہلوائیں؟ اسے کھڑکی سے ہٹا کر بیڈ تک لے جانے کی دھکم پیل میں ڈاکٹر شاہ زیب کے ہاتھ بری طرح زخمی ہو چکے تھے، کچھ خراشیں گردن اور چہرے پر بھی تھیں لیکن وہ پروا کیے بغیر اسے بیڈ تک لایا اور نرس سے لے کر اسے انجکشن دیا تھا، چند لمحوں میں وہ پرسکون ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر شاہ زیب نے پاس کھڑی نرس سے پٹی کا سامان لیا اور اس کے زخموں کی بینڈج کرنے لگا۔ اگرچہ وہ خود لہولہان تھا لیکن اسے معلوم تھا، اس لمحے وہ مسیحا تھا اور مسیحا کا تو کام ہی زخموں پر مرہم رکھنا ہوتا ہے چاہے وہ خود لہولہان کیوں نہ ہو۔

☆..........☆..........☆

کمرے میں ہلکی سی تاریکی تھی، وہ دیوار سے ٹیک لگائے گھٹنوں میں منہ دیئے بیٹھی تھی، اس سے چند قدم کے فاصلے پر زمین پر دوزانو ڈاکٹر شاہ زیب بیٹھا تھا۔

"تمہیں پتہ ہے میں نے یہ پروفیشن کیوں چوز کیا؟" خاموشی میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔

"اپنی ماں کی وجہ سے، صرف اور صرف اپنی ماں کے لیے۔ دنیا کے لیے وہ بھی پاگل تھی، میری ماں نے گھر والوں کی مخالفت سے میرے باپ سے شادی کی تھی، محبت کی شادی۔ شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد انہوں نے میری ماں کو چھوڑ دیا اور دوسری شادی کر لی۔ میری ماں یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی اور پاگل ہو گئی۔ میں تب 6 ماہ کا تھا۔ اپنی اسی پاگل اور لاعلاج ماں کو دیکھ دیکھ بڑا ہوا، کبھی اسے پاگل پن کا دورہ پڑتا تو مجھے نوچ کھسوٹ دیتی اور کبھی اتنا چومتی کہ میں رونے لگتا۔ کبھی گود میں تھپکیاں دے کر سلا دیتی اور کبھی گود سے اٹھا کر فرش پر پٹخ دیتی۔ ایسی ہی بے توازن محبت نے مجھے عہد کرنے پر مجبور کر دیا کہ میں ڈاکٹر بنوں، ماہر نفسیات"۔ اس کی آواز میں صدیوں کی تھکان تھی اور آنسوؤں کی آمیزش بھی۔ وہ ویسے ہی شانے جھکائے سر گھٹنوں میں دیئے بیٹھی تھی۔

"ڈاکٹر بن گیا... پر ماں مر گئی"۔

خاموشی میں اداسیاں گھلنے لگی تھیں۔

"بس تب سے میں نے عہد کر لیا کہ کسی کے اپنے کو ویسے نہیں مرنے دوں گا، کم از کم اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں، ویسے جیسے میری ماں مر گئی تھی"۔ وہ خاموش ہوا تو اس نیم تاریک کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ بہت سارے لمحے ایسے ہی سرکتے گئے، ڈاکٹر شاہ زیب نے اسے دیکھا، اپنے زخم ادھیڑے وہ اسی آس پر بیٹھا تھا کہ شاید وہ کوئی لفظ کہہ دے، کوئی ایک لفظ، مرہم جیسی ٹھنڈک دینے والا لفظ، پر وہ مسیحا نہیں تھی۔

"کچھ تو کہو... کوئی بھی، ایک لفظ، اچھا، برا... گلہ... شکوہ... کچھ تو"۔

خاموشی جیت گئی تھی آج بھی، ہمیشہ کی طرح، وہ ڈیڑھ گھنٹے وہاں گزار کر باہر نکل آیا۔ کمرے سے گزر جانے سے پہلے وہ ذرا دیر کو رکا اور کھڑکی سے اندر دیکھا، ایک آخری نظر...

پتھر کی مورتی میں جنبش اتر آئی تھی، وہ چہرہ جو پہلے گھنٹوں کی قید میں اسیر تھا اب دیوار سے لگا تھا، وہ بے جان سی حلقہ زدہ زرد آنکھیں زندگی پا گئی تھیں اور اسے دیکھ رہی تھیں، سپاٹ سے چہرے پر پھیلے تاثرات وہ سمجھ نہ سکا، وہ تو بس ان آنکھوں کی کھوج میں دور بہت دور ڈوبتا گیا تھا۔

☆..........☆..........☆

نرس نے آج اسے نہلایا تھا، بال اچھی طرح بندھے ہوئے تھے، کپڑے بھی بدلے ہوئے تھے، اچھے تراشیدہ ناخن اور سلیقے سے لیا ہوا دوپٹہ، وہ بیڈ پر بیٹھی تھی اور دور کہیں گم تھی، پاس ہی کرسی پر وہ بیٹھا تھا۔

''کیا دیکھتی رہتی ہو خلاؤں میں؟'' اسے دور کسی غیر مرئی نکتے کو تکتا دیکھ کر اس نے سوال کیا تھا۔

بہت دیر بعد اسے لگا شاید وہ کچھ بڑبڑائی تھی، وہ نزدیک ہوا۔

''کیا؟'' وہ ویسے ہی بیٹھی رہی، صرف لب ہلے۔

''دوزخ''۔ وہ ساکت رہ گیا۔

''کیوں دوزخ کیوں دیکھتی ہو؟'' وہ خاموش رہی۔ وہ بھی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''آگ... شعلے...'' کپکپاتے لبوں سے چند لفظ ادا ہوئے تھے۔

''مجھے آگ نظر آرہی ہے... وہ... وہ... دور... اور یہ... میرے ہاتھوں پر... دیکھو... مجھے جلا رہی ہے... دیکھو...'' اس نے اپنا ہاتھ ڈاکٹر شاہ زیب کے سامنے کیا تھا۔ تھر تھر کانپتا اور لرزتا وجود... بے شمار چھوٹے بڑے زخموں سے بھرا ہاتھ۔

''یہ جل رہا ہے ناں، بہت درد ہے، میں اس آگ کو بجھا نہیں پا رہی، یہ میرے اندر دور کہیں اندر تک جلا رہی ہے، یہ دیکھو''۔

اس اڑھائی گھنٹوں کے طویل سیشن میں وہ خاموشی سے اس کی سنتا رہا تھا، اپنی کہے بغیر، وہ ڈرتی لرزتی اسے اَن دیکھی آگ دکھاتی رہی تھی۔

☆..........☆..........☆

وہ بیڈ پر لیٹا ہوا تھا، کانوں میں ہینڈ فری لگائے وہ اپنے دوست سے باتوں میں مصروف تھا۔

''ہاں سب ٹھیک ہے۔ ہاں ہاں، تو چکر لگا کبھی ادھر''۔ تقریباً بیس منٹ کی بات کے بعد اس نے فون بند کر دیا تھا۔

خاموشی چھائی تو اس کے ذہن میں میمونہ بلال اتر آئی۔ اس کا دل بہت چاہا تھا کہ علی حسان سے اس کی باتیں شیئر کرے لیکن ہمیشہ کی طرح اس نے کوئی بات شیئر نہیں کی تھی، وہ اُس کی پیشنٹ تھی اور اس سے متعلقہ ہر بات، ہر راز ایک امانت تھا اور ڈاکٹر شاہ زیب مر تو سکتا تھا لیکن خیانت نہیں کر سکتا تھا۔

لائٹ بند کر کے وہ سونے کے لیے لیٹ گیا تھا، ذہن کے پردوں پر دوزخ کی آگ میں جھلستی اور چلاتی وہ افسردہ سی صورت اتر آئی تھی۔

☆..........☆..........☆

''ہائے میمونہ! کیا حال ہیں؟'' وہ اندر داخل ہو کر بشاشت سے بولا اور کرسی پر بیٹھ گیا، بستر کی چادر درست

کرتی میمونہ بلال چونکی اور پھر خاموشی سے بیڈ پر جا بیٹھی۔

"پتہ ہے میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں کوئی نک نیم دیا جائے، کیا خیال ہے؟"

وہ بس اسے دیکھتی رہی۔

"مونا کیسا رہے گا؟"

میمونہ کی آنکھوں میں سرخ ڈورے نمودار ہونے لگے، اس کے دیکھتے دیکھتے وہ آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

"کیا ہوا؟" وہ گھبرایا۔

ہیرے جیسے شفاف موتی اس کے چکنے رخساروں پر بہتے چلے گئے تھے۔

"میرے ابو..." وہ کچھ توقف کے بعد بولی تھی۔

"وہ مجھے مونا کہتے تھے"۔ کمرے میں سناٹے کے قافلے اترنے لگے تھے، نیم تاریکی کے لباس میں ملبوس خاموشی ہولے ہولے پر پھیلا رہی تھی۔

☆..........☆..........☆

ستمبر کے آخری دن تھے، حبس زدہ دن آخری سانسیں لے رہے تھے، دھان کی فصل تیار کھڑی تھی، تھکی ماندی سی ہوا، دھان کی خوشبو سے بوجھل تھی۔ اونچے اونچے درختوں میں شور مچاتی، درختوں کو پتوں سے محروم کرتی، دھان کی خوشبو سے لبریز یہ ہوا اس مکان کے صحن میں داخل ہوگئی تھی، وہ بڑا سا کچا صحن تھا جس کے چاروں طرف کچی اینٹوں کی دیواریں تھیں، دائیں طرف کی دیوار کے ساتھ چند کیاریاں تھیں جن میں موسمی سبزیاں، ٹماٹر، پیاز، لہسن وغیرہ اگائے گئے تھے۔ ایک کونے میں آم کا پیڑ تھا جس کے سائے میں لیموں کے چند پودے کھڑے تھے۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ کیاری میں پھولوں کے پودے تھے، اسی دیوار میں لکڑی کا داخلی دروازہ تھا، دروازے کے بالکل بائیں جانب دیوار کے ساتھ ایک سائیکل کھڑی تھی۔ صحن سے آگے کھلا برآمدہ تھا جس میں سامنے تین کمرے تھے، برآمدے کی دائیں طرف کیاری کے پاس سیڑھیاں تھیں اور بائیں طرف غسل خانہ تھا۔ کھلے صحن میں بائیں دیوار کے ساتھ سرکنڈوں کی چھت والا اوپن باورچی خانہ تھی جس کی دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہوگئی تھیں، یہ سلطنت تھی اس شہنشاہ کی جو برآمدے کی چارپائی پر موجود جوتے اتار رہا تھا، تبھی اس نے اپنی بیٹی کو پکارا۔

"مونا بیٹی! پانی لے آؤ"۔

چند منٹ بعد سیڑھیوں کے ساتھ والے کمرے سے ایک لڑکی نکلی، وہ سانولی سی بیس سالہ لڑکی تھی، بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک، بال بندھے ہوئے اور شانوں پر دوپٹہ، اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا گلاس تھا۔

"یہ لیں ابو پانی۔ آپی تو نماز پڑھ رہی ہیں"۔

دوسرے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا، اندر ہلکی سی روشنی تھی۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ دو چارپائیاں، چند کرسیاں، دائیں طرف والی دیوار میں ایک شیلف تھی جس پر چند چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ بائیں دیوار کے ساتھ جائے نماز بچھی ہوئی تھی، جس پر ایک لڑکی بیٹھی تھی تشہد کے انداز میں۔ اس پاگل خانے والی لڑکی سے یکسر مختلف۔ روشن آنکھیں، حلقوں سے پاک، کھلی ہوئی رنگت، سفید دوپٹہ جو اچھی طرح لپیٹا ہوا تھا، وہ سلام پھیرنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رہی تھی، مخروطی انگلیاں، متناسب ناخن۔

باہر صحن میں باورچی خانے سے دھواں اٹھ رہا تھا اور تازہ پکی روٹیوں کی خوشبو ہر شے پر حاوی ہو رہی تھی۔

☆..........☆..........☆

برآمدے میں دسترخوان بچھا ہوا تھا، سامنے کی طرف ابو بیٹھے ہوئے تھے۔ ابو کے بائیں طرف امی تھیں اور دائیں طرف وہ سانولی سی رنگت والی لڑکی تھی اور عین سامنے مونا بیٹھی تھی۔ اپنی بہن کے برعکس اس نے کس کر دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔

"ابو! مجھے کچھ کتابیں لینی ہیں"۔ ابو نے لقمہ لیا۔

"ٹھیک ہے لے لینا۔ کل کالج جاتے ہوئے ماں سے پیسے لے جانا"۔

"اور مجھے جوڑا بھی لینا ہے"۔ امی نے اسے گھورا۔

"چپ کر جا، ابھی پچھلے مہینے سوٹ لیا ہے تو نے۔ بس کر جا"۔ وہ منہ بنا کر بیٹھ گئی تھی۔

"ناں ناں"۔ ابو نے اسے ساتھ لگا لیا تھا۔

"میری تانی تو میرے گھر کی رونق ہے، اسے نہ جھڑکیاں دے، میں اور پیسے دے دوں گا، تو بھلے دو جوڑے لے آئیں"۔ سانولی سی تانی مسکرا دی۔

"تھینک یو ابو!"

☆..........☆..........☆

وہ عشا کی نماز کے بعد وظیفے سے فارغ ہو کر اٹھی تو تانی اپنی چارپائی پر کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی، وہ بی ایس سی کر رہی تھی، ابو کا سب سے بڑا فخر، ان کی چھوٹی بیٹی سائنس پڑھ رہی تھی۔

"تانیہ! کتابیں سمیٹ لو اور جلدی سو جاؤ، پھر صبح اٹھتی نہیں ہو"۔ وہ کہہ کر لیٹ گئی اور "بس دس منٹ اور" کہنے والی تانی مزید ڈیڑھ گھنٹے پڑھتی رہی تھی۔

☆..........☆..........☆

"نی اٹھ جا"۔ امی کوئی سوویں دفعہ پکار چکی تھیں لیکن اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ بقول ان کے مردے جگانا آسان کام ہے لیکن تانیہ عرف تانی کو اٹھانا نہیں۔ امی کی ایک سو ایک ویں پکار پر اس نے سر تک لحاف تان لیا تھا۔ برابر والی چارپائی خالی تھی۔ نیچے فرش پر وہ جائے نماز پر بیٹھی تسبیح کرنے میں مصروف تھی۔

"تانیہ! اٹھ جاؤ، امی جوتا لے کر آنے والی ہیں"۔ اس نے تسبیح مکمل کی، جائے نماز لپیٹ کر رکھی اور اپنا بستر درست کرنے لگی۔

"ٹھیک ہے میں امی کو بھیجنے لگی ہوں"۔ کہہ کر وہ باہر نکل آئی تھی۔ امی باورچی خانہ میں چولہا جلانے میں لگی تھیں، وہ برات میں آٹا گوندھنے لگی۔ آٹا گندھ گیا۔ سالن گرم ہو گیا۔ چائے بن گئی۔ وہ پراٹھے بنانے لگی۔ ناشتہ وہی بناتی تھی، وہ آخری پراٹھا بنا چکی تو آنکھیں ملتی تانی نمودار ہوئی، وہ مل کر برآمدے میں دسترخوان بچھانے لگی۔

"نماز پھر نہیں پڑھی آج"۔ امی نے تانی کو گھر کا۔

"بہن سے سیکھ کچھ، تہجد تک قضا نہیں کرتی اور ایک تو ہے، نیستی پتہ نہیں کون سے سوٹے مار کر سوتی ہے"۔ ناشتے کے دوران بھی امی کے بیان جاری رہے تھے۔

☆..........☆..........☆

ناشتے کے بعد ابو دکان پر چلے گئے تھے، ان کی گاؤں میں کریانے کی دکان تھی، اچھی خاصی سیل ہوتی تھی،

اسی دکان کی کمائی سے یہ گھر کھڑا ہوا تھا۔ وہ گھر پر ہی رہتی تھی، پرائیویٹ بی اے کر چکی تھی، اس سے چھوٹی تانیہ گھر بھر کی لاڈلی اور رونق نزدیکی شہر کے کالج میں پڑھتی تھی۔ بی ایس سی کر رہی تھی، اس کے سارے لاڈ اٹھائے جاتے اور چھوٹی اولاد تو جتنی مرضی بڑی ہو جائے ہمیشہ چھوٹی رہتی ہے، البتہ امی اس کی کچھ عادات سے بہت خائف تھیں، جن میں سے ایک بھی دیر تک سونا تھا۔ اس کے باوجود وہ پیار بھی بہت کرتی تھیں اس سے اور وہ... میمونہ عرف مونا... اس کی بات الگ تھی، ابو کی منتوں مرادوں سے شادی کے سات سال بعد ہونے والی پہلوٹھی کی اولاد، بڑی بیٹی، وہ انہیں سب سے پیاری تھی، اور وہ پیاری ہوتی کیوں ناں؟ نماز و روزے کی پابند، پڑھی لکھی، سگھڑ، فرمانبردار، وہ دونوں ماں باپ کا غرور تھی۔

وہ گھر جنت تھا۔ خوشیوں اور محبتوں سے سجا، زندگی سے بھرپور، ایک مکمل گھرانہ، ایک مثالی خاندان۔

☆............☆............☆

وہ بولتے بولتے خاموش ہوئی تو پھر سے اس نیم تاریک کمرے میں سناٹا چھا گیا، وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"میں بھی ان سے بہت محبت کرتی تھی، اپنے آپ سے بھی زیادہ ابو سے، امی سے، تانی سے"۔ آخری لفظ پر اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"تمہارے ابو کا نام بلال فاروقی تھا؟"

"نہیں"۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ رئیس احمد تھے"۔

"تو بلال کون ہے؟ تمہاری فائل پر وارث کا نام بلال درج ہے"۔

خاموشیوں کے رتھ سیاہ چھت سے پتھریلے فرش پر اترنے لگے۔

☆............☆............☆

امی اور تانیہ شہر گئی ہوئی تھیں، ابو صبح ہی دکان پر جا چکے تھے، وہ گھر پر اکیلی تھی، پہلے تو سارے پودوں کو پانی دیا تھا پھر اندر کمروں کی حالت درست کی تھی، بستر ٹھیک کئے۔ کافی دیر گزری جب بیرونی دروازے پر دستک ہوئی تھی، وہ لحاف تہہ کرتے کرتے چونکی۔

"لگتا ہے امی اور تانی آ گئیں"۔

وہ باہر آئی، صحن پار کر کے دروازے تک گئی اور دروازہ کھول دیا۔ آنے والے کی پشت اس کی طرف تھی، دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ پلٹا، چوبیس پچیس سالہ وہ انسان اس کے سامنے کھڑا تھا، ہلکی ہلکی سی داڑھی، گندمی سی رنگت، ذرا اندر کو دھنسی آنکھیں کریم کلر کے کالر والے شلوار قمیض میں ملبوس۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی اور پھر جلدی سے سر پر دوپٹہ کیا اور دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔

آنے والا دروازے میں کھڑا تھا۔

"خالہ سے ملنے آیا تھا"۔

"امی، ابو گھر پر نہیں ہیں"۔ وہ ہولے سے بولی، وہ متذبذب سا دروازے میں کھڑا رہ گیا۔

☆............☆............☆

"لیں امی! میں کیسے اندر بلوا لیتی، نہ ابو گھر نہ آپ"۔ امی کو اس نے ابھی بتایا تھا کہ بلال آیا تھا اور اس نے

اسے دروازے سے لوٹا دیا، وہ فکر مند ہوئیں۔
"آپی! انہوں نے کیا کہہ دینا تھا، وہ کون سا غیر ہیں، خالہ زاد ہیں اور اب تو ویسے بھی وہ منگیتر ہیں آپ کے"۔ تانی ہولے سے مسکرائی، مونا ویسے ہی کھڑی رہی۔
"منگیتر محرم نہیں ہوتا تانی بی بی! میں تو نہیں بلا سکتی کسی بھی غیر محرم کو اکیلے گھر میں بھلے وہ کزن ہو یا منگیتر"۔
امی نے سانس بھری۔
"چل اچھا کیا دھی رانی! میں معذرت کرلوں گی حمیدہ سے"۔
لیکن معذرت کی ضرورت نہیں پڑی تھی، بلال نے کہا تھا غلطی اس کی ہے، اسے اطلاع دے کر آنا چاہئے تھا، اسے کوئی گلہ نہیں۔

☆............☆............☆

برآمدے میں ایک طرف سلائی مشین لئے مونا بیٹھی تھی، تانی کا نیا سوٹ سلائی ہو رہا تھا، تھوڑے فاصلے پر تانی کتابیں پھیلائے چٹائی پر بیٹھی تھی، باہر صحن میں بچھی چارپائی پر ابو بیٹھے دکان کا حساب کر رہے تھے، امی کیاری سے مرچیں توڑ رہی تھیں۔
"کل بھی فون آیا تھا حمیدہ کا۔ اب تاریخ مانگنے پر زیادہ اصرار کر رہی ہے وہ"۔ وہ ابو سے بات کر رہی تھیں۔
ابو نے ایک نظر انہیں دیکھا اور دوسری نظر برآمدے میں ڈالی۔
"کل فون پر آنے کو کہہ رہی تھی، میں نے ٹال دیا، اب بتائیں کیا کرنا ہے؟" ابو سوچ میں ڈوبے۔
"کرنا کیا ہے، اصرار کر رہے ہیں تو بلوا لو، مناسب سی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔
تانی اچھل پڑی۔
"ابو! میرے پیپروں کے بعد کی تاریخ رکھئے گا، میں نے کھل کر انجوائے کرنا ہے، دو مہینے گزار لیں"۔ ابو مسکرائے۔

☆............☆............☆

باہر صحن میں ہی تین چار پائیاں بچھی تھیں جن پر نئی نکور سفید کڑھائی والی چادریں بچھی ہوئی تھیں، ایک طرف کرسیاں رکھی تھیں، درمیان میں میز تھی جس پر مٹھائی اور پھول کی ٹوکریاں رکھی ہوئی تھیں۔
تبھی اندر سے تانی نمودار ہوئی، ٹرے میں چائے کے لوازمات سمیٹے، سب کو چائے پیش کر کے وہ بھی وہیں ٹک گئی۔
"بس تو پھر مارچ کی چھ تاریخ فائنل ہو گئی"۔
امی نے بسکٹوں کی پلیٹ حمیدہ خالہ کی طرف بڑھائی۔
"میں نے بس اور دیر نہیں کرنی اور آپ سے اپنی برکت لے جانی ہے"۔ حمیدہ خالہ مسکرائیں، برابر والی کرسی پر بیٹھا بلال بھی مسکرایا، تانی نے شرارت سے اسے دیکھا۔
"خالہ! آپی کا نام میمونہ ہے، برکت نہیں"۔ سب ہنسے تھے، امی نے حمیدہ خالہ کے منہ میں برفی ڈالی تھی۔
"مبارک ہو"۔
آم کے اونچے پیڑ میں شور مچاتے پرندے کھلکھلا کر مسکرائے تھے۔ شام کی نارنجی سرخیوں میں گلابی خوشیاں شامل ہو رہی تھیں، مسکراہٹوں کی نازک تتلیاں ہر طرف اڑ رہی تھیں۔

''میں اپنی بہو سے مل لوں''۔
خالہ نے اندر آتے ہی اسے گلے سے لگایا اور بلائیں لیں، مٹھائی کھلائی اور ہاتھ میں ہزار ہزار کے نوٹ تھما دیئے۔

☆..........☆..........☆

سیشن ختم ہوتے ہی وہ باہر آیا تھا۔ اسپتال کے کام نمٹا کر وہ شام میں گھر آیا اور کچن میں آ گیا۔ میکرونی کے لیے سبزیاں فرائی کرتے ہوئے بھی وہ میمونہ بلال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔
جب سب ٹھیک تھا، ہر شے اپنی جگہ تھی تو غلط کہاں تھا؟ غلط کیا ہو گیا تھا؟ وہ جلد جان لینا چاہتا تھا لیکن یہ جلد بازی اس کے پروفیشن کا حصہ نہیں تھی۔ میمونہ بلال نامی کتاب اسے آہستہ، آہستہ ورق ورق کھولنا تھی۔

☆..........☆..........☆

اگلے دن اسے ڈاکٹر دانیال نے بتایا تھا کہ رات اسے دورہ پڑا ہے اور وہ تب سے نیم بے ہوشی میں ہے، وہ جلدی سے اس کے کمرے میں آیا، اسے ڈرپ لگی تھی، بیڈ پر لیٹی وہ اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی۔
''میمونہ! ٹھیک ہو؟'' اس نے ہولے سے پوچھا۔ وہ خاموشی سے چت لیٹی دیواروں کو دیکھتی رہی پھر اچانک چلانے لگی، بے تحاشا ہذیانی انداز میں، وہ افسردگی سے اسے دیکھتا رہا تھا۔
''ہم نے ان کے وارث کو بلوا لیا ہے گاؤں سے، وہ آپ کے آفس میں ہے''۔ اسے بتایا گیا تھا۔ وہ آخری نظر اس پر ڈال کر آفس میں آ گیا۔
اٹھائیس انتیس سالہ وہ دیہاتی انسان اس کے آفس میں کرسی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ سفید شلوار قمیض میں ملبوس جو ذرا سی میلی ہو رہی تھی۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھایا تو ڈاکٹر شاہ زیب نے اس کی سرخ آنکھیں دیکھیں۔
''ڈاکٹر صاحب! وہ کیوں ایسی ہو گئی ہے؟ وہ کیوں ٹھیک نہیں ہو رہی؟'' اس کی آواز سے پریشانی چھلکتی تھی، اس کے چہرے پر تفکرات کا جال بنا ہوا تھا، وہ میٹرک پاس دیہاتی سا انسان سوال کناں تھا اور اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔
''تم اسے کب سے جانتے ہو؟'' ڈاکٹر شاہ زیب نے سوال کیا تھا۔

☆..........☆..........☆

وہ اسے بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا۔ اس سے دو سال چھوٹی اس کی خالہ زاد... میمونہ عرف مونا... وہ اسے تب سے پیاری تھی جب وہ چند ماہ کی تھی، وہ جب بھی ماں کے ساتھ خالہ کے گھر آتا اس کے گرد منڈلاتا رہتا، ننھی سی گڑیا اسے بہت عزیز تھی۔ وقت گزرتا گیا اور وہ ننھی سی گڑیا اتنی بڑی ہو گئی کہ اس سے پردہ کرنے لگ گئی۔ اس کی محبت بھی شدید ہوتی گئی، وہ دسویں میں دوسری بار فیل ہو گیا تو ابا کے ساتھ زمینوں پر کام کرنے لگا۔ تقریباً دو سال بعد ابا چل بسے، اماں کو ڈر ہو گیا کہ وہ بھی بیٹے کی خوشی دیکھے بغیر نہ مر جائیں، سو اس کی منگنی مونا سے ہو گئی۔
وہ تب بھی اس سے پردہ کرتی رہی، اماں نے بتایا تھا کہتی ہے منگیتر محرم نہیں ہوتا۔ وہ دل ہی دل میں مرعوب ہو جاتا۔ اس کی ہونے والی بیوی اس سے زیادہ پرہیزگار تھی۔ اس سے زیادہ پڑھی لکھی ہوئی، وہ اس بات پر جلن محسوس نہیں کرتا تھا، وہ دل و جان سے اس بات کو تسلیم کرتا تھا وہ برتر تھی۔ وہ خالہ کے گھر جاتا تو وہ سامنے نہ آتی، کبھی وہ اکیلی ہوتی تو اسے باہر سے ہی لوٹا دیتی۔ اسے اچھا لگتا تھا اس کا دروازے سے لوٹا دینا۔ جتنی پاکیزہ وہ تھی، اتنی ہی پاکیزہ بلال فاروقی کی محبت تھی۔ مونا کے علاوہ بھی اسے خالہ کے گھر میں سب سے محبت تھی، پیار کرنے والی

خالہ، بہت سارا خیال رکھنے والے خالو، نٹ کھٹ سی تانی...

تو یہ تھا بلال فاروقی اور ایسی تھی اس کی محبت، پا لینے کی چاہ سے بہت اوپر کی محبت... حقیقی محبت... آسمانی محبت...

☆............☆............☆

کمرے میں ہلکی سی خنکی تھی، فضا پرسکون تھی، ڈاکٹر شاہ زیب کے سامنے کرسی پر بیٹھا وہ دیہاتی انسان صافے سے آنکھیں صاف کر رہا تھا۔

"جب اتنی محبت کرتے ہو اس سے تو بے چاری کو پاگل خانے میں کیوں ڈال دیا؟" اس نے سر اٹھایا۔

"قسم رب کی جی! میں اور اماں راضی نہیں تھے، صرف چھوٹی کی وجہ سے مجھے یہ کرنا پڑا"۔ وہ چونک پڑا۔

"چھوٹی؟ کون؟"

"میری اور میمونہ کی دھی! اس کی وجہ سے میمونہ کو پاگل خانے میں داخل کروایا، میری دھی مشکل سے دو سال کی تھی، اس کو تو اپنی ہوش نہیں تھی، بچی کا خیال کیسے کرتی، ایک دو بار دورے میں بچی پر حملہ کیا تو اسے یہاں لے آئے"۔ وہ تفصیل سے بتاتا گیا۔

"اب بچی کو کون سنبھالتا ہے؟"

"میری اماں"۔

ڈاکٹر شاہ زیب نے ہنکارا بھرا۔

"اور میمونہ کی چھوٹی بہن کا کیا ہوا؟"

"وہ تو جی مر گئی تھی، میرے اور مونا کے ویاہ سے دو مہینے پہلے"۔

وہ ٹھٹک کر رہ گیا، اس دن بلال فاروقی کے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کے دماغ میں بہت سے سوال تھے جن کے جواب صرف میمونہ بلال کے پاس تھے۔ تبھی وہ آفس سے نکلا اور میمونہ بلال کے کمرے میں آیا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی تھی۔

"بلال آیا تھا، یہ تمہارے لئے دے گیا ہے"۔ بلال کی دی ہوئی چادر اس نے میمونہ کی طرف بڑھا دی۔

☆............☆............☆

موسم بدل رہا تھا، فضا میں خنکی کا احساس بڑھ رہا تھا، دسمبر ہولے ہولے قدم جما رہا تھا، باہر صحن کی چارپائی پر امی اور تانی کچھ کپڑے لئے بیٹھی تھیں جو ابھی بلال دے کر گیا تھا۔

"یہ تمہارے لئے ہے، بلال بھائی پشاور گئے تھے خاص تمہارے لئے لے کر آئے ہیں"۔ تانی نے ہلکی بھوری چادر اس کی طرف بڑھائی، اس نے چادر کی تہہ کھولی اور سر پر لے لی۔ بھوری کڑھائی والی چادر کے حلقے میں اس کا صبیح چہرہ دمک اٹھا تھا، تانی نے خوب سراہا تھا۔

☆............☆............☆

وہ تہجد کے وقت اٹھی تھی، احتیاط سے چادر اپنے گرد لپیٹ کر وہ باہر نکلی تھی۔ اندر کمرے میں اندھیرے کی وجہ سے اسے پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ تانی کی چارپائی خالی ہے، وہ غسل خانے کی طرف جا رہی تھی جب کسی آواز پر چونکی، آواز سیڑھیوں کی طرف سے آ رہی تھی، خوف کی ایک لہر ٹھنڈ بن کر اس کی ریڑھ کی ہڈی سے گزری تھی، وہ دبے قدموں سیڑھیوں کی طرف آئی۔

''لو جی! میں تمہارے لئے اتنی صبح جاڑوں کے موسم میں باہر بیٹھی ہوں اور تم کہہ رہے ہو پرواہ نہیں''۔ تانی کی آواز اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ رہی تھی، وہ فون پر معروف تھی، وہ کسی بات پر مسکرائی تو اس کی ہنسی کی آواز جلترنگ کی مانند سناٹے میں پھیل گئی۔

''یار! کل میری دوست ساتھ تھی تو میں مل نہیں سکی، آج لنچ کا وعدہ کرو تو ملنے کا سوچتی ہوں''۔ تانی کی آواز اس کے حواس معطل کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

''ٹھیک ہے، 12 بجے مجھے کالج سے پک کر لینا، امی کو کہہ دوں گی پریکٹیکل ہے لیٹ ہو جاؤں گی۔ لو یو....''۔ وہ اپنی سرشاری کے عالم میں کال کاٹ کر سیڑھیاں اتری لیکن صحن میں میمونہ کو دیکھ کر ٹھٹک گئی، رنگت فق ہو گئی، ساری سرشاری اور خمار دھند بن گیا، میمونہ چیل کی طرح اس پر جھپٹی تھی۔

''آپی! خدا کے لیے، خدا کے لیے کسی کو مت بتانا، ابو مجھے مار دیں گے آپی پلیز''۔

میمونہ نے اس کا موبائل لیا اور فرش پر دے مارا۔

''آپی! خدا کے لیے''۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میمونہ اسے کھینچ کر اندر کمرے میں لے گئی۔

☆............☆............☆

زردی دھوپ کی مری مری کرنیں صحن میں اتر رہی تھیں، آم کے درخت پر پرندے مسلسل شور مچا رہے تھے۔ رئیس صاحب کے گھر میں مرگ کا سا سماں تھا، چارپائی پر سر جھکائے بیٹھے تھے، پاس نیچے چوکی پر امی بیٹھی تھیں۔

''کب سے چل رہا ہے یہ سب؟'' ابو دھاڑے، کمرے کے دروازے میں سر جھکائے مجرم بنی کھڑی تانیہ عرف تانی لرز گئی، آج زندگی میں پہلی دفعہ ان کی دھاڑ سنی تھی۔

''سیکنڈ ایئر سے''۔ وہ اب فورتھ ایئر میں تھی۔ ابو کا سر شرم سے مزید جھک گیا، امی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''دو سال سے یہ گل کھلا رہی ہے؟''

''ابو! وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے''۔

''دو سال پہلے جب اس نے تجھ سے کہا کہ وہ تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو تبھی کیوں نہیں بتایا؟ تبھی اس نے ماں باپ کو رشتے کے لیے کیوں نہ بھیج دیا؟'' وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔

''شادی کرنی تھی، کہہ دیتی میں کر دیتا۔ یہ سب کیوں کیا؟''

''وہ کہتا تھا بات کرنے کو''۔

''اور تو چھوٹی دودھ پیتی بچی ہے؟ اس نے کہا اور مان لیا''۔ وہ ٹپ ٹپ رونے لگی۔

''پیار کرتی ہوں اس سے''۔

برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑی میمونہ سرخ پڑ گئی، سانس بھی نہ لے سکی، جب ہوش میں آئی تو اس کی طرف بڑھی اور تھپڑ رسید کیا۔

''بے حیا... بے شرم... باپ کے سامنے کیا بکواس کر رہی ہے''۔ یہ فقرے کافی نہیں تھے پر اس سے زیادہ وہ بول نہیں پائی تھی۔ ابو نے افسوس بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

''کالج بند، پڑھائیاں بند، جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا، مونا کی ماں اس کے لیے رشتہ ڈھونڈ بس''۔ فیصلے ہو گئے تھے۔



غریبوں کے پاس سب سے قیمتی متاع عزت ہی تو ہوتی ہے، تبھی وہ اپنی جان سے بھی زیادہ بڑھ کر اس کی حفاظت کرتے ہیں، جان جاتی ہے تو جائے عزت نہ جائے اور اب جب ان کی چھوٹی لاڈوں پلی بیٹی اسی عزت کو اونے پونے داموں بیچنے پر تلی تھی تو وہ چپ کیسے رہتے؟

تانی کی پڑھائی ختم کروادی گئی، رشتے والی کو رشتہ ڈھونڈنے پر لگا دیا، پر اچھا رشتہ کون سا کوئی پھل ہے کہ درخت سے توڑا اور کھالیا، متوسط طبقوں میں تو رشتے بھی سالوں میں ملتے ہیں۔

تانی چلاتی۔ "جب شادی کر رہے ہیں تو اسی سے کردیں"۔ اماں اور مونا اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے چپ کرواتیں، ایسی ہی ایک آواز ابو کے کان میں پڑی تھی۔

"ٹھیک ہے بلوالو اسے"۔



دھوپ کی نرم گرم سی کرنیں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں، بڑے صحن میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک پر ابو بیٹھے تھے اور دوسرے پر وہ لڑکا بیٹھا تھا۔ تانی نے اس کا نام فہد بتایا تھا۔ تانی، میمونہ اور امی اندر کمرے میں تھیں۔

"دیکھو برخوردار! میں گھما پھرا کر بات نہیں کروں گا اور نہ ہی اب اس کا وقت رہا ہے، صاف ستھری بات ہے کہ اپنے ماں باپ کو بھیجو تاکہ وہ جائز طریقے سے رشتہ مانگیں اور شادی کر کے معزز طریقے سے لے جاؤ اسے"۔ وہ کھنکھارا۔

"ایکچولی انکل! میرے پیرنٹس اس شادی پر راضی نہیں ہیں، میری منگنی میرے تایا کے گھر طے ہے، وہ اسے توڑنے پر تیار نہیں، میں دو سال سے انہیں منانے کی کوشش میں ہوں"۔

ابو نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"جب تمہارے ماں باپ راضی نہیں اور منگنی کروا چکے ہو تو تانی کو شادی کا لارا کیوں دیا؟"

"ریلیکس انکل! وہ راضی ہو جائیں گے"۔

"بس"۔ ابو نے ہاتھ اٹھایا اور بات کاٹی۔

"تم شادی کرنا چاہتے ہو تانی سے؟"

"جی!"

"تو ٹھیک ہے اس جمعہ کو بارات لے آؤ، خاندان مناتے رہنا بعد میں"۔ وہ تذبذب کا شکار ہوا۔

"لیکن انکل! ایسے کیسے؟ میرا مطلب ہے میرے پاس نہ رہنے کی جگہ ہے نہ جاب ہے، یہ کیسے ممکن ہے؟"

"یہ تمہارا مسئلہ ہے"۔

"دیکھیں انکل! مجھے دو ماہ کا وقت دیں، میں منالوں گا اپنے پیرنٹس کو"۔ ابو نے پھر بات کاٹی تھی۔

"دو سال میں نہیں مانے تمہارے ماں باپ، دو ماہ میں کیسے منالو گے؟"

"انکل پلیز! میں منالوں گا"۔

"دیکھو لڑکے!" وہ رسان سے بولے۔

"تم دو ماہ کی بات کر رہے ہو، میں دو لمحے بھی نہیں رک سکتا، حد سے زیادہ اعتبار تھا مجھے اپنی بیٹی پر جسے اس

نے چکنا چور کر دیا ہے، اس جمعہ کو نکاح کے لیے آسکتے ہو تو ٹھیک ورنہ اسے بھول جاؤ"۔

"انکل پلیز! ایسے مت کریں، میں اس سے پیار..."

"بس..." وہ دھاڑے۔

"نکل جاؤ میرے گھر سے اور آئندہ مجھے یہاں نظر مت آنا"۔ وہ اٹھا نہیں تھا۔

"انکل پلیز! یہ ظلم مت کریں، میں اس کے بغیر مر جاؤں گا"۔

"دیکھو! تم میرے مہمان ہو، مجھے کسی انتہائی عمل پر مت اکساؤ"۔ وہ اب بھی نہیں اٹھا تھا۔

"چلو اٹھو" انہوں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا لیکن وہ جیسے چارپائی سے چپک گیا تھا۔

"پہلے آپ مجھ سے وعدہ کریں دو ماہ انتظار کریں گے"۔

انہوں نے صحن میں نظر دوڑائی اور ایک طرف پڑی لکڑی اٹھا کر اس پر تان لی۔

"ماریں"۔ وہ مسکرایا۔ تازہ تازہ جوانی کا نشہ... پیار کا بخار... حد سے زیادہ خود اعتمادی اور حد سے زیادہ غصہ، شر ہی شر تھا۔ خیر کہاں تھی؟ انہوں نے پے در پے اس پر لکڑی برسا دی، اس کی سفید شرٹ پر سرخ لکیریں نمودار ہو گئیں۔

"ابو! پلیز مت ماریں"۔ تانی اندر کمرے سے چلائی، فہد کی نظر اس پر پڑی تو مسکرا کر اٹھا اور چلایا۔

"دو ماہ انتظار کرنا جان! میں ضرور آؤں گا، کسی اور کی ہو گئی یا یہ سب نہ مانے تو بھگا کر لے جاؤں گا، اٹھا کر لے جاؤں گا یاد رکھنا"۔ آخری فقرہ ابو کو کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ ابو کا لکڑی والا ہاتھ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ پھر وہ کسی کٹے درخت کی مانند زمین پر گرے تھے، ان کے رونے کی آواز دل چیر دیتی تھی۔

"ابو... ابو..." وہ سر میں خاک ڈال رہے تھے۔

"تو نے برباد کر دیا مجھے، تانی تو نے رول دیا مجھے، مٹی کر دیا"۔

☆............☆............☆

رات کا کھانا صرف ابو نے کھایا تھا۔

"مونا کی ماں" کھانے کے دوران انہوں نے امی سے کہا۔

"منع کر دے رشتے کرانے والی کو، رک جا دو مہینے، کر دے اس کی جو مرضی ہے"۔ آخری لقمہ لے کر انہوں نے ہاتھ صاف کیے۔ پاس کھڑی مونا کے سر پر ہاتھ رکھا اور چوکھٹ میں کھڑی تانی کو گلے لگایا۔ "خوش رہو"۔

خاموش سی رات بھیگی سی اتر آئی تھی۔ رات کا آخری کوئی پہر تھا جب سناٹے کی دبیز چادر کو چیخ کی آواز نے تار تار کر دیا۔

"مونا... مونا... تانی... جلدی آؤ... تمہارے ابو..."

☆............☆............☆

آم کا پیڑ خاموش کھڑا تھا، صرف چڑیاں تھیں جو شاخوں میں شور مچاتی تھیں، گلاب کے بوٹے پر چند کلیاں اوس میں بھیگی تھیں۔ بڑے صحن میں دریاں بچھی ہوئی تھیں جن پر سفید چادریں بچھی تھیں، دری کے دونوں طرف عورتیں ایک قطار میں بیٹھی تھیں اور ان کے درمیان گٹھلیوں کے ڈھیر تھے، کچھ کے ہاتھ میں سپارے تھے، خاموش گم صم سی امی حمیدہ خالہ کے کندھے سے لگی تھیں، برآمدے سے پرے کمرے کے دروازے کی چوکھٹ میں خستہ حال سی تانیہ بیٹھی تھی، سوجی آنکھیں، بکھرے بال، دور خلاؤں میں تکتی ہوئی۔ عورتوں کے درمیان سفید چادر

اوڑھے، ہاتھ میں سپارہ لئے مونا بیٹھی تھی۔

☆.........☆.........☆

ابو کو گزرے آج چوتھا دن تھا تقریباً سارے مہمان جاچکے تھے۔ابھی کچھ دیر پہلے حمیدہ خالہ اور بلال بھی چلے گئے تھے،انہیں رخصت کرکے وہ آئی تو امی صحن کی چارپائی پر لیٹیں اڑتے کبوتروں کو دیکھ رہی تھیں۔

"امی!" وہ پاس آ بیٹھی۔

"میں نے رشتے کرانے والی بوا کو بلوایا ہے"۔ وہ چونک پڑیں۔

"وہ آتی ہوں گی، بات کریں ان سے، ہفتے کے اندر اندر رشتہ ڈھونڈیں اور اس کی شادی کردیں بس"۔ امی حیرت سے اٹھیں۔

"لیکن مونا تیرے ابو نے..."

"بس امی بس۔ مجھے اب اور کسی کو نہیں کھونا، ابو کے فیصلے ابو کے ساتھ دفن کردیئے میں نے"۔

"لیکن مونا! وہ دو مہینے بعد..."

"امی! جب دو سال میں نہیں مانے اس کے ماں باپ تو دو ماہ میں کیسے مانیں گے؟ وہ بھاگ گئی تو کیا کریں گی؟" وہ چپ ہوگئیں۔

تھوڑی دیر میں رشتے کرانے والی اماں آگئی تھیں۔

"کوئی بھی لے آؤ اماں! اندھا، لنگڑا، رنڈوا... بس ہفتے کے اندر اندر..."

اور دو دن کے اندر اندر رشتہ حاضر۔

"45 سال کا ہے پر مرد کی عمر کون دیکھتا ہے آپا۔ رنڈوا ہے 14 سال کا ایک بیٹا ہے اور دو سال بڑی بہن ہے، مناسب گھر ہے اچھا کماتا ہے، دو بچے ہیں"۔

"بس کافی ہے"۔

سب آناً فاناً طے ہوگیا۔ کسی کو خبر نہ کی، تانی کو بھی نہیں، نہ ہی حمیدہ خالہ اور بلال کو۔ نکاح والے دن چار آدمی آگئے تو تانی کو جوڑا تھما دیا۔

"جلدی تیار ہوجا مولوی صاحب آگئے ہیں"۔ وہ حق دق۔

"میں نہیں کروں گی، زہر کھالوں گی پر نکاح نہیں کروں گی"۔ توقع کے عین مطابق وہ بولی تو مونا نے زہر کی گولیاں اسے تھمادیں۔

"لے کھا اور مرجا... جا مرجا... یا پھر تیار ہوجا، لیکن حرام موت مرنے سے پہلے سوچ لے اوپر ابو کو کیا منہ دکھائے گی"۔

"آپی! پلیز دو ماہ رک جاؤ"۔

"دو سیکنڈز بھی نہیں"۔

مولوی صاحب آگئے، وہ بھی تیار ہوگئی۔ خاموشی سے قبول ہے، قبول ہے بھی ہوگیا۔

"اس نے کہا تھا کسی اور کی ہوگئی تو اٹھا کرلے جائے گا تو لے جائے، دو ماہ کی تو بات ہے"۔ اس کی بات پر اماں حق دق رہ گئیں۔

☆.........☆.........☆

آسمان تاریک تھا، ان گنت تارے بھی اپنی جگمگاہٹ سے آسمان کی تاریکی کو دور نہیں کر پا رہے تھے۔ اس صحن میں چند افراد رخصتی کے انتظار میں تھے، اندر کمرے میں وہ دونوں موجود تھیں۔

"آپی! تم نے میری زندگی برباد کی ہے، صرف تم نے..." وہ دلہن بنی کھڑی تھی۔

"اور تم نے میرے باپ کی جان لی ہے، صرف تم نے..." وہ ٹھنڈے ٹھار لہجے میں بولی۔

"غلطی ہو گئی مجھ سے، مانتی ہوں، محبت کرنے لگ گئی اور آپ سب کو بتانے کی ہمت نہیں تھی، مانتی ہوں لیکن..." میمونہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بہت سن لی ہم نے یہ سب بکواس اور بہت ہو گئی، رخصتی کا وقت ہو رہا ہے، یہاں سے جا اور جو مرضی کر، ہمارے لئے مر گئی تو، بس بات ختم۔"

وہ افسردگی سے اسے دیکھتی رہ گئی، ٹکٹکی باندھ کر، انہماک سے اور پھر ہولے سے بولی تھی۔

"خدا کرے آپی! تمہیں کسی سے محبت ہو جائے۔"

اس کی بات پر میمونہ زور سے ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔

"بس... یہ بددعا؟ اتنی معمولی سی؟" وہ پھر سے ہنسی اور ہنستے ہنستے بولی۔

"اتنی حقیر سی بددعا؟ یاد رکھیں! میمونہ رئیس کا نفس اتنا کمزور نہیں کہ گلے میں پٹہ ڈال کر کتے کی طرح گلی گلی لئے پھرے، تیرے جیسی آتی ہوں کی ان چالوں میں، میرا اندر، میرا نفس اتنا کمزور نہیں کہ مجھے مٹی کر دے، رب سوہنے نے میرا نفس تیرے نفس جیسا نہیں بنایا۔"

دور اوپر بہت دور سات آسمانوں سے پرے کسی شے نے تو عرش ہلایا تھا، وہ بددعا پہنچی تھی یا غرور... کچھ تو تھا جو دور اوپر بہت اوپر گیا تھا۔

اور نیچے بہت نیچے تاریک آسمان میں تاروں کی چھایا تلے تانیہ عرف تانی وداع کر دی گئی تھی۔

غلط راستے پر چلنے والے سزا تو پا لیتے ہیں کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی طرح... اور سیدھے راستے پر چلنے والے بھی کبھی کبھی اپنی ہی کہی کسی بات کے شکنجے میں کس دیئے جاتے ہیں کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی طرح...

☆..........☆..........☆

سیشن کا وقت ختم ہو رہا تھا۔

"تو تمہاری خالہ نے جب تانیہ کے بارے میں پوچھا تھا تو..."

وہ ذرا دیر چپ رہی۔

"اس کے نکاح کے تین دن بعد اس کے کالج کے پاس بم دھماکہ ہوا، ہم نے مشہور کر دیا کہ وہ اس دھماکے میں مرنے والوں میں تھی، لاش نہ ملی اور نہ ملنی تھی۔"

"تو تم نے یا تمہاری مدر نے کبھی رابطہ کرنے کی بھی کوشش نہیں کی؟" میمونہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

☆..........☆..........☆

وہ میمونہ بلال کی میڈیکل رپورٹ تھی۔

"یہ MRI کی رپورٹ ہے ڈاکٹر" ڈاکٹر دانیال نے اسے بتایا۔

"یہ یہاں ایک چھوٹا سا دھبہ ہے، یہ انڈیکیشن دے رہا ہے کہ یہاں کچھ ہے۔ ننھی سی بڈ (Bud) کچھ ابھر رہا ہے، ٹیومر کی طرح، وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے، ڈپریشن یا پھر فزیکل انجری، دورے کی حالت میں اس کا سر ٹکرانا، یہ

اس کی وجہ سے ہو سکتا ہے"۔ وہ چپ ہوئے تو ڈاکٹر شاہ زیب نے سوال کیا۔
"تو پھر علاج کیا ہے؟ سرجری؟"
ڈاکٹر دانیال نے رپورٹ پھر سے سامنے کی۔
"ڈاکٹر یہ پچوٹری گلینڈ کے بالکل پاس ہے، اتنا پاس کہ پچوٹری کا عکس معلوم ہوتا ہے اور ہے بھی ننھا سا، مجھے ڈر ہے پچوٹری کو سرجری سے نقصان نہ ہو جائے"۔ وہ ذرا رکے۔
"اور پچوٹری کا Damage ہونا ساری باڈی کے ہارمونل سسٹم کو تباہ کر سکتا ہے"۔
"ڈاکٹر آپ کو نہیں لگتا ابھی سرجری کرنا رسک ہے؟" ان کے خاموش ہونے پر وہ بولا۔
"سو فیصد رسک ہے لیکن نہ سرجری کی صورت میں یہ رسک ہزار گنا زیادہ ہے"۔ ڈاکٹر شاہ زیب خاموش رہ گیا۔
"ہمیں انتظار کرنا ہی ہوگا ڈاکٹر!"
وہ ہنکارا بھر کر اٹھا اور میمونہ بلال کے کمرے میں آیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی تھی۔

☆............☆............☆

فضا میں نمی کا احساس بڑھ رہا تھا۔ اونچے آم کے پیڑ میں شور مچاتی چڑیاں بھی ٹھنڈ کی شدت سے کہیں دبک گئیں تھیں۔ دھند کی ایک مہین سی لہر نے ہر شے کو ڈھانپ لیا تھا۔
اندر برآمدے میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دونوں چارپائیوں کے درمیان میز تھی جس پر چائے کے کپ اور مٹھائی کا ڈبہ رکھا تھا۔
"آپ کے خاوند اور بیٹی کا بہت افسوس ہوا"۔ وہ بھاری سی عورت جو بقول فہد کے اس کی والدہ تھیں، کہہ رہی تھیں۔
یہ تانی کے نکاح کے دو ہفتے بعد کی بات ہے، وہ فہد کا رشتہ لے کر آئی تھیں، فہد کی آنکھیں روشن تھیں، وہ ماں باپ کو صرف تین ہفتوں میں منا چکا تھا لیکن دیر ہو چکی تھی۔
چائے کے کپ ٹھنڈے پڑے رہ گئے، وہ ساکت خاموش بے یقین سا بیٹھا رہ گیا، پندرہ منٹ بعد وہ دونوں تعزیت کر کے چلے گئے تھے، امی وہیں سر جھکائے بیٹھی رہ گئیں۔
"ہمیں انتظار کر لینا چاہیے تھا"۔ وہ ظہر کی نماز کے لیے وضو کرنے باہر آئی تو امی کی آواز سنائی دی۔

☆............☆............☆

"پھر... تمہاری اور بلال کی شادی ہو گئی؟" ڈاکٹر شاہ زیب نے سوال کیا۔
"ہاں... بہت دھوم دھام سے، خالہ نے اپنے سارے ارمان پورے کیے، میری امی رخصتی کے بعد اکیلی رہ گئیں، بلال اور خالہ نے ساتھ چلنے کو کہا پر وہ نہیں مانیں"۔
"بلال کیسا شوہر ثابت ہوا؟" وہ ذرا رکی۔
"بہت اچھا، بہت سے کچھ زیادہ اچھا، بہت زیادہ محبت کرنے والا"۔

☆............☆............☆

"وہ بہت کم گو ہے، مجھے معلوم تھا، وہ مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔ میں اپنی محبت کا اظہار کرتا، بہت ساری باتیں کرتا، وہ بس سنتی رہتی، اظہار نہیں کرتی تھی، یا شاید مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی"۔ بلال اس کے

سامنے بیٹھا بتا رہا تھا۔ ڈاکٹر شاہ زیب نے اسے MRI رپورٹ دکھانے کے لیے بلوایا تھا۔

"میں اسی میں خوش تھا کہ وہ میری تھی، بس میری اور یہ میرے لئے بہت تھا، نمازوں کی پابند، پرہیزگار، وفاشعار، نیک بیوی، شادی کے آٹھویں مہینے جب پتہ چلا وہ ماں بننے والی ہے تو مجھے لگا بس ہر کمی مکمل ہونے والی ہے"۔ وہ بولتا چلا گیا۔

"محبت کرتی تھیں تم بلال سے؟"

اگلے دن سیشن کے درمیان اس نے میمونہ بلال سے پوچھا۔

"محبت کسے کہتے ہیں؟ مجھے معلوم نہیں تھا، میرا دل اس کی طرح ہر وقت اسے دیکھنے کو ہمکتا نہیں تھا، نہ میں ہر وقت اس کی قربت چاہتی تھی، وہ دن میں کام پر جاتا، چلا جاتا... مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، اس سے دوری مجھے تڑپاتی نہ ہی جلاتی تھی، اس کا ساتھ میرے لئے باعث اطمینان تھا، باعث سرشاری نہیں تھا"۔ وہ ذرا رکی۔

"لیکن... لیکن پھر مجھے محبت ہو ہی گئی، شادی کے چھ مہینے بعد مجھے محبت ہو ہی گئی، کسی اور سے..."

وہ سن بیٹھا سنتا رہا۔

☆............☆............☆

وہ اس کے سسرال کا گھر تھا، میکے کے گھر سے بہت مختلف، چھوٹا سا صحن جسے اینٹیں لگا کر پختہ کر دیا گیا تھا، صحن کے عین وسط میں نیم کا پرانا درخت تھا، دروازے کے عین سامنے برآمدہ جس میں دو کمرے تھے، برآمدے کے دائیں طرف سیڑھیاں اور بائیں طرف باورچی خانہ۔

وہ عصر کی نماز پڑھ کر باہر آئی تو چھوٹے سے صحن میں حبس بھرا ہوا تھا، وہ حبس سے گھبرا کر چہل قدمی کے لیے سیڑھیاں چڑھتی اوپر آ گئی۔ چھوٹی سی چھت جس میں ایک طرف کبوتروں کا ڈربہ تھا، ایک ٹوٹی چارپائی اور چند بیکار اشیاء۔ یونہی ہر شے کو بے دھیانی سے دیکھتی وہ ٹہلتی رہی۔ شام کی ہلکی سی ہوا اندر تک سکون بھر رہی تھی۔ نارنجی پگھلتا سورج دور مغرب کی دلدل میں اترنے کو بے قرار تھا۔ یونہی بے دھیانی میں جھکتی اس کی نظر پرے گھر کی چھت پر جا پڑی، ایک گھر چھوڑ کر تیسرے گھر کی چھت پر کوئی کھڑا تھا، اُس کی طرف پشت کیے، اس نے سر پر ڈھلکتے دوپٹے کو اچھی طرح سر پر لیا جب وہ مڑا اور اس کی طرف رخ کیا۔ ہلکی ہلکی چلتی ہوا نے اس کے دوپٹے کو شانوں پر ڈھلکا دیا تھا۔ اسے احساس ہی نہیں رہا کہ ہوا کیا ہے۔ اس کی نظریں تو دور تیسرے گھر کی چھت پر کھڑے اُس انسان کی روشن آنکھوں میں گڑ گئیں۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا، اتنی بڑی بڑی سیاہ، انتہائی روشن اور ذہانت بھری نظروں سے۔ وہ جیسے کسی سحر میں تھی، کوئی جادو پھونک کر اسے اسیر کر دیا گیا تھا۔ وہ دو آنکھیں... بس صرف وہ دو آنکھیں جن میں روشنیوں کے دیپ بھڑ بھڑ جل رہے تھے، ہلکی ہلکی چلتی ہوا نے اس کے بال فضا میں بکھیر دیئے، اسے اپنا آپ سنبھالنے کا ہوش تک نہ رہا، وہ دو آنکھیں اس کی بے اختیاری پر مسکرا دیں، اس نے منہ میں دبے سگریٹ کا دھواں فضا میں آزاد کیا اور شان بے نیازی سے مڑ گیا، اور اس لمحے میمونہ بلال ہوش میں آئی، بال جکڑے، دوپٹہ سر پر ڈالا، کھینچ کر نقاب کیا اور دوبارہ ایک نظر اس چھت پر ڈالی۔ وہ جو نجانے کون تھا، نجانے کب چلا گیا تھا۔ بے تحاشا دھڑکتے دل کے ساتھ وہ لرزتے قدموں سمیت سیڑھیاں اتر آئی، دور سورج غروب ہو رہا تھا۔

☆............☆............☆

تیسری دفعہ اس کا ذہن بھٹکا تھا۔ اٹکتے اٹکتے اس نے الفاظ ادا کیے تھے۔ خیالوں میں کوئی عکس سا الجھ گیا اور ذہن کے پردوں پر وہ ایک پل حاوی ہونے لگا، مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر اس نے استغفار پڑھی تھی۔ نماز میں دھیان کے بھٹکنے پر۔

بعض دفعہ ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ استغفار کریں کس بات پر۔ ہم وقتی شیطان پر استغفار پڑھ پڑھ کر پھونکتے رہتے ہیں لیکن وہ مردود غائب نہیں ہوتا کیونکہ ماضی میں کہیں اس نے جڑیں پکڑلی ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ بھی استغفار کے پتھر ابلیس پر برسا رہی تھی اور وہ پتھر ان دو روشن آنکھوں کے سمندر میں چھپک چھپک گر رہے تھے۔

اور اس سے اگلی شام وہ بلاوجہ سیڑھیاں چڑھتی اوپر آئی تھی کسی نظر نہ آنے والی رسی سے بندھی۔ وہ اس حبس زدہ شام میں چھت پر بیقراری ٹہلتی رہی تھی۔ نظریں بھٹک بھٹک کر پرے تیسرے گھر کی چھت تک جاتی تھیں لیکن تلاش تلاش رہ گئی تھی۔

سونے جیسا پگھلتا سورج مغرب کی دلدلی کھائی میں اتر گیا۔ پرندوں کے غول اپنے آشیانوں کو لوٹنے لگے۔ وہ ویسے ہی اضطراب میں گھری، انگلیاں چٹختی چھت کا طواف سا کرتی رہی۔

مغرب کی اذانیں ہوئیں، خاموشی چھا گئی، نارنجی روشنیاں تاریکی میں بدل گئیں، وہ ویسے ہی ٹہلتی رہی۔

☆..........☆..........☆

عشاء کی نماز کے بعد وہ ہاتھ اٹھائے خاموش بیٹھی رہی، کیا مانگے؟ سمجھ ہی نہیں آیا، گھنٹوں ایسے ہی وقت گزرا جب بلال نے پکارا۔

"میمونہ! سوجاؤ۔ رات بہت ہوگئی"۔

وہ چونک کر اٹھی اور اندر چلی گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے بدلتے گزر گئی۔

☆..........☆..........☆

وہ دور اندھیروں میں کسی غیر مرئی نکتے کو دیکھ رہی تھی۔ پتھرائی ہوئی خشک آنکھوں میں بہتے تاثرات وہ سمجھ نہ سکا۔

"کون تھا وہ؟ جس سے تمہیں محبت ہوگئی؟" ڈاکٹر شاہ زیب کے سوال پر وہ چونکی اور یک ٹک اسے دیکھنے لگی۔

"پتہ نہیں... مجھے نہیں معلوم... پتہ نہیں کون تھا، کہاں سے آیا تھا، بس وہ تھا، وہی تو تھا"۔ وہ خواب کے عالم میں بول رہی تھی۔

"وہ میرے ہر لمحے میں اتر آیا تھا، ہولے ہولے اپنے پر پھیلاتا وہ میرے اندر کہیں سرائیت کر گیا تھا، میری رگوں میں میرے خون کے ساتھ بہنے لگا تھا... وہ میری شہ رگ تک آ گیا تھا"۔

☆..........☆..........☆

آج ساتواں دن تھا۔

وہ بے قراری کے عالم میں چھت پر ٹہل رہی تھی، دور تیسرے گھر کی چھت آج بھی ویران تھی، وہ آج بھی وہاں نہیں تھا، دھوپ کی تپش میں اضافہ ہو رہا تھا، وہ ستمبر کے آخری دن تھے، دھوپ اندر تک روح بھی جھلسا دیتی تھی اور وہ اس جھلسا دینے والی دھوپ میں روز چھت پر آجاتی اور گھنٹوں اس کے انتظار میں رہتی۔

وہ آئے گا۔ اس کا دل کہتا تھا، پتہ نہیں کیوں کہتا تھا۔
ایک گھنٹہ گزرا، دوسرا... تیسرا... ساتواں... نیچے خالہ آوازیں دیتے دیتے تھک گئیں تو خود اوپر آئیں، وہ جھلساتی دھوپ میں چھت پر بے ہوش پڑی تھی۔

☆............☆............☆

ڈاکٹر نے اسے مکمل بیڈ ریسٹ کا کہا تھا، پریگننسی کے آخری مہینے تھے، لاپرواہی کی صورت میں بچے کو نقصان ہو سکتا تھا۔
"کیوں گئی تھی میری دھی اوپر؟" خالہ دوپٹے سے ہوا جھل رہی تھیں۔ چھت کا پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا لیکن حبس حد سے زیادہ تھا۔ پاس ہی فکر مند سا بلال کھڑا تھا۔
"اندر... اندر ساڑ پڑتی ہے، سانس... نہیں آتی"۔ وہ بمشکل بولی۔ خالہ نے اسے ساتھ لگا لیا۔
طبیعت ذرا سنبھلی تو یہ پھر اوپر جا پہنچی، سب ارد گرد کی چھتیں ویران سنسان پڑی تھیں، ٹہلتے ٹہلتے ہانپ سی گئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی، وہ آج بھی نہیں تھا۔

☆............☆............☆

اس کی حالت بگڑنے لگی تھی، بلال اور خالہ ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل پیرا تھے، وہ دن میں دس بار گھر چکر لگاتا، خالہ نے اس کی امی کو بھی بلوا لیا تھا، بستر سے لگی موتا کو وہ اٹھنے بھی نہ دیتی تھیں اور ان سب سے بے نیاز وہ نجانے کیا کیا سوچتی رہتی۔ ایک لمحے کی نازک ڈور سے جڑی پھر سے ملن کی دعائیں کرتی، گرمی اور حبس سے بچنے کو بلال نے نیا کولر لگوایا۔ پھل کی ٹوکریاں، ہر کھانے کی شے موجود، پانی مانگتی تو دودھ حاضر... دودھ مانگتی تو شاید امرت مل جاتا، اس سب کے باوجود وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوگئی۔ اندر کی بے چینی بڑھتی چلی جاتی۔ اندر جو آگ لگی تھی وہ ٹھنڈے کمرے میں پڑے رہنے سے بھی نہ بجھتی تھی، برف سے نہا لیتی تب بھی نہیں۔

☆............☆............☆

"تم تو اتنی نیک پرہیز گار تھیں، تم کیوں نظروں سے پاگل ہوگئیں؟" ڈاکٹر شاہ زیب نے سوال کیا۔
"میں نے روکا، میں نے خود کو بار بار روکا، کئی بار روکا لیکن مجھ سے میں رکی ہی نہیں، میرے سے میرا اپنا آپ رکا ہی نہیں، آنکھیں بند کر لیں، اندر دل کی بھی بند کر دیں پر وہ تو رگوں میں خون کے ساتھ بہنے لگ گیا تھا۔ خود پر استغفار پڑھ پڑھ کر پھونکا پر وہ شیطان تھوڑی تھا جو اسیر ہو جاتا"۔ وہ بولتی گئی۔
"اور اس دن، اس دن میں نے پھر وہ آنکھیں دیکھیں، سترہ دن بعد، دوبارہ..."

☆............☆............☆

وہ درد سے بے حال تھی۔ نئی زندگی دنیا میں آنے کو بے تاب تھی۔ اس کی درد بھری چیخیں ان تینوں گھر والوں کی جان نکال دیتی تھیں۔
"بھرجائی میرے بس کی بات نہیں"۔ ہانپتی کانپتی دائی ماں نے ہاتھ کھڑے کر دیے تھے "ہسپتال لے جاؤ"۔
بلال نے کسی دوست کو فون کیا۔ کار آتے آتے پندرہ منٹ گزرنے تھے لیکن لگتے پندرہ صدیوں کے جیسے تھے۔ اسے بمشکل دروازے تک لایا گیا، بلال اسے سہارا دے کر اندر بٹھا رہا تھا جب اس کی بھٹکتی نظریں تیسرے گھر کے دروازے تک گئیں تھیں۔ میمونہ بلال کو لگا وقت جیسے تھم گیا ہے، کسی نے منتر پھونک کر ہر شے

کو چاند کر دیا تھا، اتھل پتھل ہوتی سانسیں ایک لے سے چلنے لگی تھیں، اندر دور وجود میں جلتی آگ کی بھٹی بجھ گئی تھی۔ وہ شخص دروازے میں کھڑا تھا، اپنی بڑی بڑی ذہین روشن آنکھوں سے اسے دیکھتا وہ اندر کہیں سرائیت کرنے لگا تھا۔ وہ شخص اگر مطب کھول لیتا تو دنوں میں مالا مال ہو جاتا۔ ایک نظر ڈال لیتا اور صدیوں کے مریض شفا پا لیتے۔ اپنی نظروں سے بس ایک نظر کا ہدیہ دے کر... اس کی چیخیں ختم گئی تھیں، درد تھا کہاں؟ وہ بھول گئی تھی۔ اب درد رہا ہی نہیں تھا، اب جب وہ سامنے تھا تو اور کچھ بھی نہیں رہا تھا، وہ خود بھی نہیں، بس وہ رہ گیا تھا صرف وہ...

گاڑی چل پڑی، وہ بند شیشوں سے سر باہر نکالنے لگی۔ شیشہ کھولا، وہ آدھی باہر نکل آئی۔ امی، خالہ نے بمشکل سنبھالا۔ وہ کیسے سنبھلتی، سنبھلتے ہوئے بھی کبھی سنبھلتے دیکھے کسی نے؟

درد رفع ہوئے، درد کے احساس دور ہوئے، کیا ہوا، کب ہوا، اسے معلوم ہوا ہی نہیں۔

"بیٹی ہوئی ہے ماشاءاللہ بڑی پیاری ہے۔" خالہ اس پر جھک کر نجانے کیا کیا کہہ رہی تھیں، وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

☆..........☆..........☆

وہ بولتے بولتے خاموش ہوگئی۔ ڈاکٹر شاہ زیب کے موبائل کی بیپ بجی تھی۔ اس نے دیکھا علی حسان کا ایس ایم ایس تھا۔ وہ اس سے ملنے ہسپتال آیا تھا۔ وہ میمونہ کو آرام کا کہہ کر باہر آ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ علی حسان کے ساتھ نزدیکی کیفے میں موجود تھا۔

"یار! کوئی محبت میں کس حد تک جا سکتا ہے؟" باتوں باتوں میں ڈاکٹر شاہ زیب نے سوال کیا، اس نے جوس کا گلاس میز پر رکھ دیا۔

"ویل! ڈیپنڈ کرتا ہے کہ آپ کو کس قسم کی محبت ہے، پا لینے کی چاہت ہے یا صرف دیدار سے غرض ہے، پا لینے کی محبت آپ سے محبوب کا قتل بھی کروا سکتی ہے اور دیدار کی غرض والی محبت میں آپ اپنا قتل بھی کر سکتے ہیں۔" وہ ذرا رکا۔

"خیر ہے ڈاکٹر صاحب! آپ کو تو محبت کا وائرس نہیں لگ گیا؟"

"نہیں یار!" وہ خاموشی سے کھانے لگا تھا۔

"نیکسٹ منتھ میں اپنے ناول کی اوپننگ کر رہا ہوں، گرینڈ پارٹی، دھماکے دار، تجھے ابھی سے دعوت دے رہا ہوں اور ایک اسپیشل کاپی تجھے پہلے ہی میل بھی کر دوں گا۔" وہ مسکرایا۔

"نوازش جناب کی۔"

☆..........☆..........☆

ڈاکٹر شاہ زیب نے سنگلاخ کھڑکی سے اندر دیکھا وہ سر جھکائے بیڈ پر بیٹھی تھی، سر پر دوپٹہ تھا، پاس ہی بیڈ کی پائنتی کے پاس بلال بیٹھا تھا جو مسکرا مسکرا کر کچھ چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہا تھا۔ کچھ کے جواب وہ دے رہی تھی اور کچھ کے نہیں۔ اسے پاگل خانے میں آئے دو سال ہونے والے تھے اور وہ بمشکل چھ سے سات بار اس سے ملا تھا۔ اب بھی وہ ڈاکٹر شاہ زیب کے اصرار پر اندر گیا تھا۔ بمشکل پندرہ منٹ بعد جب وہ باہر آیا تو اس کی آنکھیں بوٹی کی طرح سرخ ہو رہی تھیں، کمرے سے باہر آتے ہی وہ دیوار سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا، بلک بلک کر بچوں کی طرح، کوئی آپ کا اپنا ہو، صرف آپ کا اپنا... پھر بھی وہ آپ کا نہ ہو تو یہ احساس مرنے کو بھی مار دیتا

ہے۔ ڈاکٹر شاہ زیب نے اسے کندھوں سے تھام کر حوصلہ دیا تھا۔

"میں مر جاتا ہوں جب بھی اسے اس حال میں دیکھتا ہوں، میرے اندر کچھ سواہ (راکھ) ہو جاتا ہے"۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میرے سے میرا سب کچھ لے لیں، میرا گھر، میری زمینیں، میری زندگی... سب لے لیں پر اُسے ٹھیک کر دیں۔ بھلے وہ مجھ سے پیار نہ کرے، بھلے وہ جو مرضی کرے پر ٹھیک ہو جائے، میری جندڑی لے لیں، اسے دے دیں"۔

امراض کا علاج روپے پیسے سے ممکن ہوتا تو ہر انسان اپنے پیارے کی زندگی کے لیے سونے چاندی کے ڈھیر لگا دیتا۔ بھلے اس کے لیے اسے اپنا آپ بیچنا پڑتا۔

☆............☆............☆

"وہ بہت عجیب سی ہو گئی تھی، نہ ہنسنا، نہ بولنا، نہ بات کرنا نہ بات سننا۔ بس چپ چاپ لیٹے رہنا، نہ کا کی کی پرواہ، نہ میری نہ کسی اور کی"۔ وہ ڈاکٹر شاہ زیب کو بتا رہا تھا۔

"کوئی کہتا آسیب ہے، دم کروا لیجیے، ڈاکٹر کہتے ہیں ڈپریشن ہے، ہم اسے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کرتے"۔

☆............☆............☆

وہ پلنگ پر تکیوں کے سہارے بیٹھی ہوئی تھی، وہ اندر داخل ہوا اور اس کے سامنے جا بیٹھا۔

"تمہیں جو مسئلہ ہے مجھے بتا دو، میں حل کرنے کی کوشش کرتا ہوں"۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں"۔

"میری کوئی بات بری لگی؟"

"نہیں؟"

"اماں کی؟" نفی میں گردن ہل گئی۔

"تو پھر اتنی چپ کیوں رہنے لگی ہو، گم صم"۔ بلال نے ہولے سے اس کے یخ بستہ ہاتھ تھام لئے۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا، وہ آنکھیں "وہ" آنکھیں نہیں تھیں جو شفا بانٹتی تھیں، جن میں ڈوب مرنے کو دل کرتا تھا، جن کو ساری زندگی بس دیکھنے کو دل کرتا تھا۔ وہ کوئی اور تھیں...

"میں ٹھیک ہوں"۔ وہ بمشکل بولی۔

☆............☆............☆

طبیعت ذرا سنبھلی تو پھر سے چھت پر جا چڑھی، تیسرے گھر کی چھت خالی نہیں تھی۔ وہ بہت سے صفحات پھیلائے بیٹھا تھا، انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ اس پر نظر پڑی تو وہ بس اسے ہی دیکھے جا رہی تھی، یک ٹک، بغیر پلکیں جھپکائے... ذرا جو آنکھیں بند کرتی تو وہ کھو جاتا... آسن جمائے، ٹکٹکی باندھے، ہاتھ باندھے، عشق کی نمازیں ایسے ہی تو ادا ہوتی ہیں۔ وہ داسی بنی ہاتھ باندھے کھڑی رہی اور وہ دل میں بسنے والا راجہ ہولے ہولے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اسے دیکھتا رہا، اسے تکتا، منتر پڑھتا، اسے زیر کرتا رہا، وہ مسحور ہوتی گئی، محصور ہوتی گئی۔ موسم کی حدتیں دم توڑ گئیں، شامیں ڈھل گئیں، اندھیروں کے قافلے آن پہنچے۔

☆............☆............☆

اور پھر وہ معمول بن گیا، آنکھوں آنکھوں میں دور بہت دور تک نکل آنا اور ڈوب جانا... اندر اندر تک ٹوٹ جانا، چند دنوں کی بچی بلکتی اور وہ یادوں میں گم بیٹھی رہتی۔

"دودھ مانگ رہی ہے" خالہ اس کے کندھے ہلاتیں۔ اسے کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ وہ حال سے بے حال مست تھی۔

اور اس شام جب وہ اپنی منڈیر سے لگی تیسرے گھر کی چھت پر نظریں جمائے کھڑی تھی، بلال اوپر آ گیا۔ وہ اسے آوازیں دیتا رہا اور وہ بے خبر کھڑی رہی۔ وہ دو گھنٹے وہاں کھڑا اسے دیکھتا رہا کہ اب تھکے گی، اب تھکے گی پر وہ نہ تھکی... وہ کھڑے کھڑے تھک گیا، وہ آخری سیڑھی تک آیا اور تیسرے گھر پر نظر ڈالی، وہاں بھی کوئی تھا، وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

☆..........☆..........☆

ڈاکٹر شاہ زیب نے اس کی آنکھوں میں پانی بھرتے دیکھا، ایک آنسو پلکوں کی سرحد پار کر کے اس کے گال پر لکیر کی صورت بہہ نکلا۔

"میں نے سب دیکھ لیا اس شام، میرا دل مجھے کچھ سمجھانا چاہ رہا تھا پر میں سمجھنا نہیں چاہتا تھا، کیسے ممکن تھا۔ وہ... اتنی نیک، اتنی پاک... کیسے، نہیں..." وہ نفی میں گردن ہلاتا بول رہا تھا۔

☆..........☆..........☆

رات تیزی سے بھیگ رہی تھی۔ وہ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔ دور تاریکی کا لبادہ اوڑھے در و دیوار عجیب ہولناک دکھائی دے رہے تھے، وہ ہولے ہولے چلتا اس کے پاس آ بیٹھا۔

"میمونہ..." ہولے سے پکار کر اس نے اُس کا سرد ہاتھ تھام لیا۔

"میں جو پوچھوں گا، سچ سچ جواب دو گی؟"

وہ اسے دیکھنے لگی۔ بغور...

"اس سے پیار کرتی ہو؟" میمونہ نے نظریں جھکا لیں۔ حلقوں سے ڈھکی آنکھیں موند لیں۔

"ہاں"۔

بلال کی آنکھوں میں کرب اتر آیا، اندر دور کوئی ہولناک آواز میں چلایا تھا اتنی زور سے کہ سیاہ درخت پر بیٹھی چمگادڑوں کے غول دور فضا میں اڑ گئے تھے۔

"کیوں؟" آنسوؤں سے رندھی آواز میں کتنا عجیب سوال کیا تھا۔

"پتہ نہیں کیوں؟" جواب عجیب ترین تھا۔

☆..........☆..........☆

"تم نے اس سے کچھ نہیں کہا جب اُس نے کہا کہ اسے کسی اور سے محبت ہے؟"

"کیا کہتا، گلا گھونٹ دیتا، کیسے گھونٹ دیتا"۔ وہ خاموش رہ گیا۔

"اور وہ آدمی؟"

"میں اگلے دن بے غیرت بن کر گیا تھا اور اسے دھمکی بھی دی کہ آئندہ میری بیوی سے دور رہے، پر وہ رُکا نہیں"۔

☆..........☆..........☆

اگلی شام وہ دونوں وہیں تھے، ایک منڈیر کے ادھر اور دوسرا اُدھر... نگاہوں سے بات کرتے، سوال جواب کرتے... نظروں سے...

خالہ جب نیچے بچی کو چپ کرواتے کرواتے تھک گئیں تو بمشکل اوپر آئیں اور اُن دونوں کو دیکھ کر آنکھیں اور منہ دونوں کھل گئے۔ اسے گھسیٹ کر نیچے لے کر آئیں۔

"غیرت کر، شرم کر مونا! کسی کی بیوی ہو کر نین مٹکے کر رہی ہے" ۔انہوں نے اسے جھنجھوڑا۔

"پتھروں سے سنگسار کر دیں گے گاؤں کے لوگ، ماضی کی نمازوں کی شرم کر لے، اب نماز چھوڑ دی ہے تو کیا اللہ بھی چھوڑ دیا؟ اس کا ڈر کرنا بھی چھوڑ دیا؟" وہ اسے جھنجھوڑ کر کہتی رہیں، وہ سر جھکائے سنتی رہی۔ پھر اٹھی، وضو کرنے چل دی، آ کر مصلیٰ بچھایا اور ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی، اگلے ہی لمحے نماز توڑ دی اور الٹے قدموں اندر بھاگی۔

اسی رات اماں اسے سارا کچھ بتاتی گئیں، وہ ساری باتیں، وہ سارے خدشے جو وہ جانتا تھا، وہ چپ چاپ سنتا رہا، بے شرم بن کر، ہاں میں جانتا تھا میری بیوی کسی اور سے چکر چلا رہی ہے، غیرت سے مر نہ جاتا۔

☆..........☆..........☆

ویسے ہی شام ڈھل رہی تھی۔ ویسے ہی وہ دو دیوانے دنیا اور دنیا والوں سے بے نیاز اپنے آپ میں مگن نینوں سے ہم سخن تھے۔

تبھی کوئی اسے پیچھے ہٹاتا آگے آیا اور منڈیر کے دوسری طرف اتر گیا، وہ بلال تھا۔

اس آدمی کو گریبان سے پکڑ کر پے در پے مکوں کی برسات کر دی تھی، ایک کے بعد ایک، نکسیر پھوٹ گئی، پھوٹتے رہے خون کے فوارے، وہ پاگل ہو رہا تھا۔

ادھر میمونہ چلا رہی تھی۔

"اسے نہ مارو... مجھے مارو... اسے نہ مارو"

لیکن وہ اسے آج مار ہی دینا چاہتا تھا، لمحوں میں مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔

☆..........☆..........☆

پنچائت لگ گئی تھی، گاؤں کے بڑے بوڑھے جمع تھے، بلال اور اس کی ماں سالوں سے وہاں وہ رہے تھے، ان کی شرافت پر کسی کو شک نہیں تھا، وہ آدمی جس نے اپنا نام فیضان بتایا تھا چھ ماہ پہلے اپنی ماں کے ساتھ ان کے گاؤں آیا تھا اور کرائے پر رہ رہا تھا۔

پنچائت نے بلال اور اس کی ماں کا ساتھ دیا تھا۔ فیضان کو وارننگ ملی تھی بلال اور اس کے گھر سے دور رہنے کی ورنہ نتائج کا ذمہ دار وہ خود ہوتا۔

میمونہ کو بلال کچھ دنوں کے لیے ماں کے گھر چھوڑ آیا۔ وہ اسے سارا دن نصیحتیں کرتیں، مرے باپ کی شرم دلاتیں۔ وہ ایک ہفتہ ماں کی طرف رہی اور وہ ایک ہفتہ آزمائش تھا دونوں کے لیے۔ وہ کبھی گم صم بیٹھی رہتی، کبھی زار زار رونے لگتی۔ امی ہول ہول جاتیں اور پڑھ پڑھ کر پھونکتیں۔

ایک ہفتے بعد واپس آئی تو سیدھی اوپر... خالہ نیچے کھینچتی رہیں پر وہ ان کو دھکا دے کر اوپر آ گئی۔ وہ اوپر ہی تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اماں بلال کو بلا لائیں، وہ اسے نیچے لایا اور پیروں میں زنجیر ڈال دی۔

☆..........☆..........☆

"زنجیر... ویسی جیسی ڈھورڈنگروں کے ڈالتے ہیں"۔ وہ بلک بلک کر رو دیا۔

"وہ ہاتھوں سے، پیروں سے، دانتوں تک سے زنجیر کاٹنے کی کوشش کرتی رہتی، زور زور سے چلاتی، رونے لگ جاتی... سارا پنڈ کہتا تھا میری بیوی پاگل ہوگئی ہے"۔

☆......☆......☆

اس دن وہ نجانے کیسے زنجیر کھولنے میں کامیاب ہوگئی۔ خالہ اماں اندر غسل خانے میں تھیں، ہانپتے کانپتے اٹھی اور باہر نکل آئی۔ تیسرے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ اس کی ماں اندر صحن میں سبزی کاٹ رہی تھیں، وہ اس کی طرف بڑھی۔

"مجھے رکھ لو، مجھے اپنے گھر رکھ لو ہمیشہ کے لیے"۔ وہ اس کے پیروں سے لپٹ گئی اور منتیں کرنے لگی، زور سے رونے لگی۔

"ہٹ، ہٹ"۔ اس کی ماں ہٹاتی رہی اور یہ پیروں سے لپٹتی رہی۔ اس کی ماں نے ڈنڈا اٹھایا اور اس پر برسا دیا۔

"دفع ہو جا... چل... جا..." وہ مارتی جا رہی تھیں اور بھگا رہی تھیں، یہ مار کھا رہی تھی اور پیروں سے لپٹے جا رہی تھی۔

اف ہائے... چہ چہ... ایسی محبت... ایسا جنون... توبہ توبہ... ناممکن لگتا ہے ناں؟ ایسے تھوڑی ہوتا ہے، پر ایسے ہی تو ہوتا ہے۔ جنون ایسے ہی کرواتا ہے، دروازے دیواریں پھلانگ جاتے ہیں جنونی گلے کاٹ لیتے ہیں، گلے کاٹ دیتے ہیں۔

اس کی ماں نے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا، یہ دروازے سے لپٹ لپٹ کر روتی چلاتی رہی، آوازوں پر خالہ اماں آئیں۔ زخموں سے چور چور، حال سے بدحال، بکھرے بال... خونم خون چہرہ... پھٹے کپڑے... مٹی مٹی... بوڑھی جان بمشکل اسے لئے گھر تک لائیں پر عزت کی جو دھجیاں وہاں بکھری تھیں وہ نہ اٹھا سکیں۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر شاہ زیب نے پانی کا گلاس بھرا اور اس کی طرف بڑھایا، وہ گلاس تھامے سر جھکائے بیٹھ گیا، تبھی باہر شور ہوا، ہانپتی کانپتی نرس اندر آئی۔

"روم نمبر 21 کی پیشنٹ کو دورہ پڑا ہے"۔

وہ دونوں تیزی سے باہر کی طرف بھاگے تھے۔ اس وسیع کوریڈور کے آخری کونے میں سنگلاخ کھڑکی کے اس پار وہ بیڈ پر تھی۔ ویسے ہی زبوں حالی کا شکار، بکھرے بالوں اور حلقہ زدہ آنکھوں والی میمونہ بلال۔ نرسیں اسے سنبھالتے سنبھالتے تھک گئی تھیں۔ بلال ڈاکٹر شاہ زیب کے ساتھ کمرے تک آیا تھا لیکن دروازے پر پہنچ کر وہ رک گیا اور بلال کو اندر کیا۔ اُس لمحے اسے مسیحا سے زیادہ محبت کی ضرورت تھی، سکون اور ادویات اور انجکشن کی بجائے محبت کے دو بول، تحفظ بھری چھایا کی ضرورت تھی۔

چوکھٹ میں کھڑا بلال فاروق ذرا ہچکچایا اور پھر اندر داخل ہوگیا۔

"مجھے آگ سے بچالو، میں مرجاؤں گی، اس آگ کو بجھا دو"۔

وہ اس کے پاس آیا اور اُس کے بالکل سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے گالوں پر بہتے آنسوؤں کو نرمی سے صاف کیا اور اس کے ہاتھ تھام کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کا بے قرار دھڑکتا دل اس کے سینے میں دھڑکنے لگا تھا، ہولے

ہولے اس کے سر میں انگلیاں چلاتا، اس کے بال سہلاتا وہ اسے خاموش کروا چکا تھا۔
طے پایا محبت ہر دوا سے بڑھ کر ہے۔

☆.........☆.........☆

وہ گھر آیا تو دروازے میں وہ لفافہ پڑا تھا، کوریئر سے ارسال کردہ کارڈ علی حسان کے نئے ناول کی تقریب رونمائی کا تھا۔ تبھی اس کے موبائل کی بیپ بجی۔

"ناول کی ایک کاپی تجھے میل کر دی ہے میری جان!"

شکریہ لکھ کر اس نے جوابی پیغام ارسال کیا تھا۔

اگلے دن جب وہ سیشن کے لیے کمرہ نمبر 21 میں آیا تو وہ کل کی نسبت بہتر حلیے میں تھی۔ بلال کے لائے کپڑے وہیں پڑے تھے۔

"کیا حال ہیں مسز بلال؟" وہ بلا جھجک اس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔

"کل تمہارے شوہر آئے تھے، مل کر کیسا لگا؟"

وہ بنا جواب دیئے فرش پر انگلیوں سے لکیریں بناتی رہی۔ ہولے ہولے خاموشی سے، طویل خاموشی کے بعد وہ آہستگی سے بولی تھی۔

"میں اس کے قابل نہیں ہوں"۔

☆.........☆.........☆

وہ سردیوں کے دن تھے، سر شام ہی برفیلی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ دھند اپنے پَر پھیلا لیتی تھی، وہ اسے اندر ہی رکھتے تھے۔ بچی اب ہر وقت اپنی دادی کے پاس رہتی تھی، میمونہ کی امی بھی اب زیادہ وقت ان کے ہاں رہتی تھیں۔

یہ اُن سرد راتوں میں سے ایک رات کا قصہ ہے جب سرد ہواؤں اور برفیلی اذیت ناک سردی سے گھبرا کر ہر ذی نفس اپنے اپنے گھر میں مقید ہو چکا تھا، رات کے نجانے کون سے پہر بلال کی آنکھ کھلی تو وہ پلنگ پر نہیں تھی۔ وہ اٹھا، لائٹ جلائی وہ کمرے میں نہیں تھی۔ باہر آیا، صحن، دوسرا کمرہ، چھت... وہ کہیں نہیں تھی۔ تبھی اس کی نظر بیرونی دروازے تک گئی، وہ کھلا تھا، وہ باہر نکل آیا۔

شال اور جرسی سے بے نیاز وہ باہر نکل آیا تھا، ٹھنڈ کے تھپیڑے اندر تک روح پگھلا دیتے تھے اور اسے پسینے آ رہے تھے، گلیاں خالی، ہر گھر کا دروازہ مقفل، وہ بے قراری کے عالم میں خالی سنسان گلیوں میں اسے ڈھونڈتا پھرتا رہا... پھر وہ اسے نظر آ گئی۔

مسجد کے دروازے کے پاس، اس برفیلی سیاہ تاریک رات میں وہ دو پٹے جوتوں سے بے نیاز مسجد کے آہنی دروازے کے پاس زمین پر بیٹھی تھی، دھند میں ملبوس اس دروازے کو تھامے وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

"تو ہر ایک کی سنتا ہے۔ جو تجھے سنائے اس کی بھی اور جو تجھے نہ سنائے اس کی بھی۔ تو دلوں کے راز جانتا ہے۔ تو ہر ایک کی جھولی بھر دیتا ہے۔ جو تجھ سے مانگے اسے بھی اور جو نہ مانگے اسے بھی تو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا، تو بھرنا جانتا ہے، میری جھولی بھی بھر دے... مجھے بھی وہ دے دے"۔ رات کے اس تاریک سناٹے میں اُس کی سسکیاں بازگشت بن کر گونج رہی تھیں۔ مسجد کا دروازہ تھامے وہ بلک رہی تھی۔ وہ مانگنے آئی تھی، اس سے جو مانگنے سے پہلے ہی عطا کر دیتا ہے۔ اس لمحے جب عبد اور معبود کے درمیان کوئی تیسرا نہیں ہوتا، تب وہ آئی تھی،

''اس سے کسی'' اور کو مانگنے جب وہ عطا کرنے والا پاس بہت پاس تھا، وہ مانگنے آ گئی تھی۔

''لوگ کہتے ہیں میں نے بڑی نمازیں پڑھی ہیں، بڑے سجدے کیے ہیں، میرے پاس بڑی عبادتیں ہیں، وہ تیرے لئے ہیں، وہ خالص تیرے لئے ہیں، ان سجدوں، ان نمازوں، ان عبادتوں کے بدلے... مجھے ''وہ'' دے دے، مجھے ''وہ'' انسان دے دے۔ سب لے لے، بس ''وہ'' دے دے''۔

بلال بھربھری مٹی کی مانند زمین پر گر گیا تھا۔ وہ تو نمازوں والی تھی۔ اس کے پاس تو جتانے کے لیے بڑے سجدے تھے، بڑی عبادتیں تھیں، وہ تو حق سمجھ کر مانگنے آئی تھی، وہ تو صلہ لینے آئی تھی، اس کے پاس کیا تھا؟ کیا تھا ایسا جس کے بدلے وہ اسے مانگ لیتا؟ وہ کون سے سجدوں کے عوض مانگتا؟

لیکن عطا کرنے والے کی وسیع نظر تو دونوں پر تھی۔

مسجد کے دروازے سے لپٹی، دامن میں نمازیں اور سجدے بھر کر لانے والی لڑکی پر بھی اور اُس سے چند قدم دور زمین پر بیٹھے بلک بلک کر روتے خالی دامن لڑکے پر بھی۔

برفیلی ہوائیں چلتی رہیں، روح سلب کرتی رہیں، رات بھیگتی رہی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس تک آیا، پھر کچھ کہے سنے بغیر، بنا کوئی آہٹ کیے واپس پلٹ گیا۔

''عبد'' اور ''معبود'' کے درمیان وہ کیسے آ جاتا؟ مانگ لے... لے لے جو لینا چاہتی ہے اور عطا کر دے عطا کرنے والا۔ کر دے اوپر والا فیصلہ۔ اسے ہر فیصلہ منظور ہوگا۔

وقت گزرتا گیا۔

وہ ویسے ہی مسجد کے دروازے سے لپٹی رہی جب اُس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا، سیاہ رات میں تارے جگمگا اٹھے تھے، سامنے وہ کھڑا تھا جسے وہ مانگ چکی تھی۔ وہ اسے تھامے اپنے ساتھ لے آیا تھا اپنے گھر۔

''تم میرے لئے رقص کر سکتی ہو؟'' اُس نے سرگوشی میں پوچھا تھا۔ فسوں میں ڈوبی میمونہ بلال ابھی خدا کے گھر سے اسے مانگ کر آئی تھی انکار کیسے کر دیتی۔

اندھیری رات میں وہ اس کے ساتھ آ گئی۔ اکیلی... تنہا...

وہ تاروں جیسی چمک والا شاندار جوڑا تھا جو وہ اس کے لیے لایا تھا۔ جگر جگر کرتے چمکدار زیورات تھے، رنگا رنگ موتیوں ہیروں سے سجے اور وہ چھن چھن کی آواز نکالتے گھنگرو، جو اس نے پیروں میں باندھ لئے تھے۔

وہ دور بیٹھا تھا۔ اندھیروں میں اندھیرے جیسا... اور چاند تاروں سے بڑھ کر روشن آنکھیں اور دھواں تھا جو اس کی انگلیوں میں دبے سگریٹ سے اٹھ رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے چلتی اس کے سامنے آئی۔ پیروں میں بندھے گھنگرو منحوس آواز سے کرلائے۔ سرگم کی دھنوں پر اس کے قدم تھرک اٹھے۔ اسے اُس شخص سے محبت تھی۔ اس کی ہر خواہش سے محبت تھی۔ اس کی ذات سے جڑی ہر شے سے محبت تھی۔ اس کی آنکھوں سے، ہونٹوں سے، بالوں سے، اس کے سگریٹ سے، اس کے دیئے گھنگروؤں سے بھی... اس کی روشن دیپ جلتی اور جلاتی آنکھوں میں دیکھتی وہ قدم اٹھاتی اور جماتی رہی۔ رقص یار کے لیے کسی تربیت کی کہاں ضرورت۔ وہ تو خود بخود انگ انگ سے نکلتا ہے... چھم... چھم... چھم... چھن... چھن... چھن...

فسوں بڑھتا گیا، وہ لہراتی رہی، یہاں تک کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے پاس آ گیا۔ پاس... بہت پاس... اتنے پاس کہ اس کا دل میمونہ بلال کے سینے میں دھڑکنے لگا، وہ ہولے ہولے اس کے کانوں میں

ہلکورے لیتے جھمکوں کو چھیڑ رہا تھا، اس کے شانوں پر بکھرے بالوں کو چھو رہا تھا، اس کالمس، اس کی قربت، اس کا احساس جس کے لیے وہ دیوانی ہو رہی تھی، وہ پاس، بہت پاس تھا، اتنے پاس کہ چھونے کے لیے ہاتھ بھی بڑھانا نہ پڑتا... لیکن وہ... وہ خود نجانے کہاں تھی، وہ پتہ نہیں کہاں تھی۔ اب فسوں ٹوٹنے لگا تھا، نشہ چڑھ ہی نہیں رہا تھا، اس کالمس کانٹوں کی مانند معلوم ہو رہا تھا، اس کی قربت آگ لگا رہی تھی، اس کا احساس روح کو چوٹیں لگا رہا تھا، وہ بے قرار ہوتی چلی گئی، قرار پانے کی کوشش میں جو اُن آنکھوں میں دیکھا تو وحشت کے الاؤ جل اٹھے۔ ان روشن آنکھوں میں دیپ بجھنے لگے تھے۔ وہ اندر تک جل گئی اور راکھ ہوتی رہی، اس کی سانسوں سے گھن آنے لگی، اس کی قربت سے جی متلانے لگا، وہ پاس آتا گیا اور وہ دور ہٹتی گئی۔

اللہ کے گھر سے وہ اپنی نمازوں کے عوض اسے مانگ کر آئی تھی اور جب وہ مل رہا تھا تو وہ پیچھے ہٹ رہی تھی، یہ کیا ہو گیا تھا؟ دل خاموش ہو گیا تھا، خواہشیں دم توڑنے لگی تھیں، لذتیں، اذیتوں کا روپ لے چکی تھیں۔

"میرے لئے کیا کر سکتی ہو؟"

"مر بھی سکتی ہوں"۔ لب کپکپائے لیکن دل نہیں دھڑکا، آنکھیں نہ تڑپیں اور سانسیں نہیں رکیں، وہ ہاتھ تھام رہا تھا اور وہ ہاتھ چھڑوا رہی تھی۔ گھنگھروؤں کی چھن چھن گیدڑوں کے رونے کی منحوس آواز میں بدل گئی تھی، فضا کا فسوں شعلوں میں بدل رہا تھا اور وہ دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ اندر سے... باہر سے...

اس کی گرفت سے خود کو چھڑا کر وہ واپس پلٹی اور آخری بار اُن نظروں میں دیکھا۔ ان سے لاوا بہہ رہا تھا، وہ بھاگی اور بھاگتی رہی۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی ہر طرف شعلے تھے۔ راستے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

اُس شر بھری رات میں خیر اُترا تھا۔

☆............☆............☆

"میرا مان میری نمازیں تھیں، میرا فخر میرا نفس تھا، میرا غرور میرے سجدے تھے"۔ وہ ہولے ہولے بول رہی تھی۔

"میرا فخر فسوں ہوا، میرا غرور مٹی میں ملا دیا گیا اور میرے نفس کو میرے سامنے آزمائش بنا کر اتارا گیا، میں ہار گئی۔ میرے بڑے بول، میرا فخر، میرا غرور، میرے سجدے مجھے ہرا گئے۔ مجھے جو مان تھا کہ میں ٹوٹنے والوں میں سے نہیں، مٹی ہو گئی۔ اتنے حصوں میں بکھری کہ شمار نہیں، مجھے بددعا نہیں لگی، مجھے میرا غرور مار گیا، مجھے میری اوقات دکھا دی گئی"۔ آنسوؤں کی ایک لڑی اس کے رخساروں پر بہہ نکلی تھی۔

"اور میری عبادتوں کا صلہ... مجھے وہ بھی دکھا دیا گیا۔ زنا کا ایک لمحہ... وہ تھا میرا صلہ... وہ ملا مجھے اجر میں... شر... شر... اور شر ہی تو مانگا تھا میں نے... خیر کے بدلے... سجدوں کے بدلے..."

ڈاکٹر شاہ زیب خاموش تھا۔ کس کس زخم پر مرہم رکھتا؟

"اور مجھے میری اوقات بتا کر اُس نے مجھے اپنی رحمت دکھائی۔ میرا نفس میرے منہ پر مار کر اس نے مجھے اپنی عطا دکھائی، میں زنا سے ایک لمحے دور تھی، وہ مجھے کوسوں دور لے آیا، میرا نفس جب مجھے مٹی کرنے والا تھا وہ مجھے بچا لے گیا، اپنی رحمت کی چادر سے لپیٹ کر بہت دور..." وہ ذرا چپ ہوئی۔

"ابو کہتے تھے وہ بڑی غیرت والا ہے، ہمارا کچھ بھی اپنے پاس نہیں رکھتا، سو گنا کر کے لوٹا دیتا ہے، مجھے لاکھ کروڑ گنا کر کے لوٹایا گیا۔ مجھے میری عبادت کے بدلے ملتا تو شاید زنا ملتا، پر اس کی رحمت سے جو ملا، وہ بہت تھا، خیر ہی خیر"۔ وہ پھر سے رو دی۔

☆..........☆..........☆

وہ رات کا کھانا کھائے بغیر لیٹنے چلا گیا تھا۔ دل بہت بوجھل تھا۔ ذہن میں میمونہ بلال کی باتیں چل رہی تھیں، یونہی سوچتے سوچتے اس نے لیپ ٹاپ اٹھایا اور میلز چیک کرنے لگا علی حسان نے ناول کی کاپی ارسال کی تھی، اس نے میل کھولی۔

"وہ نمازوں کی پابند لڑکی
اس کی نظروں نے چن لیا کافر"

ابتدائی صفحے پر لکھے شعر نے اسے چونکا دیا، نظروں کے سامنے نمازوں کی پابند میمونہ بلال اور اس کا کافر عشق آگیا۔ وہ دھیرے دھیرے پوری تحریر پڑھتا گیا، آخری پیج پڑھنے کے بعد جب وہ فارغ ہوا تو حیرانگی عروج پر تھی، دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور پورا وجود پسینے میں ڈوبا تھا۔ اس نے موبائل اٹھایا اور بلال کا نمبر ملایا۔

"پھر وہ آدمی کہاں گیا بلال؟ فیضان؟" ابتدائی باتوں کے بعد اس نے سوال کیا۔

"پتہ نہیں ڈاکٹر! اس رات کے بعد وہ اور اس کی ماں گاؤں چھوڑ کر چلے گئے تھے"۔

☆..........☆..........☆

عشق کا فسوں زائل ہوا تو اسے لگا وہ جلتی دھوپ میں کھڑی ہے۔ واپسی کا سفر آسان نہیں تھا، بلکہ وہ جس مقام پر تھی وہاں سے واپسی شاید ممکن ہی نہیں تھی۔ احساس ندامت اور پشیمانی اسے ہر وقت گھیرے رکھتے تھے، دنوں میں اس کی صحت گر گئی، حلقے پڑ گئے، جنون حد سے بڑھ گیا، وقت بے وقت وضو کرتی اور کرتی چلی جاتی... جائے نماز دیکھتی رہتی۔ کبھی جو بچھاتا کوئی تو چیخیں مار مار کر ہلکان ہو جاتی۔ کبھی روتی تو بس روتی رہتی...

چھ مہینے میں وہ گھل گئی۔ کمزور، بیمار اور پاگل... بچی پر دو تین دفعہ حملہ کیا تو پاگل خانے میں داخل کروا دی گئی، بے چاری میمونہ بلال...

☆..........☆..........☆

وہ بیڈ پر بیٹھی تھی جب ڈاکٹر شاہ زیب اندر داخل ہوا۔ ہاتھ میں پکڑا شاپر بیڈ پر رکھ دیا اور خود پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔

"مونا!" طویل خاموشی کے بعد وہ بولا تھا۔

"غلطیاں ہم سب سے ہو جاتی ہیں، گناہوں بھری دنیا میں گناہوں سے بچ جائیں تو فرشتے نہ ہو جائیں، لیکن اگر ہم فرشتے نہیں تو ابلیس بھی نہیں کہ گناہوں کے بعد مایوس ہو جائیں۔ ہم اسی لئے ابلیس سے بڑھ کر ہیں کہ گناہ کے بعد توبہ کر لیتے ہیں اور اس طرح ہم فرشتوں سے بھی افضل ہو جاتے ہیں"۔ وہ ذرا رکا۔

"نئی ابتدا تو کرو، نیا آغاز، نئی زندگی تمہاری منتظر ہے"۔ وہ ویسے ہی بیٹھی رہی۔

"اس کے دَر پر بیٹھ کر میں نے نمازوں کا اجر مانگا تو بدلے میں مجھے زنا کی دعوت ملی، میری عبادتیں اس قابل تھیں، مجھے یہ بات جینے نہیں دیتی"۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔

"ایسا بھی تو ہو سکتا ہے وہ تمہاری نمازوں کا اجر ہو ہی نہیں وہ تمہارے گناہوں کی سزا ہو، وہ تمہاری طرف سے گناہوں کا کفارہ ہو، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہاری نمازوں کا اجر اس قابل ہو ہی ناں کہ اس ناپاک دنیا میں اتارا جا سکے، ہو سکتا ہے وہ نور ہو، ہو سکتا ہے وہ جنت کی صورت میں تمہارا منتظر ہو"۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ میمونہ بلال اللہ کو اتنی پیاری ہو کہ اس کے گناہوں کو اللہ نے اوپر جانے ہی نہیں دیا، میمونہ بلال کے گناہوں کی سزا دنیا میں ہی دے دی گئی ہو کہ آخرت میں وہ اس کی بارگاہ میں صرف نیکیاں لے کر جائے۔ ایسا بھی تو ہوسکتا ہے ناں"۔ میمونہ بلال کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

"غرور اور نافرمانی ابلیس اور انسان دونوں کی مشترکہ خصوصیات ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ انسان غرور اور نافرمانی کے بعد مایوس نہیں ہوتا، وہ رحمت سے امید لگا لیتا ہے اور یہی فرق اسے برتر کرتا ہے، اور تم تو اللہ کی اچھی بندی ہو، نیک... پرہیز گار... صرف اُس سے ڈرتی ہو، صرف اس سے پیار کرتی ہو"۔ وہ رو پڑی۔

"میں اس سے پیار کرتی ہوں، لیکن وہ مجھے اپنی طرف بلاتا ہی نہیں، میرا دل اس کی طرف جانے کو ہمکتا ہی نہیں"۔

وہ آگے کو ہوا اور سرگوشی میں بولا۔

"کیا خبر وہ تمہاری طرف سے پہل کا منتظر ہو، کیا خبر وہ تم سے چاہتا ہو کہ شکست دیدہ و مایوسی کو، کیا خبر وہ تمہارے قدم کے بڑھنے کے انتظار میں ہو، کیا خبر وہ تو یہ سننا چاہتا ہو"۔ وہ اٹھا، شاپر میں سے کچھ نکال کر زمین پر بچھا دیا، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

زمین پر جائے نماز بچھی تھی۔

وہ ابتدا تھی، میمونہ بلال کی طرف سے پہل... مایوسی کے سنگلاخ پہاڑ کی طرف پہلا کاری وار... ابلیس کے خلاف پہلی صدا...

ہاں میں تم سا تو نہیں، میرا ستار رحیم و کریم مولی ہے، میں مایوس کیوں ہوں؟ اسے پتہ ہے راستہ کٹھن ہے، اسے پتہ ہے راستے میں کئی دشواریاں ہیں، اسے پتہ ہے میں کمزور ہوں، اسے پتہ ہے مجھے بھٹکنے کی عادت ہے، اسے پتہ ہے... لیکن اسے یہ بھی پتہ ہے کہ مجھے پتہ ہے کہ وہ رحمان ہے، اسے پتہ ہے کہ مجھے پتہ ہے کہ وہ معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنے کو پسند کرتا ہے۔ اسے سب پتہ ہے، تو بس میں بھٹکا ہوا ہوں تو کیا ہوا، ہاتھ اس کی طرف بڑھایا ہے، مدد اس سے مانگ لی ہے، اب مایوسیوں کی خیر نہیں، اب ڈر کی بات نہیں، اب پار لگنے کا وقت ہے۔

وہ مسکرا رہا تھا اور وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ انمول بے ریا آنسو، مایوسیوں کی سیاہی مٹا دینے والے، شہنشاہوں کے شہنشاہ کو منا لینے والے ہیرے موتی جیسے آنسو۔

وہ نہیں مانگتا عبادتیں، لمبے لمبے سجدے، وہ نہیں مانگتا صدیوں کی ریاضتیں، اسے کوئی غرض نہیں غرور و تکبر سے تنے ماتھے پر سجدوں کے نشان سے، وہ بے نیاز ہے سردیوں اور گرمیوں کی تہجد سے، وہ تو دلوں میں رہتا ہے، وہ تو عاجزی پسند کرتا ہے، دلوں کو آباد رکھو، وہ تمہیں آباد رکھے گا۔

یاد رکھو! غرور کا ایک لمحہ صدیوں کی عبادتیں راکھ کر دیتا ہے۔

☆............☆............☆

اسی دن شام کی فلائٹ سے وہ کراچی آگیا تھا۔

علی حسان اسے گھر پر ہی ملا تھا، ویسی ہی گرمجوشی سے جیسے وہ ہمیشہ ملتا تھا لیکن وہ گرمجوشی آج ڈاکٹر شاہ زیب کے انداز سے مفقود تھی۔

"میرے گھر کو چار چاند لگ گئے جو ڈاکٹر شاہ زیب میرے گھر تشریف لائے ہیں"۔ وہ مسکراتے ہوئے کہہ

رہا تھا۔

"ہاں... لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہیں کیا کہہ کر پکاروں میرے دوست"۔ وہ ہولے ہولے چلتا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اسے دیکھنے لگا۔

"علی حسان... دی گریٹ رائٹر"۔ وہ ذرا رُکا۔

"یا پھر فیضان مظفر... ایک ہارا ہوا کم ظرف انسان"۔ ڈاکٹر شاہ زیب کی بات پر اُس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں حیرانی اُتر آئی تھی۔

☆............☆............☆

اسے ایک کہانی کی تلاش تھی۔

ایک ایسی کہانی جو ہر پڑھنے والے کو اندر تک ہلا دے، ہر کہانی سے ایک منفرد ایک ایسی منفرد کہانی جو اپنی مثال میں بے مثال ہو اور ایک ایسی داستان جو اسے راتوں رات شہرت کے آخری آسمان کے بھی اوپر لے جائے۔ اسی کہانی کی تلاش میں وہ گاؤں گاؤں، شہر شہر بھٹکتا پھرا تھا۔ نام بدل بدل کر اور اسے اپنی کہانی مل گئی۔ اپنی کہانی کا مرکزی کردار مل گیا، اس شام جب وہ چھت پر موجود تھا وہ لڑکی اسے دکھائی دی جو انتہائی جذب سے اسے دیکھ رہی تھی، وہ بھی اسے دیکھتا رہا۔ اگلی شام وہ پھر آئی تو وہ چھت پر چھپ گیا، وہ بے قراری سے اسے ڈھونڈتی رہی۔ وہ روز یونہی کرتا، چھپ کر اسے خود کو کھوجتے دیکھتا، پھر اس روز وہ اسے دریچہ کی حالت میں ملی۔ اسے دیکھتے...

ایک دلچسپ کہانی تھی جو بنتی چلی گئی۔ ایک لڑکی جو کسی اور کی تھی اور کسی اور کی ہونا چاہتی تھی، پھر کافی دنوں بعد وہ اسے چھت پر ملی تو وہ اس کے پاس چلا گیا، وہ نظریں جھکائے بنا اسے تکتی رہی اور وہ اسے... اس کی نظروں میں سے کہانی کے لفظ چنتا رہا اور صفحے بھرتا گیا... لفظ ملتے رہے، کردار جڑتے گئے اور کہانی بنتی گئی۔ وہ لڑکی، اس کا شوہر... اور وہ خود... معاملہ بڑھ گیا۔ اس لڑکی کے شوہر سے وہ پٹ بھی گیا۔ ایک عورت کو کچھ پیسے دے کر اس نے ماں کا کردار کروایا، اور اس رات جب وہ اسے مسجد کے پاس ملی، وہ اسے ساتھ لے آیا۔ وہ اب کلائمیکس (عروج) چاہتا تھا۔ انتہا تک لیکن نجانے کیسے وہ لڑکی واپس پلٹ گئی۔ پر خیر تھی۔ انت وہ خود بھی کر سکتا تھا۔ اس نے بوریا بستر باندھا اور راتوں رات گاؤں چھوڑ دیا، انت بن لیا اور دلچسپ داستان تیار ہو گئی، مسودہ پڑھنے کے بعد کئی پبلشنگ ادارے وہ ناول چھاپنے پر تیار ہو گئے، پروڈیوسر سے بات ہو گئی، کروڑوں کے بجٹ کی فلم کے لیے سیٹ لگ گئے، شہرت نزدیک تھی۔

☆............☆............☆

ڈاکٹر شاہ زیب نے اس کی ساری کتھا خاموشی سے سنی تھی اور بغور اسے دیکھا تھا۔

"تو گلٹی (افسوس زدہ) نہیں ہے؟ تجھے ذرا بھی افسوس نہیں؟" علی حسان ذرا چپ ہوا۔

"اب گلٹی ہونے کا فائدہ؟ جو ہونا تھا ہو گیا، کہانی تیار ہے اور..." اس نے بات کاٹ دی۔

"کسی کی زندگی برباد کر کے کہانی بنا کر تو کہہ رہا ہے افسوس کا کیا فائدہ۔ ٹھیک ہے وہ ہاتھ بڑھا رہی تھی تیری طرف، تو جھٹک دیتا"۔ وہ خاموش رہ گیا تبھی ڈاکٹر شاہ زیب ہولے سے ہنسا تھا۔

"ہاں تو بھی کیا کرتا، تو بھی تو کٹھ پتلی تھا۔ تقدیر کے ہاتھ میں تھیں تیری ڈوریاں، تو خوش تھا کہ لڑکی جال میں

پھنس رہی تھی، جال میں تو تُو پھنس رہا تھا، کسی دوسرے کی کہانی لکھ کر بیٹھ گیا ہے تو اور جو تیری زندگی کی کہانی لکھی جا چکی اس کا کیا؟" علی حسان ششدر رہ گیا تھا۔

"وہ مر جائے گی، زندوں میں وہ اب بھی نہیں، پاگل پن کے عروج پر ہے اور تو کہہ رہا ہے افسوس کا کیا فائدہ؟" وہ ذرا خاموش ہوا۔

"اسے تو یہ سب سزا میں ملا میرے دوست! لیکن تجھے سزا ملنی ابھی باقی ہے، اس کی تو یہ فصل تھی اُس نے کاٹ لی، لیکن تو نے تو ابھی بوئی ہے، تو نے تو ابھی کاٹنی ہے"۔

☆............☆............☆

کراچی سے واپس آنے کے بعد دوسرا ضروری کام اس کے ذمے تھا جس کی ادائیگی کے لیے وہ بلال سے ملا تھا۔

"مجھے تانیہ سے ملنا ہے، تانی سے..."

بلال جی بھر کر حیران ہوا۔ (پاگلوں کا ڈاکٹر پاگل تو نہیں ہو گیا؟)

"وہ تو جی مر گئی۔ کب کی..."

ڈاکٹر شاہ زیب مسکرایا اور میمونہ بلال کے ذریعے ملنے والی ساری معلومات اسے دے دیں۔ اگلے دن وہ بلال کے ساتھ گاؤں آیا تھا۔ میمونہ رئیس کے گھر، اس وسیع آنگن والے گھر جس کے ایک کونے میں آم کا پیڑ اب بھی ویسے ہی کھڑا تھا۔ سبزیوں کی کیاریاں اجڑ گئی تھیں، پھولوں کے پودے مرجھا گئے تھے، وہاں اب میمونہ تھی، نہ تانی... صرف اداسی اور ویرانی، مونا کی امی اور رشتے کرانے والی اماں کے ذریعے اسے تانی کے گھر کا پتہ چلا تھا۔

☆............☆............☆

"اس نے اپنے کیے کی فصل کاٹ لی، تو نے ابھی بوئی ہے تو نے ابھی کاٹنی ہے"۔ لفظ بازگشت بن کر اس کے کانوں میں پگھلے سیسے کی مانند اتر رہے تھے۔ تاریک کمرے میں ہیولے سے نمودار ہو رہے تھے۔ حلقوں سے ڈھکی بے جان سی آنکھوں والی لڑکی... ننھا سا نازک دھڑکتا دل... وہیں آس پاس تھا۔

"وہ غلطی نہیں گناہ ہوا ہے تجھ سے... کفارہ اور توبہ ابھی واجب الادا ہیں"۔ ڈاکٹر شاہ زیب نے اسے جاتے ہوئے کہا تھا۔

اس نے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں، یہ ساری شورش، سارا کھڑاگ جس شہرت کے لیے تھی وہ چند لمحوں کی دوری پر تھی پر اب اس کے نشہ ٹوٹنے کی باری تھی، اب افسردگی کی لہریں اسے ڈبونے پر تلی تھیں، اتنی لمبی مسافت کے بعد جب فتح کی عمارت کے اونچے مینار دکھائی دینے لگے تھے تو وہ تھکنے لگا تھا۔ اب پاؤں زخموں سے بوجھل تھے اور قدم ڈگمگانے لگے تھے۔ سکھ چھین کر دکھ ہی ملتے ہیں۔ خسارے ہی ہاتھ آتے ہیں۔ اس نے پاس رکھی کتاب اٹھائی۔

ایک لڑکی کا ادھورا سا اسکیچ جس کی صرف آنکھیں عریاں تھیں اور باقی چہرے پر نقاب تھا۔ بے قراری کے سمندر ٹھاٹھیں مار رہے تھے۔

"کیا تم واقعی گلٹی نہیں؟" اب کی بار سوال کرنے والا وہ خود تھا اور جواب دینے والا اس کا ضمیر جو ابھی مرا نہیں تھا۔

☆..........☆..........☆

نیم تاریک کمرے کا دروازہ کھلا اور روشنی کی ایک باریک سی کرن اندر داخل ہوئی، اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر جھکانا بھول گئی، ایسے جیسے اندر داخل ہونے والے وجود نے اس پر کوئی سحر پھونک کر اسے اسیر کر دیا ہو، وہ یک ٹک اندر آنے والے کو دیکھتی رہی۔ لمحے گزرتے گئے اور نظریں تھکنے لگیں، آنے والے ذی نفس نے اندھیرے سے روشنی میں قدم رکھا اور اپنے لبوں میں مقید الفاظ فضا میں آزاد کیا۔

"آپی...!"

اس نیم تاریک کمرے میں اسیر، ہوش وحواس کی دنیا کی سرحد کے اُس پار بھٹکنے والی لڑکی جیسے خواب سے جاگی اور تیزی سے اپنے بستر سے اتر آنے والے وجود کے قدموں میں جا بیٹھی، ہاتھ جوڑے، سر جھکائے روتے ہوئے۔

معافی مانگنی ہی پڑتی ہے۔ آج مانگ لیں یا صدیوں بعد۔ آج مانگ لیں گے تو شاید آنے والی صدی میں ملنے والی تکالیف اور مصائب سے بچ جائیں۔

آنے والی اس کے پاس فرش پر بیٹھ گئی اور اس کے بندھے ہاتھ کھول دیئے۔

"مجھے معاف کر دے تانی! مجھے معاف کر دے، میں نے تجھے برباد کر دیا"۔ تانی نے اس کے آنسو صاف کیے۔

"میں نے کوئی گناہ تو نہیں کیا تھا آپی! جو برباد ہو جاتی، چند غلطیاں کیں اور پھر ان کی سزا بھی کاٹ لی۔ باپ کھو دیا، ماں اور بہن بھی... سزا کاٹ لی تو پھر آگے سختیاں کیوں ملتیں؟ محبت کرنے والا شوہر مل گیا، عمر میں چاہے جتنا بھی بڑا ہو مجھ سے مخلص ہے، میرے لئے یہ کافی ہے۔ دو بچے بھلے مجھ سے چند سال چھوٹے ہیں اور مجھے ماں نہیں کہتے لیکن ماں سے بڑھ کر پیار کرتے ہیں۔ آپی آدم غلطی کر کے جنت سے نکال دیئے گئے تھے لیکن توبہ کے بعد زمین پر خاندان کی صورت میں جنت سے ہی نوازے گئے تھے ناں تو پھر مجھے جنت کیوں نہ ملتی آپی؟" وہ بولتی چلی گئی۔

"مجھے کوئی گلہ نہیں۔ میں نے سب کو معاف کر دیا ہے"۔

نیم تاریک کمرے میں روشنیاں بھر گئی تھیں۔

☆..........☆..........☆

دو دن بعد کتاب کی رونمائی کی تقریب تھی۔ دوسری طرف فلم کی شوٹنگ کے لیے سیٹ لگ چکا تھا۔ ان حالات میں اس کا مطالبہ سن کر ہر بندہ اسے پاگل ہی سمجھا تھا بلکہ پاگل سے بھی اگلی شے۔

"مجھے کوئی بک پبلش کروانی ہے نہ ہی فلم وغیرہ۔ ہر شے کینسل کر دیں"۔

پبلشنگ بورڈ، پروڈیوسرز، ڈائریکٹرز حیران۔

"کارڈ چھپ کر تقسیم بھی ہو گئے ہیں، ناول کی ایک لاکھ کاپیاں چھپ گئیں ہیں، اب کینسل کا مطلب ہم

سب کا دیوالیہ ہے مسٹر علی حسان!" ہر بندے نے اسے اپنے طریقے سے سمجھایا پر وہ نہ مانا۔ کامیابی تک جانے کا زینہ اب اسے روی کا ڈھیر لگ رہا تھا۔ جب وہ نہ سمجھا تو وہ قانون درمیان میں لے آئے۔ ایگریمنٹ یاد کروائے۔ اسے سب یاد تھا، کورٹ کچہریوں کی باتیں، وہ ایگریمنٹ توڑ رہا تھا بدلے میں اسے کروڑوں کا ہرجانہ ادا کرنا پڑتا۔

اس کے حصے یہ کفارہ آیا تھا۔

گھر بیچ دیا، گاڑی، زمینیں... پائی پائی ادا کر کے جب وہ فارغ ہوا تو خالی دامن تھا، وہ سب جو بنانے میں سترہ سال لگے، سترہ گھنٹوں میں بک گیا۔ پبلشنگ کینسل ہوگئی، ایک لاکھ کا پیز اسے مل گئیں، بدلے میں سب چھن گیا۔ اوپر آسمان رہ گیا اور نیچے زمین۔ وہ مسکراتا رہا۔ دنیا بیچ کر آخرت خرید لینا گھاٹے کا سودا نہیں ہوتا، وہ خاموش کھڑا بھڑ بھڑ جلتے ورق دیکھتا رہا، قرض ادا ہوئے۔

☆..........☆..........☆

میمونہ بلال کی ذہنی حالت تیزی سے بہتری کی طرف گامزن تھی۔ وہ ریکور کر رہی تھی۔ ہر شے ٹھیک تھی جب وہ اس دن اپنے کمرے میں بے ہوش ملی۔

برین میں بننے والا ٹیومر پھٹ چکا تھا، انتہائی سیریس حالت تھی، اسے فوری طور پر ایمرجنسی وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

بلال گاؤں سے آگیا تھا۔ آپریشن تھیٹر میں سرجری چل رہی تھی۔ ڈاکٹر شاہ زیب اسے تسلیاں دیتا رہا تھا تبھی i.c.u کے دروازے سے ڈاکٹر دانیال باہر آئے تھے۔

"We did it (ہم نے کر دکھایا)"۔

ڈاکٹر شاہ زیب نے پرسکون سانس فضا میں آزاد کی۔

"خطرے سے باہر ہیں اب"۔

وہ دیہاتی بے ریا انسان ڈاکٹر شاہ زیب کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ اس کے وجود سے لپٹی تھکن قطرہ قطرہ ڈھلنے لگی تھی۔ وہ عام سا انسان تھا لیکن بہت خاص تھا۔ اس کے پاس جھولی بھر سجدے اور نمازیں چاہے نہیں تھیں پر بہت انمول اور بہت پیارا دل تھا جس میں خلوص بھری محبت تھی۔ وہ آزمائشوں کی بھٹی سے کندن بن کر نکلا تھا۔

☆..........☆..........☆

وہ ہولے ہولے چلتا اس لمبے کوریڈور کے آخری کونے میں بنے کمرہ نمبر 21 کے سامنے آ کر رک گیا تھا۔ آہنی جالی والی کھڑکی سے اندر نظر ڈالی تو اندر ہلکی سی روشنی تھی۔ نیچے فرش پر جائے نماز بچھی ہوئی تھی جس پر وہ تشہد میں بیٹھی تھی۔ ہلکے سبز رنگ کے دوپٹے میں خود کو اچھی طرح لپیٹے ہوئے، وہ وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا۔

اس نے سلام پھیرا اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیئے، کافی دیر دعا مانگنے کے بعد وہ ہولے سے اٹھی اور جائے نماز تہہ کر کے بیڈ پر رکھ دی تبھی کسی احساس نے اسے مڑنے پر مجبور کیا تھا۔

کھڑکی میں وہ کھڑا تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں جن میں اول روز کی طرح دیپ روشن تھے۔ ذہانت کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں فسوں کی کشتیاں تیر رہی تھیں۔

میمونہ بلال نے جلدی سے دوپٹہ کھینچ کر چہرہ ڈھانپ لیا۔ سارا چہرہ ڈھک گیا۔ آنکھیں عریاں رہ گئیں جو ایک نظر ڈال کر جھک گئیں، نہ دل دھڑکا اور نہ کپکپی چھائی۔ زمانہ جاہلیت گزر گیا تھا، وہ کھڑا اسے دیکھتا رہا اور پھر دیپ جلاتی اُن نگاہوں سے آنسو ابل پڑے۔

''مجھے معاف کردو''۔ اندر خاموشی سی چھا گئی۔

''معاف کردیا''۔ معافی کے چند سکے اس کی خالی جھولی میں چھن سے آگرے اور وہ مالا مال ہوگیا۔ بس ہر مرحلہ طے ہوا۔ داستانیں رقم ہوگئیں۔

کچھ دیر بعد وہ ویسے ہی چہرہ ڈھانپے، اس دیہاتی انسان کے ساتھ ہسپتال سے باہر جانے والے راستے پر گامزن تھی، اس نے پاس کھڑے ڈاکٹر شاہ زیب کو دیکھا۔

''انت میں نے ڈھونڈ لیا ڈاکٹر، آخر میں سچی محبت جیت گئی''۔

ڈاکٹر شاہ زیب نے دور جاتے راستے پر اسے دیکھا جو بلال کا ہاتھ تھامے جا رہی تھی اور مسکرا دیا۔

''واقعی انت یہی ہوا، سچی محبت ہمیشہ کے لیے جیت گئی''۔

☆..........☆..........☆

نئی زندگی کی ابتدا تھی۔ صفر سے...

وہ چھوٹا سا فلیٹ تھا، ایک چھوٹا سا کمرہ، ڈرائنگ روم اور ایک طرف کچن۔ ڈرائنگ روم میں ایک طرف رکھے صوفے پر وہ بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں قلم تھا اور گود میں ایک رجسٹر جس پر وہ کچھ لکھ رہا تھا۔ کھڑکی سے اندر آتی ہوا رجسٹر کے صفحے پھڑ پھڑا رہی تھی۔ یہی ہوا دور بہت دور فاصلہ طے کرتی اس صحن میں بھی اتری تھی جس کے وسط میں نیم کا درخت تھا۔ وہ چار سال کی گول مٹول سی بچی تھی جس کے ساتھ انتیس تیس سالہ وہ لڑکی تھی جو شرارتی آنکھوں سے مسکراتی ہوئی نیم کے درخت کے پاس خاموشی سے چھپی کھڑی تھی۔ اس صحن میں تیسرا انسان وہ مرد تھا جو آنکھوں پر پٹی باندھے ہاتھ اٹھائے ان کو ڈھونڈ رہا تھا۔

''پکڑ لیا''۔ وہ اندازے سے درخت تک آیا اور بچی کو جکڑ لیا اور گود میں اٹھالیا۔ فضا ہنسی کی آوازوں سے گونج اٹھی۔ ہولے ہولے چلتی ہوا اس ہسپتال کے نیم تاریک کمرے میں بھی سر کے بل داخل ہوئی تھی جس کی دیوار سے ٹیک لگا کر وہ اٹھارہ انیس سال کا لڑکا بیٹھا چلا رہا تھا اور اس کے پاس نزدیک زمین پر وہ ڈاکٹر بیٹھا اسے دلاسہ دے رہا تھا۔ اندر نیم تاریک کمرے کے حبس سے گھبرا کر اسیر ہوا باہر کھلی فضا میں آزاد ہوگئی تھی۔

☆..........☆..........☆

درخشاں ضیاء

افسانہ

رکشے والا

آفس سے نکلتے ہی گھور سناٹے نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ایک کال سینٹر میں دوسری شفٹ میں جاب کرتی تھی۔ آج وہ معمول سے زیادہ لیٹ ہوگئی تھی۔ عموماً وہ 8 بجے تک فارغ ہوجاتی تھی۔ آج اس کی کولیگ ایمان کا برتھ ڈے تھا۔ کال سینٹر میں ایمان ہی اس کی واحد دوست تھی پوری ٹیم نے مل کر ایمان کو سرپرائز دیا تھا۔ اس نے گھر فون کرکے امی کو تھوڑا لیٹ آنے کا بتا دیا تھا لیکن کراچی کے حالات کی وجہ سے وہ جلدی نکلنا چاہ رہی تھی۔ ایمان نے پہلے ہی کہہ دیا کہ وہ سب کو ڈنر کی ٹریٹ دے رہی ہے اور دوست ہونے کے ناطے رامین کو ضرور ان کا ساتھ دینا ہوگا۔ مجبوراً رامین کو ڈنر تک رکنا پڑا۔ آفس سے ڈنر کے فوراً بعد نکلنے والوں میں وہ پہلی تھی۔ ورنہ پارٹی تو ابھی چل رہی تھی۔ باہر نکل کے اسے صحیح معنوں میں وقت گزرنے کا احساس ہوا۔ ان کا آفس ایک پوش علاقے میں تھا اگر وہ آفس کی گاڑی کا انتظار کرتی تو مزید ایک گھنٹہ لگتا کیونکہ باقی سب تو پارٹی میں مصروف تھے اور گاڑی اسے اکیلی کو لے کر نہیں جاتی۔ اس لیے اس نے رکشے میں جانے کا سوچا۔ آفس چونکہ پوش علاقے میں تھا اس لیے رکشے وغیرہ کے لیے تھوڑا آگے جانا پڑتا تھا۔ بہت دیر کھڑے رہنے کے باوجود بھی کوئی رکشہ نہیں رک رہا تھا۔

''اف اوہ گھر میں امی ابو پریشان ہو رہے ہوں گے۔ آج بہت ڈانٹ پڑے گی۔'' وہ عجیب پریشانی میں گرفتار تھی بہت مشکلوں سے انہوں نے اسے جاب کی اجازت دی تھی۔ ورنہ وہ اس کی پڑھائی کے بعد اپنے اس اکلوتے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ ابھی وہ واپس آفس جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ ایک رکشہ اس کے قریب آکر رک گیا۔

''کہاں جانا ہے باجی!'' رکشے والے نے اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا لفظ بمشکل اس کے ہونٹوں سے ادا ہو رہے تھے۔

قیوم آباد کا کہہ کر وہ جلدی سے رکشے میں بیٹھ گئی۔ مبادا یہ واپس نہ چلا جائے۔

رکشے میں بیٹھ کر اسے تسلی ہوئی۔ وہ رکشے والے کا جائزہ لینے لگی عجیب بے ترتیب سا حلیہ تھا۔ لمبی سی داڑھی میلے سے کپڑے، کالر کا پیچھے کا حصہ کالا ہو رہا تھا۔ ابھی وہ اس کا معائنہ کر ہی رہی تھی کہ فرنٹ مرر پر اس کی نظر پڑی۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا رامین نے فوراً نگاہوں کا زاویہ بدل دیا اور رکشے سے باہر گزرتے مناظر دیکھنے لگی۔ چونکی اس وقت جب رکشے والے نے رکشہ سائیڈ میں روکا۔

''ابھی دو منٹ میں آیا باجی۔'' کہہ کر وہ وہیں بنے ایک پان کے کیبن کی طرف بڑھ گیا۔ نہ جانے کیبن والے سے کیا باتیں کر رہا تھا تھوڑی دیر میں ہاتھ میں پان لیے وہ واپس آگیا۔ اس کی اس کارروائی نے رامین کے ذہن میں وہ خبر تازہ کردی



جو پچھلے ہفتے ٹی وی پر چلی تھی۔ جس میں ایک رکشے والے نے ایک عورت کو اغوا کیا تھا اور بعد میں عورت کی لاش کچرا کنڈی سے ملی تھی۔ یہ واقعہ یاد آتے ہی اس کی سٹی گم ہوگئی۔ رات کے سناٹے میں گاڑیاں ایسے چل رہی تھیں جیسے گاڑیوں کا سمندر بہہ رہا ہو۔ گاڑیوں کے شور کے علاوہ دوسری کوئی آواز نہیں تھی۔ ایسے میں ایکدم ''ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے'' کی رنگ ٹون بجنے لگی۔ رکشے والا فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔

''ہاں بس میں راستے میں ہوں۔ سواری ساتھ ہی ہے۔ قیوم آباد کی ہے...... چل میں پہنچ کر تجھے بتاتا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ سامنے والا کیا کہہ رہا تھا وہ تو پتا نہیں چلا بس رکشے والے کی ہی آواز آرہی تھی۔

''بہت بڑی غلطی ہوگئی مجھ سے دیکھ بھال کر بیٹھنا چاہیے تھا مجھے۔ یہ شخص تو شکل سے ہی چور اچکا، بدمعاش لگ رہا ہے۔ یااللہ! اپنا کرم کردے۔'' اچانک ہی اسے اپنے موبائل کا خیال آیا جھٹ سے موبائل نکال کر گھر کا نمبر ملانے لگی۔

''نہیں امی، ابو پریشان ہوجائیں گے۔ ابو تو ویسے ہی ہارٹ پیشنٹ ہیں۔'' اپنے خیالات کی نفی کرتے ہوئے اس نے کال کرنے کا ارادہ ترک کردیا۔ وہ لاکھ بہادر سہی مگر اس وقت اس کا پھوٹ پھوٹ کر رونے کا دل چاہ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں عجیب سنسنی سی ہورہی تھی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ جتنی بھی دعائیں اسے آتی تھیں وہ انہیں پڑھنے لگی۔ اس کے بعد بھی ایک دو بار رکشے والے کے پاس کال آئی مگر اس نے دھیان نہیں دیا اور مسلسل آیۃ الکرسی پڑھتی رہی، رکشہ اب بلوچ پل سے گزر رہا تھا جو کسی شیطانی آنت سے کم نہیں لگتا، اپنا علاقہ قریب آتے دیکھ کر اسے کچھ ڈھارس ملی مگر دل کی کیفیت ابھی بھی ویسی ہی تھی۔ اب رکشہ اس کے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ رہا تھا۔ جبھی اس کے ذہن میں آئیڈیا آیا کہ اپنے گھر کے سامنے نہیں اترنا، رکشے والے کو اپنے گھر کا پتا نہیں لگنے دینا تھا۔ رات زیادہ ہونے کی وجہ سے گلی میں اکا دکا لوگ نظر آرہے تھے۔ وہ گلی کے نکڑ پر اتر گئی تھی۔ کرایہ دے کر وہ تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کا گھر گلی کے درمیان میں تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ گھر کی طرف بڑھ رہی تھی جبھی اسے رکشہ اپنی طرف آتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے اپنے چلنے کی رفتار بڑھا دی۔ خوف نے اس کا سارا خون نچوڑ لیا۔ ذرا سی دیر میں گلابی رنگت میں ہلدی گھل گئی تھی جبھی رکشہ اس کے برابر آکر رکا۔ اس نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ وہ چیخ کر لوگوں کو اکٹھا کرنا چاہ رہی تھی مگر حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی، اسے اپنا دل حلق میں آتا محسوس ہورہا تھا جبھی رکشے والے کی آواز اسے حال میں لے آئی۔

''باجی! یہ لیں آپ اپنا موبائل رکشے میں ہی بھول آئی تھیں۔'' جبھی اسے یاد آیا کہ ابو کو کال کرنے کے لیے اس نے بیگ سے موبائل نکالا تھا، پھر گود میں رکھ کر ہی بیٹھ گئی تھی اترنے کی جلدی میں وہ رکشے میں ہی گر گیا۔ یہ قیمتی موبائل اسے ابو نے گفٹ کیا تھا۔

''باجی! مجھے لگا کہ آخری سواری آپ تھیں، تو آپ کا ہی ہوگا۔''

''بہت بہت شکریہ بھائی!'' اس نے دل سے شکریہ ادا کیا۔ رکشے والا واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔ آج اسے احساس ہوا کہ کسی کے حلیے کو دیکھ کر آپ اس کی شخصیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے، کچھ لوگ شرافت کے لبادے میں بھیڑیے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ شیطانی لباس میں فرشتے نکل آتے ہیں۔ وہ طمانیت سے مسکراتی گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ گھر جاکر اسے چار نفل شکرانے کے پڑھنے تھے۔

......☆......

سائرہ عبدالغفار

افسانہ

خوش بخت



میں نے ہمیشہ اسے سراہا تھا۔ وہ تھی ہی سراہے جانے کے قابل۔ خوب رو، خوب صورت، دلکش، خوش گفتار، ملنسار، کون سی خوبی تھی جو خوش بخت میں نہیں تھی اور کوئی خامی نہیں تھی جو اسے چھو کر بھی گزری ہو۔ وہ بہترین تھی، معاملہ فہم تھی، موقع شناس تھی اور مددگار بھی، خوش الحان تھی تو بہترین مقررہ بھی، ہم سب اسے کہتے تھے۔

"خوش بخت تم اپنے نام کی درست تصویر ہو، پکی شبیہہ ہو خوش بختی کی"۔ اور اس کی آنکھوں کی جوت یہ سن کر لمحے بھر میں بجھ جاتی تھی۔ نجانے اسے زندگی سے اور کیا چاہئے تھا؟

میں نے اسے اکثر تنہا بیٹھے خلاؤں میں گھورتے ہوئے پایا تھا، میں نے دنیا میں اس سے بہترین لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ ایک سے ایک مہنگا اور خوبصورت لباس اس کے تن پر سجا ہوتا تھا۔ ایک سے ایک بہترین مہنگی جیولری سے وہ سجی سنوری رہتی تھی۔ اس کے جوتے اور پرس امپورٹڈ ہوتے تھے۔ اعلیٰ مہنگے ترین پرفیومز اس کے پرس میں فالتو دھرے رہتے تھے جو اکثر ہم سہیلیاں استعمال کرتے اور پھر اپنے پاس ہی رکھ لیتے، اس کے پاس مہنگی ترین برانڈ کی گھڑی اور گلاسز ہوتے تھے۔ دنیا کی کون سی آسائش تھی جو اسے میسر نہیں تھی؟ مگر مجھے وہ کبھی بھی خوش نہیں لگی۔ نجانے اسے کیا روگ تھا؟ نجانے کیسے دکھ تھے اسے؟

میں کئی بار یونیورسٹی سے اس کے گھر گئی تھی، اسی کے ساتھ اس کی گاڑی میں، ہائے میں تو خواب میں ایسی گاڑی کا تصور نہیں کر سکتی جیسی گاڑی باوردی ڈرائیور سمیت خوش بخت کے پاس حقیقت میں تھی۔ اس کے دو ہزار گز کے عالیشان بنگلے کا لان دیکھ کر میں جتنی مرعوب ہوئی۔ اس سے زیادہ مرعوب میں اس کے گھر کے اندر کا انٹیریئر دیکھ کر ہوئی۔ کوئی چیز کسی ملک سے لا کر سجائی گئی تھی تو کوئی چیز کسی ملک سے، فرانس، اٹلی، لندن، امریکہ، سوئٹزرلینڈ اور نجانے کن کن ملکوں سے لایا ہوا سامان اس کے گھر میں بکھرا پڑا تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے گھر کا کونہ کونہ دیکھ رہی تھی۔ خوش بخت کا کمرہ دیکھ کر تو میں بھونچکی رہ گئی۔ میرے گھر میں میں صرف ایک اکلوتی چارپائی اور آدھی الماری کی مالک تھی، آدھی الماری میں کتنے کپڑے پورے آتے ہوں گے بھلا؟ اور یہاں خوش بخت کے پاس اتنا بڑا کمرہ تھا، جس میں جہازی سائز ڈبل بیڈ، ڈریسنگ ٹیبل، ایک پوری دیوار الماریوں سے بھری ہوئی اور نجانے کیا کیا تھا۔ خوش بخت کی ملازمہ میری تواضع کے لئے ٹرالی گھسیٹ کر خوش بخت کے کمرے میں لائی تو میں کھانے پینے کی چیزیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ان میں سے کئی ڈشز کے مجھے نام تک معلوم نہیں تھے۔ خوش بخت کپڑے بدل کر آئی تو مجھے دیکھ کر دھیرے سے مسکرائی۔ "کیسا لگا میرا گھر؟"

"اوسم!" میں نے چاکلیٹ کیک سے بھرے منہ سے جواب دیا تو وہ پھر سے مسکرا دی اور کافی کی پیالی اٹھا کر دھیرے دھیرے چسکیاں لینے لگی۔ شام ہو جانے کے باوجود میرا وہاں سے لوٹنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں ہمیشہ کے لئے وہیں رہ جانا چاہ رہی تھی، مگر میں شام کو اپنے گھر واپس آ گئی بڑی دلگرفتگی کے ساتھ بہت افسردگی کے عالم میں۔ خوش بخت کا گھر دیکھ لینے کے بعد مجھے اب اپنا گھر کبوتر کا ڈربہ محسوس ہو رہا تھا۔ جہاں میرا ہر پل دم گھٹ رہا تھا۔ رات کو کھانے میں بینگن کا بھرتہ دیکھ کر مجھے خوش بخت کے گھر کی سجی سجائی ٹرالی یاد آئی تو میں نے بڑا برا منہ بنایا۔

"یہ کیا بنایا ہے، میں نے نہیں کھانا"۔ میں نے منہ بسورا تو اماں اور ابا نے تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ابا نے پیار سے پچکار کر کہا: "ارے میرے شیرو بیٹے کو تو بینگن کا بھرتہ ہمیشہ سے بہت پسند تھا۔ آج کیا ہوا ہے؟" اماں مجھے غصے سے گھور رہی تھیں۔

"ہونا کیا ہے آج کل بڑے نخرے کرنے لگی ہے، یونیورسٹی پہنچ کر تیر جو مارا ہے محترمہ نے"۔

"اماں پلیز! مجھے طعنے مت دیں، مجھے نہیں کھانا بھرتہ ورتہ بس"۔ میں نے پلیٹ پرے کھسکائی۔

"ارے، ارے بیٹا رزق کی بے حرمتی نہیں کرتے میرے شیرو بیٹے، چلو میں تمہیں بریانی لا دیتا ہوں"۔ ابا نے ہاتھ میں پکڑا لقمہ پلیٹ میں واپس رکھا اور اٹھنے لگے تو اماں نے ٹوک دیا۔ میں جو بریانی کا سن کر خوش ہوگئی تھی پھر منہ بنا کر بیٹھ گئی۔ اماں نے کہا۔

"ارے چھوڑیں، کھانا ہے تو یہی کھائے ورنہ بھوکی رہے، آپ کھانا کھائیں"۔ ابا کہنے لگے۔ "مگر۔"

"کچھ اگر مگر نہیں!" اماں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "جتنے نخرے کرنے ہیں اپنے گھر جا کر کرنا، آج آئی تھی علی کی ماں، اگلے مہینے کی تاریخ مانگ رہی تھی"۔ اماں نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا اور میں تو علی کا نام سن کر ہی شرم سے دہری ہوگئی تھی، اس لیے فوراً دوڑ کر اندر چلی گئی۔ ابا زیر لب مسکرائے تھے۔ اب اماں ابا کو تفصیل بتا رہی تھیں اور میری دونوں چھوٹی بہنیں شرارے اور فراک پر اٹک گئی تھیں۔ مجھے کل کا انتظار تھا تاکہ میں اپنی دوستوں کو یہ خوشخبری سنا سکوں۔

☆......☆......☆

اگلے دن میں ذرا اہتمام سے تیار ہو کر یونیورسٹی پہنچی تھی۔ سب نے میری تیاری کو نوٹ کیا تھا، جب میں نے شرم سے لال گلابی ہوتے ہوئے سب کو اپنی عنقریب ہونے والی شادی کی نیوز بریک کی تو سب ہوباؤ کر کے خوش ہوئیں اور مبارک باد دینے لگیں۔ میں نے خوش بخت کو دیکھا اس کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح بجھی ہوئی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور دھیرے سے بولی۔

"بہت مبارک ہو"۔ اس کے لہجے میں کوئی گرمجوشی نہیں تھی۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔

اس دن میرا دل چاہا کہ میں پھر سے خوش بخت کے گھر جاؤں۔ میں اس کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی، میں اور خوش بخت گھر کے اندر داخل ہوئے تو لاؤنج سے تیز تیز باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ خوش بخت کی والدہ کہہ رہی تھیں۔ "دیکھئے آپ سمجھنے کی کوشش کریں خوش بخت کی شادی نہیں ہوسکتی"۔ میں نے حیرت سے خوش بخت کو دیکھا جو اپنا نام سن کر رک گئی تھی اور میں بھی اسی کے ساتھ رک گئی تھی۔ اس کا چہرہ تاریک ہوگیا تھا۔

"آخر آپ اسے کیوں بٹھائے رکھنا چاہتی ہیں؟ میں اپنے خوبرو ہونہار لائق فائق بیٹے کا رشتہ لائی تو ہوں، آپ کو آخر کیا قباحت ہے؟" کوئی خاتون بڑے سلیقے سے بات کر رہی تھیں۔

"ہمارے یہاں خاندان سے باہر رشتے طے نہیں کیے جاتے مسز انجم! اور ہمارے خاندان کے تمام لڑکوں کی شادی ہوچکی ہے۔ اس لیے خوش بخت کو ساری زندگی کنوارہ ہی رہنا ہے"۔ خوش بخت کی والدہ کے لہجے میں حتمی پن تھا، میں لرز گئی، خوش بخت کسی بت کی طرح کھڑی تھی، اس کی دائیں آنکھ سے ایک آنسو نکل کر صبیح گال کو بھگو رہا تھا۔

"آپ اپنی بچی کے ساتھ بڑا ظلم کر رہی ہیں مسز وجاہت"۔ مسز انجم بولیں۔

"ہم اپنے پرکھوں کی روایات کی پاسداری کر رہے ہیں، ہمارے یہاں ہمیشہ سے یہی ہوتا آرہا ہے، اور ہم ان روایات سے منحرف ہو کر برادری کی ناراضی کا رسک نہیں مول لے سکتے، آپ ہمیں نہ سکھائیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے، ہم اپنا بھلا برا خوب سمجھتے ہیں"۔ خوش بخت کی والدہ کے لہجے میں غرور تھا اور میں نے آج خوش بخت کو درست طریقے سے جانا تھا، وہ خوش بخت نہیں تھی، وہ ایک ایسی شہزادی تھی جس کی جھولی خالی تھی وہ امیر زادی ضرور تھی مگر اس کے ہاتھ خالی تھے، وہ فقیر بخت تھی؟ خوش بخت کے پاس دولت تھی مگر قسمت نہیں تھی، اور دولت سے وہ قسمت خرید بھی نہیں کر سکتی تھی، خوش بخت ٹوٹے قدموں سے بکھرے مجسمے کی طرح اندر کی طرف بڑھی، اور میں وہیں سے پلٹ کر گھر لوٹ آئی۔

☆......☆......☆

قرۃ العین سکندر

افسانہ

زندگی جھد مسلسل

زندگی جس میں دھوپ کی تپش بھی ہے بارشوں کی ٹھنڈک بھی، ایسے ہی کبھی جلتی دھوپ میں چلتے چلتے سایہ مل جاتا ہے، اور کبھی تمام عمر آبلہ پا تپتی زمین پر تنہا چلنا پڑتا ہے، جہاں زندگی میں تمناؤں



کی صبح ہوتی ہے، وہاں آرزوؤں کی شام بھی ڈھل جاتی ہے، اگر محبتوں کی کرنیں چھاتی ہیں تو جدائیوں کی آندھیاں بھی ضرور چلتی ہیں، اس شاہراہ زیست میں خلوص لٹانے والے بھی ملتے ہیں اور پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچنے والوں کی کمی نہیں ہوتی۔

ایسا ہی کنول کے ساتھ بھی تھا، کنول جو ہر کسی کے لیے پرخلوص جذبات رکھتی تھی، مگر اکثر انہی خلوص بھرے جذبات کی بدولت گہرے دکھوں نے بھی اس کے دل پر دستک دے ڈالی تھی۔ انہی دکھوں میں رقم گہرا دکھ جو اس کی زیست پر چھا چکا تھا وہ احمر کے جیون ساتھی بننے کا دکھ تھا۔ احمر اور کنول شہر کی معروف یونیورسٹی میں اکٹھے زیر تعلیم تھے۔ رسمی بات چیت سے بات شروع ہوئی اور پھر یہ گہری دوستی میں بدل گئی۔ احمر نے کچھ اس انداز سے اپنی محبت کا مدعا سامنے رکھا کہ کنول، کنول کے پھول کی مانند چھوئی موئی سی ہو گئی اور اس کی خاموشی کو احمر نے حوصلہ افزائی سمجھا۔ جلد اپنے والدین کو کنول کے گھر رشتے کے لیے بھیج دیا۔ یوں بھی کنول تعلیم سے فراغت حاصل کر چکی تھی،



کنول کے والدین نے جب کنول سے عندیہ لیا تو کنول نے بھی حامی بھر لی۔ احمر وجیہہ تھا اسمارٹ تھا اور سب سے بڑھ کر چاہت سے طلبگار تھا۔ کنول جس عمر میں تھی وہاں محبت کی طلب ہر طلب پر حاوی ہو جایا کرتی ہے، یوں کنول بھی احمر کی محبت میں ڈوب کر اپنے اطراف میں اپنے والدین کی پریشانی کی وجہ نہ بھانپ سکی۔ اس کی والدہ نے بارہا کنول کی توجہ اس طرف دلانا چاہی کہ کنول اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہے۔ خوب نازوں پلی، احمر پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے اور اس پر کافی ذمہ داریاں ہیں۔ پھر جب رشتے کے سلسلے میں احمر کے گھر والے آئے تو اس کی ہونے والی نندوں کی گھومتی گھامتی نظروں سے فریحہ بیگم اس عمر میں بھی ہول کر رہ گئی تھیں۔ کنول معصوم تھی اور اسے دنیا کی چالاکیوں کی قطعاً سمجھ نہ تھی، فریحہ بیگم گھبرائی تھیں کہ نجانے اگلے گھر میں جہاں نندوں کا اس قدر عمل دخل ہوگا، ان کی نازوں پلی اکلوتی بیٹی کیسے اس گھر میں نباہ کر سکے گی۔

کنول نے ان سب باتوں سے قطع نظر محض احمر کو مرکز نگاہ بنا رکھا تھا۔ یوں قدرت کی رضا سے احمر اور کنول رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ کنول سج دھج میں نرالی چھب دکھلا رہی تھی۔ وہ اس قدر حسین اور جاذب نظر حسن جاوداں کی مالک لگ رہی تھی کہ نگاہ اس کے چہرے پر آن کے ٹک سی جاتی تھی اور پلٹنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ اتنا پرنور وجود لگ رہا تھا اس کا۔ میرون وزنی کامدار لہنگے میں وہ کسی اپسرا سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ اندرونی خوشی کا عکس اس کے چہرے پر جھلملا رہا تھا۔ ماں باوا کی دعاؤں میں رخصت ہو کر وہ احمر کے گھر آ گئی۔

☆.........☆.........☆

عروسی کمرے میں بیٹھی کنول احمر کا انتظار کر رہی تھی اور دل کبھی تیز اور کبھی مدھم لے پر دھڑک رہا تھا۔ اگرچہ یہ وہی احمر تھا جس سے وہ گھنٹوں باتیں کر لیا کرتی تھی مگر آج وہ اس احمر سے سامنا کرنے سے گھبرا رہی تھی، بے انتہا فطری شرم نے اس کی ذات کا احاطہ کر رکھا تھا۔

کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی جب احمر کمرے میں نہ آیا تو کنول کو خفت کا ادراک ہوا، وال کلاک پر نگاہ ڈالی تو صبح کے چار بج چکے تھے، وہ مستقل ایک ہی زاویے سے پچھلے دو گھنٹوں سے تنہا اس کمرے میں بیٹھی احمر کا انتظار کر رہی تھی۔ اب تو اس کا وجود بھی پتھر کا بن چکا تھا، اچانک مایوسی سی اس کے وجود میں گھر کرنے لگی، تبھی دروازے پر ہلکی دستک کے بعد احمر کمرے میں آ گیا۔ کنول محتاط ہو کر سمٹ کر بیٹھ گئی اور سر جھکا لیا۔ احمر کنول کے پاس آ کر دوزانو بیٹھ گیا۔

"ارے تم تو یوں شرما رہی ہو جیسے کہ پہلی بار مل رہی ہو مجھ سے، یہ دکھاوا کیوں بھئی؟ ریلیکس کرو"۔

احمر کے لب و لہجے میں ایسا کچھ انوکھا پن تھا کہ کنول چونک کر رہ گئی اور حیرت واستعجاب سے احمر کو دیکھنے لگی۔

"دیکھو کنول! اب جب کہ تم اس گھر میں آ چکی تو خود کو اس گھر کا حصہ ہی سمجھو۔ بس اتنا یاد رکھنا کہ میری پانچوں بہنیں مجھ سے بڑی ہیں اور قابل احترام ہیں۔ امی کی وفات کے بعد کلثوم آپا نے مجھے پالا ہے اور میں ان کی کوئی بات ٹال نہیں سکتا۔ اس گھر میں کلثوم آپا کی بات کو حرف آخر سمجھا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی ان کو وہی مقام وہی مرتبہ دو جن کی وہ مستحق ہیں"۔

شادی کی اولین رات ہی احمر اپنی بہنوں کی باتیں کنول سے کرتا رہا اور کنول حیران تھی کہ آج سے پہلے تو احمر نے کبھی بھی اپنی ان بہنوں کا تذکرہ

تک نہ کیا تھا۔ ایک آدھ بار سرسری سا ذکر ہوا تھا اور آج کی رات جب وہ احمر کی جانب سے کسی محبت بھرے تعریفی انداز کی توقع کر رہی تھی احمر اسے اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے میں مصروف عمل تھا، وہ دم سادھے احمر کی ہر بات نہایت توجہ سے سن رہی تھی۔

"آپا نے ابھی مجھے کہا ہے کہ اپنی بیوی کو اچھی طرح سمجھا دو کہ آپا کا ہر حکم تمہیں بلاچوں چراں ماننا ہوگا اور مجھے امید ہے کنول کہ تم مجھے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دو گی"۔ اچانک احمر نے کنول کا ہاتھ تھام لیا تو کنول کے برف بار ہاتھ میں حرارت کی رمق آئی۔

احمر کے بدلتے انداز دیکھ کر کنول کا چہرہ جھک گیا، احمر ہر گزرتے پل کے ساتھ اپنے رنگ بدلتے ہوئے کس قدر اجنبی لگ رہا تھا۔ کنول زیادہ دیر تک کچھ سوچ نہ سکی کیونکہ احمر نے اسے اپنے وجود کے حصار میں قید کرلیا تھا اور کنول کسمسا کر رہ گئی تھی۔

☆............☆............☆

زندگی کے یہ رنگ کنول کے لیے بالکل نئے تھے۔ کنول کو لگتا تھا کہ اس کی زندگی کا مقصد محض کلثوم آپا کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنا ہے، اس کی زندگی کا مرکز ومحور کلثوم آپا تھیں۔

کلثوم آپا نے اپنے بھائی اور چھوٹی بہنوں کے لیے خود شادی نہ کی تھی، اور وہ روکھے رنگوں بھری زندگی گزارنے پر مجبور تھیں، یہی روکھاپن اب ان کی شخصیت کا خاصا بن چکا تھا۔ ہر بات کہتے ہوئے ان کا انداز اس قدر سخت ہوتا تھا کہ اولین دنوں میں تو کنول سمجھ ہی نہ سکی کہ کلثوم آپا اس سے بات کر رہی ہیں یا اسے ڈانٹ رہی ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ گھر کا ماحول اور آپا کا مزاج سمجھنے لگی تھی۔ اس میں اس کی ذاتی کاوش کا بھی بڑا عمل دخل تھا۔

کلثوم آپا کا مزاج تب تک ہی ٹھیک رہتا تھا جب تک کہ وہ گھر گرہستی میں الجھی رہتی، جوں ہی اس کا کوئی کام احمر سے متعلق ہوتا وہ بھی تیار ہوتی کہ احمر کی آمد کا وقت ہے تو کلثوم آپا کا موڈ سخت آف ہو جاتا تھا۔ شروع میں تو کنول اسے محض اپنا وہم سمجھی مگر یہ اس کا وہم نہ تھا۔ ایک دن جب اس نے احمر کی پسند کے کلر کے کپڑے زیب تن کیے اور خوب اہتمام سے تیار ہوئی تو احمر کی آمد سے قبل ہی کلثوم آپا نے اسے اپنے پاس بلایا اور تیوریاں چڑھا کر کہا۔

"بی بی! کچھ تو شرم لحاظ کرو، اتنی بھی کیا بے صبری ہے کہ سرشام تم سج دھج کر بیٹھ جاتی ہو، معلوم بھی ہے کہ احمر کی دو بہنیں ہیں جو قریب ہی رہتی ہیں، شام کو آکر احمر کو دیکھ نہ لیں تو ان کے بے قرار دل کو قرار نہیں ملتا۔ تمہارے یہ تیور دیکھ کر ان کے اوپر کیا اثر پڑے گا، پھر معصوم بھانجیاں، توبہ توبہ۔ امی مرحومہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ وہ اور ابا بھی ساتھ بیٹھ کر کھانا تک نہ کھاتے تھے۔ ایک شرم تھا، پاس لحاظ تھا، مگر ایک آج کا دور ہے۔ خیر تم سے تو کچھ کہنا ہی بے کار ہے۔ تم نے تو شادی سے پہلے ہی احمر پر ایسا جادو چلایا کہ وہ تن تنہا اٹھ کھڑا ہوا ہم بہنوں کے سامنے مگر میری ایک بات یاد رکھنا تم اس گھر میں تو آگئی ہو مگر اگر یہ سمجھتی ہو کہ اس گھر پر بھی قبضہ کرلو گی اپنے ان تیوروں سے تو یہ تمہاری سراسر بھول ہے۔ ابھی جاؤ اور جا کر کوئی مناسب سادہ لباس پہن کر آؤ، ہمیں بھی تو کبھی ایسا لگے کہ کسی شریف گھرانے کی لڑکی بیاہ کر لائے ہیں"۔ کلثوم آپا بنا لحاظ رکھے جو منہ میں خرافات آئیں بولتی چلی گئیں۔ یہ سوچے سمجھے بنا کہ آخر کنول کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

شکستگی سی در آئی تھی کنول کے وجود میں۔ عجیب سی تھکن زدہ ہستی لیے وہ کمرے میں آگئی،

پہلے چوڑیاں اتاریں، بندے اتار کر بے دلی سے ٹیبل پر رکھ دیئے۔ آنسوؤں کی نمی میں کاجل پہلے ہی بہہ رہا تھا، لپ اسٹک بھی بے دردی سے رگڑ ڈالی۔

"تو یہ تھا تمہارا مقدر کنول! کتنے ارمان تھے تمہارے آج معلوم ہوا کہ ہر آرزو کے مقدر میں منزل نہیں ہوتی، بعض آرزوئیں ہمیشہ نامکمل، ناتمام، ادھوری سی، تشنہ لب، تشنہ روح رہ جایا کرتی ہیں"۔

وہ کافی دیر یونہی بیٹھی اپنی قسمت پر ماتم کناں رہی، تبھی اچانک دروازہ جھٹکے سے کھلا، احمر سخت طیش کے عالم میں نظر آرہا تھا۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہوئی ہو؟ وہاں آپا جان کچن میں خود چائے بنا رہی ہیں، اس قدر سر درد ہے آپا جان کو اور تم سارا دن کیا کرتی رہتی ہو، میری عظیم ماں جیسی بہن وہاں کچن میں گرمی میں جھلس رہی ہیں اور تم یہاں بیٹھی ہو آرام سے سج سنور کر"۔

احمر کی بات پر کنول فقط ٹھنڈی آہ بھر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچھ بھی کہنا عبث تھا۔ یہاں نہ کوئی سننے والا تھا اور نہ ہی کوئی درد سمجھنے والا تھا۔

"اب جا کہاں رہی ہو؟" احمر نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"آپا جان کے پاس کچن میں"۔ آنسوؤں کی نمی میں گھلا اس کا لہجہ پرسوز تھا۔

پھر یہ کہہ کر کنول رکی نہیں تیزی سے کچن کی جانب چل دی۔ کنول کا رویا رویا سوجی آنکھوں والا چہرہ دیکھ کر کلثوم آپا نے گہری طمانیت بھری سانس لی اور کچن سے باہر آگئیں۔

کلثوم آپا درحقیقت ان خواتین میں سے تھیں جو اپنے بھائی کو فقط اپنی ملکیت تصور کرتی ہیں، پھر وہ بھائی نہ تو کسی کا بیٹا ہوتا ہے نہ کسی کا شوہر۔ فقط ایک ہی رشتہ ہر رشتے پر حاوی ہو جاتا ہے۔ بہن کا رشتہ۔ کلثوم آپا کو باقی سارے رشتے اس رشتے کے سامنے محض ایک ڈھکوسلہ دکھاوا لگا کرتے تھے۔ اکثر کلثوم آپا کے لبوں پر یہی جملہ ہوا کرتا تھا۔

"کنول! اپنی حیثیت اپنا مقام یاد رکھنا تم کبھی بھی احمر کی زندگی میں وہ جگہ حاصل نہیں کر سکتی جو میری ہے، میں نے احمر کو گودوں میں کھلایا ہے، قربانی دی ہے اپنی زندگی تیاگ دی ہے، میرے بیٹوں سے بڑھ کر ہے احمر"۔ کنول کو کلثوم آپا کی اس بات سے اس نظریے سے کوئی اختلاف نہ تھا کہ وہ بھی کلثوم آپا کی قربانی کی قائل تھی۔ کلثوم آپا نے محض احمر کی خاطر شادی نہ کی تھی جبکہ ان کی بات اپنے چچازاد سے طے تھی اور بچپن کی چاہت کو چھوڑنا اس قدر سہل نہیں ہوا کرتا۔ کافی انتظار کے بعد سہیل نے شادی کر لی تھی۔

احمر ہی نہیں دو چھوٹی ندا اور شزا کے لیے بھی کلثوم آپا نے اپنی ساری زندگی تیاگ دی تھی۔ دیکھا جائے تو کلثوم آپا کا یہ جذبہ قابل ستائش تھا اور یہ کلثوم آپا کا حق تھا کہ احمر ان کو ماں کا مقام بھی دیتا مگر اللہ رب العزت نے ہر رشتے کو اس کی اصل اہمیت کے ساتھ رکھا ہے۔ جو مقام کلثوم کا تھا وہ کنول ہرگز نہ لے سکتی تھی، یہ بات کنول بخوبی سمجھتی بھی تھی۔

مگر کلثوم آپا کو اس بات کا قطعاً ادراک نہ تھا کہ کنول کے بھی بیوی کی حیثیت سے کچھ حقوق تھے کچھ خواب تھے، کلثوم آپا نے کنول کو محض ایک کٹھ پتلی سے زیادہ کچھ نہ سمجھا تھا جس کی ڈور کلثوم آپا کے ہاتھ میں تھی۔ کلثوم آپا جیسا چاہیں کنول ویسا ہی پہناوا پہنے۔ حد تو یہ کہ کلثوم آپا کو اگر احمر کا کنول کے ساتھ بات کرنا مسکرانا ناگوار خاطر گزرے تو احمر بھی محتاط ہو جائے اور ایسا ہی ایک رات ہوا۔

احمر اگرچہ احترام کے رشتے کی زنجیر میں قید تھا

مگر بسا اوقات احمر کے دل پر بھی ماضی کے دریچوں کی دستک ہوا کرتی تھی، کنول کا اداس سراپا اس کو ندامت کی اتھاہ گہرائیوں میں لے جایا کرتا تھا مگر وہ کنول کو مایوسی سے خوشی میں لانے کے لیے چند لمحات کی دلجوئی ہی کر سکتا تھا جب کلثوم آپا کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا اور یہ مختصر لمحات احمر اور کنول کی زندگی کا کل تھے۔

ایک رات کنول کو اداس دیکھ کر احمر کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ دونوں لاؤنج سے باہر نکلنے والے ٹیرس پر کھڑے ہو کر کھلی ہوا میں سانس لیں۔ کھلے ماحول میں دونوں آئے تو ایک دم دونوں کو ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔ احمر نے کنول کو گہری نگاہوں سے دیکھا، کنول کی دودھیا رنگت اس منظر میں خاصی چمک رہی تھی اور کنول کے چہرے کی دھیمی سی مسکان اس منظر کو بہت دلفریب بنا رہی تھی۔ احمر کا شدت سے دل چاہا کہ وہ ازسرِ نو کنول سے اظہار محبت کرے، اچانک احمر نے کنول کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

"کنول! اداس مت رہا کرو، میری مشکل کو سمجھنے کی کوشش کرو، میں دو کشتیوں کا سوار ہوں، نہ ادھر کا نہ اُدھر کا۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں جانتا ہوں کلثوم آپا کا رویہ تھوڑا سخت ہے مگر دل کی بری نہیں ہیں، وہ میرے معاملے میں کچھ زیادہ ہی پوزیسو ہیں"۔ احمر دھیمے لہجے میں کنول کو اپنی مشکل سے آگاہ کر رہا تھا۔ کنول کو اچھا لگا کہ کم از کم احمر کو کنول کی زندگی میں پیش آنے والی مشکلات کا اندازہ تو ہوا۔

"احمر! آپ کی خاطر ہی تو ہر بار ہر تکلیف دہ جملہ سہہ جاتی ہوں کیونکہ آپ کو کھو دینے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے۔ آپ تو محبت کر کے بھول بیٹھے ہیں مگر میں نبھانے والوں میں سے ہوں"۔ کنول کا شاکی لہجہ کنول کی ناراضی کی چغلی کھا رہا تھا۔

آخر وہ بھی کہاں تک صبر کرتی۔ اگر انسان کو معلوم ہو کہ کوئی ساتھ نبھانے والا ہے تو پھر زندگی کی ہر مشکل اور ہر راہ آسان ہو جایا کرتی ہے، مگر کنول کو تو یوں لگتا تھا کہ وہ ننگے پاؤں اکیلی اس دشت سفر کی راہی ہے۔

"ہونہہ... تو بیگم صاحبہ لڑنے کے موڈ میں ہیں"۔ احمر نے محبت پاش انداز میں کہا تو کنول کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اتنے عرصے کے بعد تو کنول سے احمر نے چند محبت بھری باتیں کی تھیں۔ دل کے کچھ راز کہہ ڈالے تھے۔ کنول نے مسکرا کر احمر کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ تبھی پیچھے سے کلثوم آپا آن وارد ہوئیں۔

"توبہ توبہ کچھ تو شرم لحاظ کرو، احمر، کنول تو ایسی ہی ہے مگر مجھے تم سے قطعاً ایسی امید نہ تھی، اگر اتنی ہی بے تابی بے صبری ہے تو کمرے میں جا کر عشق نامہ بیان کرو، یہاں یوں سرعام جبکہ معلوم بھی ہے گھر میں جوان جہان بھانجیاں ہیں، اگر حفصہ اور ریما میں سے کوئی ادھر آ جاتا اور تم دونوں کو یوں شتر بے مہار دیکھ لیتا"۔ کلثوم آپا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کنول کے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیں۔ کنول کے لئے ان کے چہرے پر پھیلی نفرت کے گہرے سائے صاف عیاں تھے۔ احمر نہایت تابعداری سے ہاتھ باندھے نادم سا کھڑا تھا۔

کنول کو کچھ دیر قبل پیش آنے والا وہ محبت بھرا لمحہ کوئی خواب کوئی خیال گزرا۔

"اب کھڑی بے شرموں کی طرح میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو دفعان ہو جاؤ اپنے کمرے میں"۔ کلثوم آپا نے سخت طیش کے عالم میں کہا تو کنول اپنے اچانک امڈ آنے والے سیلابی ریلے کو روک نہ پائی اور بے اختیار چہرہ نم کر دینے والے آنسوؤں کو دباتی ہوئی سسکتی کمرے میں بھاگ گئی۔

"اور احمر! تم رکو مجھے تم سے بات کرنی ہے"۔

کلثوم آپا کی بات پر احمر کے قدم جہاں تھے تہاں رہ گئے۔

"احمر بیٹا! بیوی کوئی سر پر چڑھانے والی شے نہیں ہے، اسے برتو مگر اپنے سر کا تاج مت بناؤ، سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟ تمہاری ضد پر وہ اس گھر میں آ تو گئی ہے مگر یہ خیال دل سے نکال دو کہ اس کے چال چلن کو بھی فراموش کر دوں گی، کیسے جال میں پھنسا لیا میرے معصوم بھائی کو..." کلثوم آپا نے گلوگیر لہجے میں کہا اور اچانک چکرا کر گر گئیں۔

وہ ساری رات احمر نے کلثوم آپا کے سرہانے بیٹھ کر گزاری۔ کلثوم آپا ساری رات احمر کا ہاتھ تھامے یہ یقین دہانی کرتی رہیں کہ ان کا لاڈلا اکلوتا بھائی اُن کی نظروں کے سامنے ہے اور احمر نے اس دن دل میں حتمی طور پر طے کر لیا کہ وہ اپنی پیاری آپا کا کبھی دل نہیں دُکھائے گا اور کنول سے ایک دوری کا تعلق بنائے رکھے گا۔ وہ کلثوم آپا کے احسانات کا بدلہ نہیں چکا سکتا تھا، کیسے سلائی کر کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اوپر کا پورشن کرائے پر دے کر انہوں نے سب کو تعلیم دلائی۔ ابا کی پنشن کا بھی سہارا تھا۔ یہ سب معاملات وہ فقط دس سال کی عمر میں سمجھ نہیں سکتا تھا یہ کلثوم آپا ہی تھیں جنھوں نے یہ سب معاملات بخوبی سنبھالے تھے۔

دو چھوٹی بہنیں تو دوسرے شہروں میں بیاہی تھیں مگر دو آخر والی ندا اور شزاء قریب ہی رہتی تھیں۔ سسرال بے حد قریب تھی آئے دن کی آمد و رفت تھی پھر اُن کی اپنی بیٹیاں تھیں جو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھیں۔ کلثوم آپا کا زیادہ ساتھ ندا آپی ہی دیا کرتی اور ان کی بڑی بیٹی حفصہ ہو بہو اپنی ماں کا پرتو تھی۔ کنول سے اس قدر بدتمیزی سے بات کیا کرتی تھی کہ کبھی کنول کو گمان گزرتا کہ کیا واقعی وہ حفصہ کی ممانی ہے؟ کیونکہ اس کے گھر میں ہمیشہ والدہ نے یہی سبق دیا تھا۔

"بیٹا! بڑوں کی عزت کرو، درمیان میں ٹوکنا بھی بے ادبی کہلاتا ہے"۔

مگر یہاں معاملہ الٹ تھا۔ کنول کو بچوں کو سمجھانے تک کی آزادی حاصل نہ تھی۔ ایک دن حفصہ کھڑے ہو کر پانی پی رہی تھی کنول کی شامت اعمال آئی تھی اس نے کہا۔

"حفصہ بیٹا! باہر گرمی سے آئی ہو، آرام سے بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پیو پھر یہ سنت رسولؐ بھی ہے"۔

کنول کا اتنا سمجھانا تھا کہ حفصہ کو تو جیسے پتنگے ہی لگ گئے۔

"ممانی! آپ مجھے ہر بات میں ٹوکنا چھوڑ دیں، آپ کے آنے سے پہلے بھی میں اسی طرح آ کر حق سے کچن کی چیزیں استعمال کیا کرتی تھی، اب جب سے آپ آئی ہیں ہر وقت کی روک ٹوک"۔ حفصہ سخت بدتمیزی سے گلاس کاؤنٹر پر پھینک کر بولی، کنول حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

یہ سب قصور تو سراسر احمر کا تھا کہ وہ آج اتنی چھوٹی لڑکی کے ہاتھوں اپنی تذلیل کروا رہی تھی۔ اس گھر میں اس کی وقعت ہی نہ تھی۔

"حفصہ! تم بات کو بالکل غلط رنگ دے رہی ہو اور یہی تمیز سکھائی ہے تمہیں بڑوں سے بات کرنے کی"۔ کنول بھی شدید غصے کی لپیٹ میں تھی۔

"سن رہی ہیں آپا جان! کس طرح ہمیں یہاں آ کر باتیں سننا پڑتی ہیں اور میری تربیت کی بات کرتی ہے، پہلے اپنی ماں کی تربیت کی بات کرو جس نے لڑکوں پر ڈورے ڈالنا سکھایا ہے"۔ ندا آپی اور کلثوم آپا نجانے کب وہاں آئیں اور کنول کا آخری جملہ سن کر ندا آپی کا غصہ عروج پر تھا۔

"بہت افسوس کا مقام ہے کنول! ابھی اور اسی

وقت تم ندا آپی اور حفصہ سے معافی مانگو ورنہ تمہیں پچھتانا پڑے گا۔"

"معافی مگر کس بات کی؟" کنول حیرت زدہ تھی۔

"میں نے حفصہ سے ایسا کچھ نہیں کہا جس کی معافی مانگی جائے، معافی تو حفصہ کو مجھ سے مانگنی چاہئے"۔ کنول نے بھی آج جرات مندی سے کہہ دیا۔

"یہ صفائیاں تم اب احمر کے سامنے پیش کرنا اور صفائی پر یقین بھی احمر کر سکتا ہے، بھولا ہے ناں میرا بھائی اور رہی بات معافی کی تو اب یہ معاملہ احمر کے سامنے ہی طے ہوگا"۔ کلثوم آپا نے قطعیت بھرے انداز میں کہا۔

پھر شام کو احمر نے کنول کو طلاق کی دھمکی دے کر معافی منگوائی۔

☆............☆............☆

نکھرا نکھرا دھلا صحن کا فرش کنول کی آنکھوں کو سکون دے رہا تھا۔ وائپر ایک طرف رکھ کر اس نے صحن پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ زندگی کی دھول مٹی کو تو صاف کرنے کی اہل نہ تھی مگر گھر کے کونے کونے سے اس جذبے کو تسکین دیا کرتی تھی۔

اس دن کے بعد کنول بہت خاموش رہنے لگی تھی۔ بہت گم صم، اگر احمر نہ بلاتا تو بھی اب اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ شاید وہ اپنی اصل حیثیت اور مقام کو بخوبی جان چکی تھی اور اپنی قسمت پر سمجھوتہ کر کے خاموشی اختیار کر چکی تھی۔ کسی نے بھی اس کی اس قدر خاموشی کی وجہ پر غور نہ کیا البتہ کلثوم آپا اکثر فاتحانہ نگاہوں سے اس کے اجاڑ حلیے اور ویران نگاہوں کو دیکھ کر مطمئن سی ہو جایا کرتی تھیں۔

یہ ان کی جیت ہی تو تھی کہ احمر جو کنول کو ضد کر کے اس گھر کی زینت بنا کے لایا تھا آج اسے ایک کونے میں ڈال کر نام کے ساتھ جوڑ کر بھول بیٹھا تھا۔ احمر شام کو آتا تو ساری بہنیں اسے گھیر لیتیں اور احمر کے ساتھ خوب گپیں لگاتی تھیں۔

کنول کچن میں ایک کے بعد ایک فرمائشیں پوری کرنے میں لگی رہتی اور جب کنول کو فراغت ملتی آ کر کمرے میں بند ہو جاتی۔ اب اسے احمر کے انتظار کی عادت بھی نہ رہی تھی۔ جب احمر کے آنے کا وقت ہی متعین نہ تھا تو یہ انتظار لاحاصل تھا۔

شاہی فرمان نازل ہوتا تو احمر دبے قدموں سے کمرے میں جاتا۔ کبھی تو کنول تھک کر سو چکی ہوتی اور اگر جاگ بھی رہی ہوتی تو کروٹ بدل کر سوتی بن جاتی۔ نا معلوم کیوں اسے اب احمر سے وحشت سی ہوتی تھی۔ ایک ایسا رشتہ جس کی اصل معنوں میں کوئی حقیقت اور وقعت ہی نہ تھی، یہ محض نام کا رشتہ تھا جس میں اب کسی جذبے کی حدت کا دخل نہ رہا تھا۔ کبھی کبھار احمر اپنا حق ملکیت جتاتا تھا تو کنول تب بھی کسی پس و پیش کے بنا احمر کی بات مان لیتی۔ احمر کی محبت رات کی تاریکی میں چند لمحات کی مرہون منت تھی جو دن کے اجالے میں کسی تاریکی میں جا کر ڈوب جایا کرتی تھی۔ کنول کے جذبات منجمد برف بار تھے اور اب اسے کوئی امید نہ رہی تھی۔

شاید زندگی کا یہ سلسلہ یونہی ساری عمر رہتا مگر ایک دن کنول کام کرتے کرتے کچن میں لہرا کر گر گئی۔ احمر جو پانی پینے کے ارادے سے کچن میں آیا تو کنول کو یوں گرے ہوئے دیکھا تو فوراً ڈاکٹر کو بلا لیا۔ وہ کافی دنوں سے کنول کا مضمحل وجود دیکھ رہا تھا مگر حالات کے پیش نظر خاموش رہنے میں ہی عافیت تھی۔

مگر آج جب کنول کو یوں دیکھا تو اچانک اسے کھو دینے کا احساس ہر شے پر حاوی ہو گیا۔ ڈاکٹر نے مکمل چیک اپ کرنے کے بعد کہا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے ایسی حالت

میں تو ایسا ہو جایا کرتا ہے مگر لگتا ہے کنول اپنی صحت کے معاملے میں خاصی لاپرواہ ہیں، اتنی ویک نیس ہے اور اس حالت میں بے بی پر بھی اس کے اثرات پڑ سکتے ہیں، شی از پریگننٹ، میں طاقت کی دوائیاں لکھ رہی ہوں وہ آپ باقاعدگی سے لیں"۔ لیڈی ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا تو کنول بس دیکھتی رہ گئی۔

کنول بہت کمزور ہو چکی تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے نمایاں تھے جو بے خوابی کی چغلی کھا رہے تھے۔ احمر کی خوشی دیدنی تھی اور کلثوم آپا کا وجود سناٹوں کی زد میں تھا یہ تو انہوں نے سوچا تک نہ تھا کہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

"آپا جان! سنا آپ نے"۔ احمر نے خوشی سے کہا تو آپا جان چونک گئیں۔

"آں ہاں..." کلثوم آپا جیسے کسی گہرے پاتال میں سے بولی ہوں۔

"آیئے میرے ساتھ احمر صاحب"۔ لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ احمر مین گیٹ تک آیا۔

"دیکھئے احمر صاحب! ہر گھر میں اونچ نیچ ہوتی ہے مگر جو حلیہ اور حالت کنول کی ہے وہ تو سب عیاں کر رہی ہے، آپ انہیں بھرپور توجہ دیں اور یوں لگتا ہے کہ وہ جیسے کسی گہرے ٹرانس میں ہیں، ان کی عجیب سی خاموشی اور پھر اتنی نقاہت جیسے کافی دنوں سے انہوں نے پراپر ڈائٹ نہیں لی، ایسا ہی رہا تو خدانخواستہ ان کا مس کیرج بھی ہو سکتا ہے"۔ لیڈی ڈاکٹر کی بات نے احمر کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

نامعلوم احمر نے گھر میں سب سے کیا کہا کہ اُس دن کے بعد سب کا رویہ احمر کے کہنے پر کنول کے ساتھ تبدیل ہو گیا تھا۔ کنول اگر کبھی کچن میں جاتی تو کلثوم آپا اس کو آرام کرنے کی تاکید کیا کرتی تھیں اور کنول بے یقینی سے بس دیکھتی رہ جاتی تھی۔

کنول کو وہ دن بھی یاد تھے جب وہ کولہو کے بیل کی طرح دن رات کاموں میں جتی رہتی تھی، احمر بھی اکثر محبت کے دعوے کرتا، اس کے کھانے کا خیال کرتا اور کنول کے ناز اٹھاتا مگر یہ سب اب کنول کو ڈھکوسلا ہی لگا کرتا تھا کیونکہ یہ سب کچھ تو وہ اپنے بچے کے لیے کر رہا تھا نہ کہ کنول کی خاطر۔

ایک دن کنول کی امی آئیں تو اسے سمجھایا اور کہا۔

"بیٹا! میں جانتی ہوں کہ تم بہت باظرف ہو، بس اللہ سے یہی دعا ہے کہ وہ تمہارے ظرف کے پیمانے کو ہمیشہ یونہی بھرا رکھے، دھیان رکھنا اب کبھی یہ آنسو نہ بہیں اور معاف کر دینے والا اعلیٰ ظرف ہوا کرتا ہے"۔

پھر ایک دن کنول نے ایک صحت مند گول مٹول سے بیٹے کو جنم دیا تو اس کی دنیا جیسے مکمل ہو گئی ہو۔ وہ بے حد خوش تھی اور اسی لئے آج اس نے سب کو معاف کر دیا تھا۔ وہ اچھی طرح ہر بات جان چکی تھی۔ ایک دن جب اس نے کلثوم آپا اور احمر کی باتیں سن لی تھیں جب احمر نے گھر چھوڑنے کا کہا اور کلثوم آپا نے منت سماجت کر کے بھائی سے وعدہ کیا کہ آئندہ کوئی کنول کو نہ ستائے گا۔

جس دن کنول نے بیٹے کو جنم دیا اس کو کنول نے کلثوم آپا کی گود میں ڈال دیا اور کہا۔

"آپا جان! یہ بھی آپ کا ہی بیٹا ہے۔ جس طرح احمر آپ کے بیٹے ہیں۔ آپا جان آپ کی عزت کیونکر نہ میں کرتی جبکہ میں جانتی ہوں کہ آپ کے بنا احمر کی زندگی ادھوری ہے اور احمر کی ہر خوشی میری خوشی ہے اور احمر کا ہر غم میرا غم ہے"۔

اس دن خوشیوں کی برسات کا دن تھا۔ کلثوم آپا نے سچے دل سے کنول کو معاف کر دیا اور اپنا لیا۔

آج کنول بے حد شاداں اور فرحاں تھی۔

☆..........☆..........☆

نظرِ بد کی حقیقت

نظرِ بد کے بارے میں فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

آپ نے فرمایا : اَلْعَیْنُ حَقٌّ

ترجمہ : نظر کا لگ جانا برحق ہے (صحیح بخاری)

- حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا : نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم نظرِ بد سے بچنے کیلئے تعویذ استعمال کیا کریں۔ (بخاری و مسلم)
- حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے گھر ایک لڑکی کو دیکھا جس کا چہرہ زرد تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا اس کے لئے دعا تعویذ کراؤ اسے نظرِ بد لگی ہے۔ (بخاری، مسلم)
- حضرت عوف بن مالک الاشجعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم لوگ زمانۂ جاہلیت میں جھاڑ پھونک کرتے تھے (اسلام لانے کے بعد) ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! ان کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرماتے ہیں ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے تعویذات مجھے پیش کرو، اگر ان میں شرک نہ ہو تو ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ (مسلم)

علاج

- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظرِ بد سے بچنے کے لئے دعائیہ کلمات بھی اپنی امت کو بتلائے۔ مثلاً فرمایا کہ جب تمہیں کوئی چیز اچھی لگے تو بَارَكَ اللّٰهُ کہو۔ (مشکوٰۃ)
- جس کی نظر لگے، اس کو کہا جائے کہ غسل کرے اور اس کے غسل کا پانی اس شخص کے سر اور جسم پر ڈالا جائے جس کو نظر لگی ہو۔ (مشکوٰۃ)
- مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (سورۃ کہف) پڑھنا قرآن سے ثابت ہے۔
- سورۃ الفلق اور سورۃ الناس بھی نظر کے لئے بطور دم پڑھنا چاہیئے۔ (صحیح ترمذی)

الھدیٰ انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ آف اسلامک ایجوکیشن فار ویمن

اسلام آباد: 58-نجم الدین روڈ، F-8/4 اسلام آباد، پاکستان۔ فون: 051-2261759 فیکس: 051-2264773 ویب سائٹ www.alhudapk.com

کراچی: مہرہ ہومز-7 فلور-نزد تین تلوار چوک-کلفٹن کراچی-پاکستان۔ فون: 021-5872923-5896704 فیکس: 021-5383560

حورینہ سعد

افسانہ

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا



اسامہ کی بیوی اور ہانیہ کے درمیان اکثر ٹھنی رہتی تھی۔ گھر کا ماحول بہت ٹینس تھا۔ اسامہ کی بیوی ویسے تو بڑی ٹھیک ٹھاک اور پڑھی لکھی عورت تھی لیکن اسامہ اپنی بیوی سے کھنچا کھنچا رہتا۔ آج بھی اسامہ جب گھر جلدی لوٹا تو اپنے کمرے سے پلٹ کر نکل آیا تھا۔ باہر جاتے جاتے پلٹا اور ہانیہ کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"بھابی آپ کے ہاتھ کی چائے مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔" پاس کھڑی ہوئی رومیصہ غصے سے پلٹ کر اندر چلی گئی تھی۔

"دیکھو اسامہ! تم یہی بات اتنے ہی پیار سے رومیصہ سے بھی تو کہہ سکتے تھے؟"

"پتا نہیں بھابی! نجانے کیوں مجھے تو آپ کے ہاتھ کی چائے پسند ہے اور خاص طور پر جب حمزہ بھائی ہوں تو آپ جب چائے سیٹ میں لے کر آتی ہیں تو کیا بات ہے۔ بھابی بھینی بھینی چائے سے اٹھتی خوشبو پرسکون سا ماحول بہت اچھا لگتا ہے۔ نجانے کیوں بھابی ہمارے اور رومیصہ کے درمیان ایک ٹینشن سی رہتی ہے۔ پتا نہیں کیوں رومیصہ نے عجیب سا ماحول کر دیا ہے۔ بھابی وہ آپ کی طرح نہیں رہ سکتی؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے پلٹ کر کپ رکھا تو اس کے سارے گھنے بال اس کے دائیں بازو پر آ گرے اس نے بالوں کو لپیٹتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔

"اس قسم کی باتیں مت کیا کرو اسامہ! میں جانتی ہوں کہ تم رشتے میں بھی مجھ سے چھوٹے ہو اور عمر میں بھی مجھ سے چھوٹے ہو لیکن اماں اور رومیصہ تمہارے اس رویے کو پسند نہیں کرتیں۔ خاص طور پر اماں بہت برا سمجھتی ہیں۔"

"سمجھنے دیں بھابی! سب کچھ جانتے ہوئے آپ ایسا کہہ رہی ہیں۔"

"تم کیوں نہیں سمجھتے اسامہ! وہ پرانی باتوں کو آج تک بھلا نہیں سکیں۔"

"بھابی چھوڑیں اماں پرانے خیالات کی ہیں۔" ہانیہ بھی افسردہ ہو کر بیٹھ گئی۔ پچھلی باتیں سب اسے یاد آنے لگیں۔ ساس نندوں کا سلوک اور دیگر باتیں۔

اسامہ اور ہانیہ کی شروع سے بہت بنتی تھی۔ اسامہ اپنے کالج کے قصے ہانیہ کو سناتا تھا۔ ہانیہ کو بے وقوف بنا کر اس نے اسے اپنی بائیک پر بٹھایا تھا۔ ہانیہ چیخ رہی تھی اور اسامہ ہنس ہنس کر اپنی بائیک کو اڑاتا پھر رہا تھا۔

"رکو اسامہ رکو۔" اور اسامہ کو بائیک روکنی پڑی تھی۔

"اسامہ کالج سے آنے والا ہے۔" وہ کچن میں جا کر کھانا بنانے لگی۔

اماں جل بھن کر کہتیں۔ "ہاں اسامہ کا اس کو بڑا خیال رہتا ہے۔ اس کی بہن ہے ناں تو اس کو یوں اسامہ اچھا لگتا ہے۔ چاہتی یہ ہے کہ اپنی بہن کو بھی اس گھر میں لے آئے۔" ہانیہ کو اِدھر اُدھر سے خبریں ملتی رہتی تھیں کہ اماں یوں کہہ رہی ہیں وہ اداس ہو کر حمزہ کو بتاتی تو حمزہ ہنس کر کہتا۔

"ارے یار! اماں بوڑھی ہو گئی ہیں جو دل میں آتا ہے بولتی رہتی ہیں تم کیوں برا مانتی ہو۔"

"حمزہ وہ میری بہن کو بیچ میں لے آتی ہیں ہر ایک سے کہتی ہیں کہ میں حمزہ پر نظر رکھتی ہوں۔"

حمزہ چھیڑتا۔

"سچ سچ بتا دو نظر تو نہیں رکھے ہو تم اسامہ پر۔" وہ مصنوعی غصے سے حمزہ کے کمر پر مکہ مارتی اور وہ ہنستا ہوا باہر نکل جاتا۔

"کیا ہوا بھابی! حمزہ بھائی بڑے ہنستے ہوئے کمرے سے نکل گئے ہیں۔"

"میں کہتی ہوں کہ تم کمرے سے نکل جاؤ۔" وہ

شدید غصے سے اسے جھڑک دیتی۔ اماں بڑے غور سے ہانیہ کو دیکھتیں۔ آنکھوں سے کہتیں۔ ''میں تمہارا سب ڈرامہ سمجھتی ہوں۔'' زندگی کے معاملات میں اماں اور ہانیہ ہمیشہ الجھے رہتے۔ دیکھتے دیکھتے وقت گزر گیا۔ اسامہ کی وہ دلہن بھی لے آئی اماں کے سارے وسوسے ختم تو ہو گئے مگر آنے والی رومیصہ کے کان میں اماں نے کچھ جملے پھونک دیئے کہ ہانیہ بہن کے لیے اسامہ کو پسند کرتی تھی۔ اب جونہی اسامہ کو ہنستے ہوئے رومیصہ دیکھتی وہ شک کی آگ میں جلنے لگتی۔ اسامہ آج بھی ہانیہ کو کسی نہ کسی بات پر چھیڑتا رہتا۔ اسامہ ان باتوں سے بے خبر ہانیہ کے اردگرد منڈلاتا رہتا۔

☆......☆

''دیکھو رومیصہ! ہم لوگ ایسے کیوں نہیں رہ سکتے جیسے حمزہ بھائی اور بھابی رہتے ہیں۔''

''ہاں تو اماں کہتی ہیں کہ آپ تو شروع سے ہانیہ بھابی کے دیوانے ہیں۔''

''ہاں یار بات تو سچ ہے مگر حمزہ بھائی ان کے سب سے بڑے دیوانے ہیں۔ سچ کہتی ہو تم بھابی کی مٹھی میں تو نہیں البتہ ان کی شخصیت میں جادو ضرور ہے۔ حمزہ بھائی اتنے سنجیدہ انسان ہیں کہ جب شادی ہوئی حمزہ بھائی اور ہانیہ بھابی کی تو آفس کی لڑکیاں بھائی سے پوچھتی تھیں کہ حمزہ ہنستا ہے، بولتا ہے تو بھابی کہتیں کہ ہاں ہاں کیوں نہیں اور انہیں یقین نہیں آتا تھا۔ ویسے یار ایک بات اور ہے۔ ہم لوگ ڈرتے تھے کہ حمزہ بھائی کا کیا ہوگا ان کا غصہ اتنا تیز تھا۔''

''ہاں...... بھابی نے ایسا جادو کیا ہے کہ حمزہ بھائی ان کے اردگرد منڈلاتے رہتے ہیں۔''

''بالکل سچ کہہ رہی ہو تم وہ تو غصہ کرنا ہی بھول گئے ہیں۔ گھر میں تھکے ہارے آتے ہیں لیکن اگر بھابی سامنے آجاتی ہیں تو قسم خدا کی بھائی کھل اٹھتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ میرا استقبال بھی تم ایسا ہی کرو۔''

''استقبال کرنے کے لیے ہانیہ بھابی موجود ہیں میری ضرورت نہیں۔''

''شٹ اپ آہستہ بولو۔''

''دیکھا کیسا برا لگا۔ جائیں کمرے سے چلے جائیں۔ بیٹھیں جا کر ہانیہ بھابی کے پاس۔''

''میرا خیال ہے مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔'' اسامہ غصے سے باہر آیا تھا۔ اماں نے سب باتیں سن لیں تو پلٹ کر رومیصہ کی طرف آئی تھیں۔

''دیکھو رومیصہ! ہانیہ عمر میں اسامہ سے بڑی ہے، شک وشبہات پیدا ہوتے ہیں یہاں یہ سب نہیں چلتا۔''

''تو پھر بتا دیں اماں جان یہاں کیا چلتا ہے۔''

''بڑوں کی عزت کی جاتی ہے یہاں۔ ہانیہ بننے کی کوشش کرو تم۔''

''کیا کہہ رہی ہیں اماں! میں ہانیہ بن جاؤں۔''

''ہاں میں یہی چاہوں گی کہ تم ہانیہ بن جاؤ تا کہ ہمارے گھر میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں۔ جب تھکا ہارا حمزہ آتا ہے تو ہانیہ فوراً اس کی دیکھ بھال کرتی ہے اس کا خیال کرتی ہے۔ تم اور اسامہ تو ہر وقت لڑتے ہی لڑتے ہو یہ اچھی بات نہیں ہے۔'' اماں بولی تھیں۔

''لیکن اماں! آپ ہانیہ بھابی کی طرفداری کر رہی ہیں۔''

''نہیں میں سچ بول رہی ہوں بیٹا۔ میں ہانیہ پر غلط شک کرتی تھی۔''

''آپ ہی کہتی ہیں کہ وہ جادو کرواتی ہیں۔''

''ہاں کہتی تھی لیکن اب سچ جان گئی ہوں اور تم

بھی جتنی جلدی ہو سکے جان لو۔"

ہانیہ جب واش روم سے شاور لے کر نکلی تو ٹاول میں اس نے بال لپیٹے تھا تو حمزہ ایکسکیوزمی کہہ کر ہانیہ کے روم میں آیا۔

"بھابی میں آپ کا واش روم یوز کرلوں وضو کے لیے۔"

"واؤ......" جونہی اسامہ نے واش روم کا دروازہ کھولا تو اس کے منہ سے آواز نکلی تھی۔ قریب ہی کھڑی ہوئی رومیصہ، حمزہ کو غور سے دیکھنے لگی۔

"کیا بھینی بھینی خوشبو ہے واش روم میں۔"

"کچھ بھی نہیں اسامہ!"

"نہیں بھابی کچھ تو ہے بڑی زبردست مہک آرہی آپ کے واش روم میں۔"

"ارے اسامہ! چھوڑیں۔" رومیصہ بڑی چوکنا اسے دیکھ رہی تھی۔ تبھی اماں وہاں آگئیں اور اسامہ کو دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" رومیصہ غصے سے باہر نکل گئی۔

"اماں! بڑی بھینی بھینی خوشبو آرہی ہے۔ بھابی کے واش روم سے لیکن بھابی بضد ہیں کہ انہوں نے کوئی اسپرے نہیں کیا۔" اماں نے ایک گہرا سانس لیا اور مسکرا کر ہانیہ کی طرف دیکھا اور بولیں۔

"ہانیہ! یہ شک و شبہات تم دور کردو۔ میں تو سب جان چکی ہوں۔" ہانیہ بری طرح چونک گئی۔

"کیا جان گئی ہیں اماں جان آپ۔" وہ حیران ہو کر بولی۔ تب تک اسامہ وضو کر کے واش روم سے باہر نکل چکا تھا۔ پیچھے پیچھے اماں بھی نکل گئیں۔

"اب کیا ہو گیا؟" اسامہ جب اپنے کمرے میں گھسا تو بولا۔ رومیصہ منہ بنائے بیٹھی تھی۔

"جب بھی گھر آؤ میں تمہاری شکل سوگوار سی یا کسی غم میں ہوتی ہو۔ میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔" اسامہ بلند آواز میں چیخا تو ہانیہ جلدی سے بالوں کو ٹاول سے پونچھتی ہوئی اسامہ کے روم میں آئی اور اماں بھی آگئیں۔

"کیا ہوا رومیصہ! اسامہ کیوں چلا رہا ہے۔"

تو رومیصہ بولی۔ "انہیں تو بھابی کے واش روم میں سے بھی خوشبو آتی ہے۔" ہانیہ اندر آچکی تھی تو رومیصہ نے چونک کر ہانیہ کو دیکھا۔

"دیکھا یہ ہے وہ جادو جو ہانیہ کے پاس ہے۔" اماں بولیں۔ رومیصہ نے پھر ایک بار دیکھا پھر کمرے کے ماحول کو دیکھ کر حیرانگی سے سوچنے لگی۔

"ہانیہ ہمیشہ لائف بوائے شیمپو استعمال کرتی ہے۔ جس سے ماحول میں ایک تازگی سی محسوس ہوتی ہے اور حمزہ بھی خوش رہتا ہے۔" اماں جان ہنس کر بولیں۔

"ارے نہیں! اماں جان ہاتھ کنگن کو آرسی کیا رومیصہ خود استعمال کر کے دیکھ لے۔" اسامہ کا غصہ رفو چکر ہو جائے گا۔"

رومیصہ کو اماں کی بات جچ گئی۔ اسامہ غصے ہو کر گھر سے چلا گیا تھا۔

رومیصہ نے ہانیہ سے لائف بوائے شیمپو لیا اور پھر شاور لے کر جب وہ نکلی تو نہ صرف اس کے وجود سے بلکہ ماحول میں بھی بھینی بھینی خوشبو تھی۔ اسٹیپ میں کٹے بالوں میں جب وہ آہستہ آہستہ برش کر رہی تھی نہ صرف طمانیت بلکہ ایک بھینی سی مہک کے ساتھ اسے بہت چینج محسوس ہو رہا تھا اور جونہی اسامہ کمرے کے اندر داخل ہوا اسے بہت بڑی تبدیلی کا احساس ہوا اور اس نے ارد گرد نظر ڈالی ویسا تو کچھ نہیں تھا مگر کچھ تو تھا کہ اسامہ مسکرانے پر مجبور ہو گیا اور رومیصہ ہنسنے لگی تو اسامہ اس کے قریب آگیا۔

......☆......

عائشہ خان

افسانہ

انٹی سی بات

محلے میں غلغلہ سا اٹھا کہ امداد بھائی کی شادی ہو گئی اور تمام لڑکوں کی (پلاٹون) پلٹن دلہن دیکھنے چلی۔

اندھیرے گھپ کمرے میں دلہن کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی، پتا چلا کہ دلہن کی رنگت اچھی خاصی پکی تھی، لہٰذا



دیکھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

......☆......

زیتون خالہ جب امداد بھائی سے شادی ہو کر آئیں، تو ساس، سسر اور نند پر مشتمل سسرال ملا۔ سسر تو چند ماہ بعد ہی انتقال کر گئے، رہ گئیں ساس اور نند تو ان سے نبٹنا کیا مشکل تھا، وہ اپنے نام کی ایک تھیں، ہر بات کے بعد بحث اور بحث کے بعد وہ وہ لڑائی ہوتی کہ الاماں والحفیظ۔

سارا قصور غربت کا تھا، پائی پائی کو ترسی ہوئی زیتون خالہ جو اپنے ماں باپ کے گھر سے بھی غربت وافلاس کے دن گزار کے آئی تھیں، یہاں بھی تنگی اور مسائل دیکھ کر چڑچڑا جاتیں۔ ہر جنگ کے بعد ساس نند تھک کے دوسرے کمرے میں جا بیٹھتیں، اگر زیتون خالہ کا دل ابھی بھی نہیں بھرا اور لڑنے کا موڈ مزید ہے تو ستار بھائی (پڑوسی) کی بیوی زندہ باد۔ وہ وہ باتیں ہوتیں وہ وہ الزام لگتے کہ لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے پورا محلہ جمع ہو جاتا اور اگر ستار بھائی کی بیوی بھی تھک جاتیں تو کونے والی منی خالہ۔



ایک بار تو منی خالہ سے ایسی لڑائی ہوئی۔
فائر بریگیڈ کی سرکاری کالونی کوارٹر، کسی غریب بستی کا سا سماں پیش کرتے تھے۔
ایسی لڑائی ہوئی کہ منی خالہ کے بال زیتون خالہ کے ہاتھ میں اور زیتون خالہ کے بال منی خالہ کے ہاتھ میں اور دونوں کسی معروف و مشہور ریسلر کی طرح داؤ پیچ کر رہی تھیں۔ شکر ہے دفتر قریب ہی تھا دونوں کے شوہر تک جھگڑے کی اطلاع بہم پہنچی تو دوڑے چلے آئے اور اپنی اپنی زوجہ کو چھڑوایا، شکر ورنہ تو آج بغیر نائی کے ٹائیں ٹائیں فش ہو جاتی تھی۔

☆......

خیر اب تو ان کے بچے بڑے ہو رہے تھے۔ نند بھی شادی ہو کر دوسرے شہر بس گئی تھیں۔ رہ گئیں ساس وہ ان کو امداد بھائی نے باہر راہ داری میں چھپر اڈال کر ایک چھوٹا سا کمرہ بنا کر ان کی رہائش گاہ بنادی تھی۔ سو وہ اپنی زندگی کے آخری دن کاٹ رہی تھیں۔
اب تو معرکے بھی ماضی کے قصہ ہوئے۔
ان کے بچے راحیلہ جاوید اور ارشد بھی بڑے ہو گئے تھے۔ جاوید اور ارشد کے نوکری کرنے سے حالات بہتر ہونے میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ سنا تھا کہ راحیلہ بھی میٹرک کے بعد کسی پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر لگ گئیں تھیں۔ بچوں کے مستقبل تباہ کرنے کے لئے۔
تیرہ سو ماہوار تنخواہ تھی جس میں سے دس روپے کی روزانہ بریک میں بریانی کھالیتی تھی۔ یہ بات ہمیں خالہ زیتون نے بڑے فخر سے بتائی تھی جس پر ہم اپنا قہقہہ روکتے کمرے سے باہر بھاگے۔

☆......

گھر کے حالات تبدیل ہو رہے تھے، اب گھر میں تھوڑی خوش حالی نظر آنے لگی تھی۔
زیتون خالہ جنہیں ہم نے کبھی اچھی کوالٹی کا کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا، اب سال میں دو سوٹ لان کے بنانے لگیں تھیں۔

☆......

ایک بار ہم اور ہماری پڑوسن سلمٰی بیٹھے تھے کہ زیتون خالہ آگئیں۔ وہ کالے رنگ کا برقعہ اوڑھا کرتی تھیں رنگت تو ان کی پہلے ہی۔
اب تو اور بھی حالات کی ستم ظریفی ان کے چہرے سے عیاں ہوتی تھی۔
خیر خالہ بڑی خوش دکھائی دے رہی تھیں، اور وجہ ہمیں صاف دکھائی دے رہی تھی، ان کے گلے تک بند برقع کے اوپر سے نکالی گئی سونے کی چین، جو ہمیں دکھانے کے لئے نکالی گئی تھی، تاکہ ہم دیکھ کر پوچھیں۔
اور ہم پوچھنے ہی والے تھے مگر سلمٰی نے ہمیں ٹہوکا دے کر روک دیا۔
کہ مت پوچھو سو ہم چپ ہو گئے، چائے پینے کے بعد زیتون خالہ جانے لگیں، ان کا چہرہ ایک دم بجھ سا گیا۔
وہ جانے کو کھڑی ہوئی تھیں کہ میں نے چونک کے پوچھا۔
''ارے واہ خالہ! سونے کی چین لی ہے کیا''
ہم نے (ایکسٹرا آرڈنری) اشتیاق دکھایا۔
زیتون خالہ جو بجھی ہوئیں تھیں ایک دم کھل اٹھیں۔
''ہاں ناں...... اپنے ارشد کی تنخواہ میں سے بی سی ڈالی تھی، وہ کھلی تو تمہارے خالو نے کہا پوری زندگی کچھ نہیں دلوا سکا، اب پیسے آئے ہیں تو سونے کی چین بنوالو۔ پھر ارشد کی بھی یہی مرضی تھی۔''
اور میں سوچ رہی تھی کہ ایک عورت جس نے کبھی کوئی خوشی نہیں دیکھی اسے اگر اتنی سی بات سے سچی خوشی مل جائے تو کیا برا ہے۔
میرے دل میں ایک اطمینان سا اتر گیا۔ اور میں خالہ سے تفصیل پوچھنے لگی۔

☆☆☆



فضائل قرآن



رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

★ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن شریف کو سیکھے اور سکھائے۔

★ حق سبحانہ وتقدس کا یہ فرمان ہے کہ جس شخص کو قرآن شریف کی مشغولی کی وجہ سے ذکر کرنے اور دعائیں مانگنے کی فرصت نہیں ملتی، میں اس کو سب دعائیں مانگنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ شانہ کے کلام کو سب کاموں پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی کہ خود حق تعالیٰ شانہ کو تمام مخلوق پر۔

★ حسد دو شخص کے سوا کسی پر جائز نہیں۔ ایک وہ جس کو حق تعالیٰ شانہ نے قرآن شریف کی تلاوت عطا فرمائی اور دن رات اس میں مشغول رہتا ہے دوسرے وہ جس کو حق سبحانہ نے مال کی کثرت عطا فرمائی اور وہ دن رات اس کو خرچ کرتا ہے۔

★ حق تعالیٰ شانہ اس کتاب یعنی قرآن پاک کی وجہ سے کتنے ہی لوگوں کو بلند مرتبہ عطا کرتا ہے اور کتنے ہی لوگوں کو پست و ذلیل کرتا ہے۔

★ قیامت کے دن صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور بہشت کے درجوں پر چڑھتا جا۔ اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتا تھا۔ بس تیرا مرتبہ وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔

★ جو شخص ایک حرف کتاب اللہ کا پڑھے اس کے لئے اس حرف کے عوض ایک نیکی اور ایک نیکی کا اجر دس نیکی کے برابر ملتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سارا (الم) ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف، میم ایک حرف ہے۔

★ جو شخص قرآن پڑھے اور اس پر عمل کرے اسکے والدین کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا جسکی روشنی آفتاب کی روشنی سے بھی زیادہ ہوگی اگر وہ آفتاب تمہارے گھر میں ہو۔ پس کیا گمان ہے تمہارا اس شخص کے متعلق جو خود عامل ہے۔

★ جس شخص نے قرآن پڑھا پھر اس کو حفظ یاد کیا اور اس کے حلال کو حلال جانا اور حرام کو حرام حق تعالیٰ شانہ اس کو جنت میں داخل فرما دیں گے اور اس کے گھرانے میں سے ایسے دس آدمیوں کے بارے میں اس کی شفاعت قبول فرما دیں گے جس کے لئے جہنم واجب ہو چکی ہو۔

★ جس شخص کے قلب میں قرآن شریف کا کوئی حصہ بھی محفوظ نہیں وہ بمنزل ویران گھر کے ہے۔

★ دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جیسا کہ لوہے کو پانی لگنے سے زنگ لگتا ہے پوچھا گیا کہ حضور ﷺ ان کی صفائی کی کیا صورت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ موت کو اکثر یاد کرنا اور قرآن پاک کی تلاوت کرنا۔

★ تم لوگ اللہ جل شانہ کی طرف رجوع اور اس کے یہاں تقرب اس چیز سے بڑھ کر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتے جو خود حق سبحانہ سے نکلی ہے یعنی کلام پاک۔

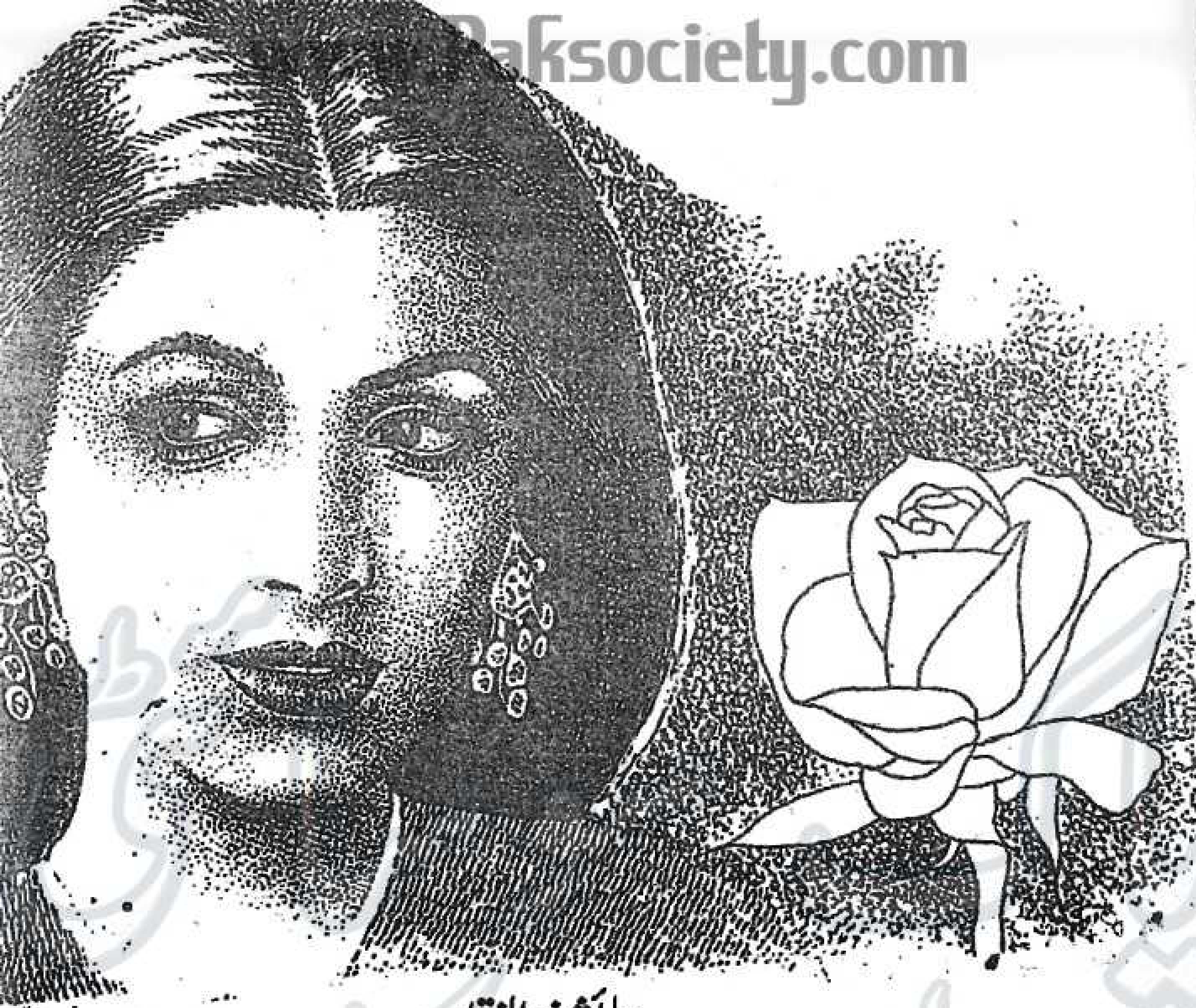
★ جو شخص ایک آیت کلام اللہ کی سنے اس کیلئے دو چند نیکی لکھی جاتی ہے اور جو تلاوت کرے اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگا۔

★ کلام اللہ کو آواز سے پڑھنے والا علانیہ صدقہ کرنے والے کے مشابہ ہے اور آہستہ پڑھنے والا خفیہ صدقہ کرنے والے کی مانند ہے۔

★ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک کلام پاک سے بڑھ کر کوئی سفارش کرنے والا نہ ہوگا نہ کوئی نبیؐ نہ فرشتہ وغیرہ۔

★ اگر تو صبح کو جا کر ایک آیت کلام اللہ شریف کی سیکھ لے تو نوافل کی سو 100 رکعات سے افضل ہے اور اگر ایک باب علم کا سیکھ لے خواہ اس وقت وہ معمول بہ ہو یا نہ ہو تو ہزار رکعات نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔

★ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو اطلاع دی کہ بہت سے فتنے ظاہر ہوں گے۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ ان سے خلاصی کی کیا صورت ہے انہوں نے کہا کہ قرآن شریف۔



عائشہ ذوالفقار

سلسلے وار ناول

اُڑ جا اب تیری باری ہے

اپنی پوری زندگی آنکھ بند کر کے ان کی ہر بات پر اعتبار کیا میں نے ان کی ہر بات کے آگے اپنی بات ختم کر دیا کرتی تھی میں جو انہوں نے کہا ہمیشہ وہی کیا، کبھی ناں نہیں کی۔ بی ایس سی کے دوران صبح سات بجے سے لے کر شام پانچ بجے تک میں ان کی نظروں سے اوجھل 35 کلومیٹر دور رہا کرتی تھی۔ وہ کون سا دیکھتے تھے مجھے۔ انہیں کون سا کچھ پتا چلنا تھا مگر میں نے ایک بار بھی ان کا اعتبار چکنا چور کرنے کا نہ سوچا کبھی ان کے مان کو ٹھیس نہ پہنچائی۔ دو سال ان سے دور یونیورسٹی میں گزارے۔ میں اپنی جگہ سے ایک انچ بھی اِدھر سے اُدھر نہ ہلی۔ ابو جی کا مان اور بھروسہ ہمیشہ بلند ہی رکھا، میری وجہ سے انہیں کبھی کوئی غلط بات سننے کو نہ ملی۔ کبھی میری وجہ سے کوئی پشیمانی نہ ہوئی۔ کبھی کوئی شکایت نہیں ملی۔ جب بھی انہوں نے میرا ذکر سنا، جس سے بھی سنا ہمیشہ اچھے لفظوں میں سنا۔ وہ خود کہتے تھے کہ حاری نے تو میرا سر اونچا کر دیا، اب عارش کی باری ہے۔ تو کیا اس سب کے بعد اس قدر



عزت دینے کے بعد اس قدر اعتبار کرنے کے بعد، اس قدر محبت کرنے کے بعد یہ صلہ بنتا تھا میرا کہ انہوں نے ایک بار بھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ "حاری یہ سب کیوں کیا؟ ایک بار بھی میری بات نہ سنی، ایک لمحے کے لیے بھی مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ حمزہ تو پرایا تھا غیر تھا، اس سے تو ابھی کوئی رشتہ بھی نہیں بنا تھا میرا سو اس سے کوئی گلہ بھی نہیں تھا مگر میرے ابوجی...... میری اماں...... عارش...... یہ تو میرے اپنے تھے۔ میرے سائبان تھے۔ میری عمر بھر کا سرمایہ تھے۔ ایک بار مجھ پر اعتبار تو کرتے۔ ایک بار تو پوچھتے کہ "حاری یہ سب کیوں کیا؟" پر نہیں پوچھا۔ کچھ نہیں پوچھا۔ کچھ نہیں سنا صرف اپنی ہی سناتے چلے گئے۔ زندگی میں پہلی بار مجھ پر ہاتھ اٹھایا اور لہولہان کر دیا۔ نیل و نیل کر دیا۔ میری اپنی اماں میرا گلا دبانے کے درپے ہو گئیں۔ کیوں ہوتا ہے ایسے۔ مجھے وہیں دیوار کے ساتھ گرے ہوئے نہ جانے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ خون رس رس کے آخر خود ہی جمنے لگا تھا۔ پورے بدن میں اکڑاؤ ہو رہا تھا۔ ابوجی نے آنے والے مہمانوں سے یہ ہی کہا کہ میں ان کی بیٹی تھی ہی نہیں۔ کہیں کسی سڑک کے کنارے سے اٹھایا تھا انہوں نے مجھے نہ جانے کس کا خون تھی میں جس نے اوقات دکھا دی تھی۔ عمیر کو کیا فرق پڑا۔ ذرہ بھر بھی نہیں مگر میں لمحوں میں تباہ ہو گئی تھی۔ نہ جانے رات کے کس پہر عارش نے آ کر مجھے ہلایا تھا۔

"حاری اُٹھ! سر عمیر آئے ہیں۔" میں بمشکل دیوار کا سہارا لے کر اٹھی۔

قسط نمبر 4

''اب یہ کیوں آیا ہے؟'' یہ ہی سوچتے ہوئے میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ عمیر میراحشر دیکھ کر ہولے سے مسکرایا تھا۔ میں بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''انکل جی! آپ جانتے ہیں کہ کوئی اور ہوتا تو کسی صورت یہاں نہیں آتا لیکن آپ کی عزت یوں نیلام ہونے سے مجھے کوئی خاص فائدہ نہیں ہونے والا، میرے معافی مانگنے سے بھی کچھ نہیں ہوگا، کیونکہ میں نے اسے نہیں بلایا تھا، یہ خود چل کر آئی تھی۔'' میں نے تڑپ کے ایکدم عمیر کی بات کاٹی۔

''خدا کا خوف کرو تم نے مجھے عارش کا نام لے کر بلیک میل کر کے زبردستی......'' میری بات ابھی مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ ابوجی کا زناٹے دار تھپڑ میرے گال پر پڑا۔ میں ایک دم جھٹکا کھا کے عمیر کے پاس زمین پر گر گئی۔

''اب بکواس کی تو زندہ زمین میں گاڑھ دوں گا۔'' ابوجی سرد لہجے میں بولے تھے۔

''بیٹے عزت تو نیلام ہوگئی ہے میری، اس نا ہنجار کے لیے کچھ کر سکتے ہو تو مہربانی ہوگی۔'' میرے ماتھے سے پھر خون رسنے لگا تھا۔

''میں اس سے نکاح کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن ایک چھوٹی سی شرط پر۔'' عمیر بولا۔

''بیٹے میں تمہاری کسی بات کے جواب میں ''کیوں'' کہنے کا بھی حق نہیں رکھتا ہوں تو ناں، تو بہت دور کی بات ہے بولو۔'' ابو بھی ہولے سے بولے تھے۔ عمیر نے جوتے سے اپنا پاؤں نکالا اور ٹانگ سیدھی کر کے میز پر رکھی۔

''یہ لو ویڈیو بناؤ ذرا۔'' اپنا موبائل عارش کی طرف اچھالتے ہوئے بولا۔

میں نے بے یقین نظروں سے عمیر کی طرف دیکھا۔

''بس اتنی سی شرط ہے میری۔'' وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

''حاری پکڑ اس کے پاؤں۔'' ابوجی نے تیز آواز میں کہا۔

''اتنا سب کچھ کر کے تمہیں سکون نہیں ملا۔'' میرے آنسو بہنا شروع ہو گئے تھے۔

''حاری! چپ چاپ اس کے پاؤں پکڑ لے۔'' عارش ویڈیو بنانا شروع ہو گیا تھا۔

''ایک دو لمحوں کا درد نہیں ہے حائقہ ارشد جو اتنی آسانی سے سکون مل جائے گا مجھے۔ کئی مہینوں کی اذیت ہے جاتے جاتے ہی جائے گی۔'' اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر کہا تھا۔

''حاری!'' ابوجی کی شاید بس ہو گئی تھی۔ مجھے بالوں سے پکڑا۔ اس نے اپنا پاؤں میرے لبوں سے لگایا۔ عمیر ہولے سے مسکرایا۔

''بلائیں مولوی صاحب کو۔'' کہتے ہوئے اس نے میز پر سے پاؤں ہٹایا۔ دس منٹ کے اندر اندر میرا اس سے نکاح ہو گیا۔ نہ جانے کس نے میرے سر پر چادر ڈالی تھی۔

''حاری! اب بے شک مر جائیں مگر دوبارہ میرے گھر مت آئیں۔'' ابوجی نے بازو سے گھسیٹ کے مجھے گھر سے باہر نکالا۔

''آج کے بعد بھول جائیں کہ تیرے ماں باپ بھی تھے، نہ تیرا کوئی تھا اور نہ ہے۔'' یہ آخری بات تھی جو ابوجی نے مجھ سے کہی تھی۔ اس کے بعد دروازہ بند ہو گیا۔ ہمیشہ کے لیے۔

☆......☆

وہ ابھی نہا کے واش روم سے نکلا ہی تھا کہ موبائل کی بپ ہوئی۔ کوئی MMS آیا تھا، تولیے سے بال خشک کرتے ہوئے اس نے Play کا بٹن پریس کیا تھا اور......

"آئی لو یو، آئی لو یو سو مچ۔" وہ بھیگی ہوئی آواز حائقہ کی ہی تھی۔ تولیہ ایک دم اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ بے یقینی کی آخری حدوں کو چھوتا وہ ایکدم بستر پر گرا تھا۔ ویڈیو بند ہوگئی اس سے پہلے کہ اسے کچھ سمجھ آتی عمیر کی کال آگئی۔ غائب دماغی سے اس نے کال اٹینڈ کی تھی۔

"کیسی لگی وڈیو......؟" عمیر کی مسکراتی آواز اس کے وجود میں ہلچل مچا گئی۔

"عمیر! یہ سب کیا ہے؟" اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔

"واقعی تمہیں نہیں پتا، حارث یہ وہی چار سال پہلے والا سین ہے۔ بس کردار بدل گئے ہیں۔" عمیر بولا تھا۔

"گھٹیا پن کی بھی انتہا ہوتی ہے عمیر راؤ! آج رات نکاح ہے اس کا، وہ بھی اس شخص سے جو مجھ سے زیادہ تمہارا دوست ہے۔" حارث کی آواز میں دکھ بول رہا تھا۔

"نکاح ہے نہیں، نکاح تھا، میں نے یہ ویڈیو حمزہ کو بھی Send کی ہے۔" حارث کو جیسے ایک دم دھچکا لگا۔ وہ بول نہ سکا۔

"اور وہ یقیناً مجھے نہیں حائقہ کو ہی غلط سمجھے گا کیونکہ رو بھی وہی رہی ہے۔ بول بھی وہی رہی ہے اور چل کر بھی وہی میرے پاس آئی ہے۔" عمیر ہنس رہا تھا۔

"تم سے غلطی ہوگئی حارث! تمہیں حمزہ کے حق میں دستبردار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اب ذرا دیکھنا تم، کیسے تمہارے سامنے اسے حمزہ سے کھینچتا ہوں۔" عمیر ہنستے ہوئے کال ڈس کنیکٹ کر گیا۔ حارث کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد وہ بھاگتا ہوا نیچے آیا بائیک نکالی اور طوفانی رفتار سے بائیک اڑاتا حمزہ کے گھر آیا۔

"حمزہ کہاں ہے؟" اس نے حمزہ کے چھوٹے بھائی سے پوچھا تھا۔

"حمزہ بھائی! ابھی تو یہیں تھے پتا نہیں کہاں گئے۔" وہ کہتا ہوا ادھر اُدھر ہوگیا۔ حارث کا ذہن بند سا ہوتا جا رہا تھا۔

"نہ جانے کہاں گیا ہوگا؟" کہتے ہوئے اس نے حمزہ کا نمبر ملایا۔ نمبر بند تھا۔ بار بار اس کا نمبر ملاتا وہ باہر کی طرف آیا۔ تبھی اس نے حمزہ کو آتے دیکھا اس کا ستا ہوا چہرہ حارث کو سب کچھ سمجھا گیا۔

"کہاں گئے تھے تم؟" حارث تیزی سے اس کی طرف آیا تھا۔

"کہیں نہیں۔" کہتا ہوا وہ اندر آیا۔

"کب تک جانا ہے بارات لے کر۔" اس نے پھر پوچھا۔

"حارث! مجھے کہیں نہیں جانا بارات لے کر، ختم ہو گیا سب کچھ کہیں نہیں جا رہے ہم۔" اونچی آواز میں کہتا وہ دوبارہ اندر کی طرف بڑھا۔

"حمزہ میں نے وہ ویڈیو دیکھی ہے۔" حارث کی آواز نے ایک دم اس کے قدم روکے۔ حیران نظروں کے ساتھ وہ ایکدم پلٹا۔

"اتنا ہی اسے تیرا خیال تھا تو حائقہ کی اصلیت صرف تجھے بتاتا ناں مجھے وہ ویڈیو بھیجنے کا کیا تک تھا۔" حارث بولتے ہوئے آگے کو آیا۔

"حمزہ! وہ صرف تجھے بدظن کرنا چاہتا ہے اور کچھ نہیں۔" حارث نے اسے سمجھانا چاہا۔

"حارث میں پاگل نہیں ہوں۔ بچہ نہیں ہوں میں حائقہ سے مل کر آرہا ہوں، اس نے خود مجھ سے کہا ہے کہ وہ

عمیر کے پاس گئی تھی آج اور اس نے عمیر سے خود یہ سب کہا ہے۔" حمزہ اونچی آواز میں بولا۔ حارث چپ رہ گیا۔

"حارث فرشتہ تو ہوں نہیں میں کہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے باوجود ماننے سے انکار کردوں۔ اسے پتا تھا کہ آج میرا اور اس کا نکاح ہے پھر کیوں گئی اس کے پاس؟ چلو مان لیتا ہوں کہ اس نے بلایا تو کیا منع نہیں کرسکتی تھی۔ انکار نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے بلانے پر بھی کیوں گئی۔ اتنی کیا قیامت آرہی تھی اس کی بات ماننے کی۔ حارث عمیر نہیں بول رہا۔ وہ بول رہی ہے۔ روتے ہوئے اظہار محبت کررہی ہے اس کے گلے لگ کے کہہ رہی ہے کہ اس کے بغیر مرجائے گی۔ اتنا کیسے مجبور ہوگئی وہ ایکدم اس کے سر پر کسی نے پستول رکھا ہوا تھا کہ نہیں کہے گی تو مرجائے گی۔" حمزہ کی آواز بھرا رہی تھی۔

"اور حارث...... اس تو بہتر وہ مرجاتی مگر یہ سب نہ کہتی۔ اتنا ہی پیار کرتی تھی اس سے تو اسی سے شادی کرلیتی۔ میرے لیے ہاں کیوں کی۔ میں نے کوئی مجبور تو نہیں کیا تھا کہ منع کرتی تو کنویں میں پھینک دیتا۔" حمزہ کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔

"حمزہ! ایک لمحے کے لیے مان لیتے ہیں کہ اسے عمیر نے نہیں بلایا۔ وہ خود گئی اس کے پاس، پر عمیر بھی بچہ تو نہیں تھا۔ انجان تو نہیں تھا تیرا دوست تھا اسے سب پتا تھا تیرے اور حائقہ کے بارے میں۔ جانتا تھا وہ کہ آج رات تیرا اور اس کا نکاح ہے۔ پھر کیوں نہیں روکا اس نے حائقہ کو، کیوں آگے آنے دیا اسے۔ کیوں نہیں کہا کہ دروازے سے ہی واپس چلی جاؤ۔ یہ سب غلط ہے۔ کیوں نہیں کہا کہ تم میرے دوست کی امانت ہو اور میں خیانت نہیں کرسکتا۔" حارث کی آواز بھی اونچی ہوگئی۔

"حمزہ تو کچھ نہیں جانتا وہ یہ سب صرف مجھے اذیت دینے کے لیے کررہا ہے۔ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں حائقہ اور اس کی فیملی کو وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔" حمزہ نے ایکدم اس کی بات کاٹی۔

"حارث پلیز یار! تیری ساری باتیں ٹھیک ہوں گی مگر اس نے اپنی ماں اور باپ دونوں کے سامنے اقرار کیا ہے کہ وہ آج خود عمیر کے پاس گئی تھی اور اس نے یہ سب خود عمیر سے کہا ہے اور حد تو یہ ہے کہ اس سارے واقعے سے اس کے والدین بھی انجان ہیں۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اماں کو کیسے بتاؤں۔" حمزہ کہتا ہوا اندر بڑھ گیا۔ حارث چپ کھڑا رہ گیا۔ عمیر کا داؤ چل چکا تھا۔ واقعی...... کسی نے یہ تھوڑی سوچنا تھا کہ حائقہ نے یہ سب کیوں کیا۔ آج اگر وہ حارث جاوید نہ ہوتا تو خود بھی یقیناً حائقہ کو ہی غلط سمجھتا۔ لیکن آج اگر کوئی حائقہ کے حق میں تھا۔ تو وہ حارث جاوید ہی تھا کیونکہ وہ عمیر کی رگ رگ سے واقف تھا۔ صرف وہ جانتا تھا کہ عمیر یہ سب کیوں کررہا ہے۔ صرف وہ تھا جو اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنے اور کانوں سے سب کچھ سن لینے کے باوجود حائقہ کو غلط نہیں کہہ رہا تھا کیوں؟ کیونکہ وہ حائقہ سے بہت محبت کرتا تھا یا پھر...... عمیر سے بہت نفرت کرتا تھا۔ حمزہ نے شاید اندر بارات لے جانے سے منع کردیا تھا تبھی ایک دم سناٹا ہوگیا۔ حارث ہولے سے چلتا ہوا باہر آگیا۔

"عمیر! صرف مجھے جھکانے کے لیے یہ سب کررہا ہے۔" اس نے سوچا تھا۔

"صرف مجھ سے بدلہ لینے کے لیے وہ حائقہ کو اذیت دے رہا ہے۔ تکلیف دے رہا ہے۔" وہ چلتے چلتے ایک دم رکا۔

"کیا فائدہ میری اس محبت کا جو حائقہ کو خوشی نہ دے سکے جو اس کی آنکھوں میں آنسو لانے کا سبب بنے۔ جو اسے رسوا کردے۔" اس نے ایکدم فیصلہ کیا۔

"اپنی چاہت کو یوں رسوا نہیں ہونے دوں گا میں چاہے مجھے عمیر کے آگے ہاتھ ہی کیوں نہ جوڑنے پڑیں۔"

سوچتے ہوئے اس نے بائیک نکالی اور رخ عمیر کے گھر کی طرف موڑ دیا عمیر کو ذرہ بھر بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ آئے گا۔ تبھی اسے اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"کیوں کر رہے ہو یہ سب؟" حارث نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔

"کیونکہ آج مجھے یہ سب کرنے کا موقع ملا ہے۔ میری جگہ تم ہوتے تم بھی یہ ہی کرتے بلکہ کرتے کیا چار سال پہلے تم نے بھی تو یہ ہی کیا تھا۔ موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ میری محبت میری آنکھوں کے سامنے سے چھین لی تھی تم نے ایسے ہی رسوا کیا تھا تب تم مجھے۔" حارث کی بس ہو گئی۔

"فار گاڈ سیک عمیر! بس کر دو چار سال سے تم اس محبت کا ماتم کر رہے ہو جو تمہیں تھی ہی نہیں۔" عمیر نے ایک دم اس کی بات کاٹی۔

"تمہیں کیسے پتا کہ مجھے علیزہ سے محبت نہیں تھی۔ تم نے میرے دل میں جھانک کر دیکھا تھا کیا؟" عمیر کا کرب اس کی آنکھوں سے چھلکا تھا۔ حارث اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہے، میں مانتا ہوں غلطی ہو گئی مجھ سے، مجھے تمہارے اور علیزہ کے بیچ نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے جو کیا غلط کیا مگر پلیز اب تم وہ غلطی دوبارہ مت دہراؤ، عمیر یہ یونیورسٹی نہیں ہے کہ تم حائقہ کے قریب آؤ گے۔ میں تم سے لڑوں گا اور کھیل ختم ہو جائے گا۔ پانچ زندگیوں کا سوال ہے یار پلیز۔" حارث نے حتی الامکان اپنے لہجے کو نرم رکھنے کی کوشش کی تھی۔

"بہت عرصے بعد مجھے ایسا موقع نصیب ہوا ہے حارث جانی! اتنی جلدی نہیں گنواؤں گا۔" عمیر ہنسا تھا۔

"عمیر! میں تم سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ تمہارے آگے ہاتھ جوڑنے کو تیار ہوں لیکن پلیز میری وجہ سے اس معصوم لڑکی کو دکھ مت دو، اسے یوں رسوا نہ کرو پلیز۔" حارث دو قدم آگے آیا تھا۔ عمیر ہولے سے مسکرایا۔

"میں نے کہا تھا ناں کہ تمہیں تمہاری اوقات کے اندر میں ہی لے کر آؤں گا۔" وہ کہتے ہوئے رکا۔

"جوڑو ہاتھ۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا حارث نے چند لمحے اسے دیکھنے کے بعد دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیئے۔ عمیر قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"کتنا مجبور کر دیتی ہے ناں محبت......" وہ حارث کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"پلیز حمزہ کو فون کر کے سب بتا دو پلیز۔" حارث ہولے سے اپنے دونوں ہاتھ کھولتے ہوئے بولا۔

"پتا ہے حارث! پرابلم کیا ہے۔ پرابلم یہ ہے وہ مجھے تم سے زیادہ بری لگنے لگی ہے۔ تم سے زیادہ اذیت دینا شروع ہو گئی تھی وہ مجھے۔ میرے رستے کی رکاوٹ بننے لگی تھی وہ اور رکاوٹیں دور کیے بغیر میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ پاتا۔ سو اسے تو میں اپنے رستے سے ہٹا کے ہی دم لوں گا۔" عمیر اٹل لہجے میں بولا تھا۔

"تمہیں اس کے میری اکیڈمی میں پڑھانے سے پرابلم ہے ناں تو میں منع کر دوں گا اسے آج کے بعد سے نہیں آئے گی وہ میری اکیڈمی میں۔ وعدہ کرتا ہوں تم سے۔" حارث کوششوں پر کوششیں کر رہا تھا۔

"اچھا تو پھر یہ بھی وعدہ کرو کہ وہ اور کسی اکیڈمی میں نہیں جائے گی۔ یہ بھی وعدہ کرو کہ میرا کوئی اسٹوڈنٹ رائل چھوڑ کے اس کی طرف نہیں جائے گا۔ یہ بھی وعدہ کرو کہ میں اپنے کسی اسٹوڈنٹ کے منہ سے اس کا نام نہیں سنوں گا۔ یہ بھی وعدہ کرو کہ وہ کہیں گم ہو جائے گی۔ دوبارہ کبھی میں اس کا نام نہیں سنوں گا۔" حارث اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''ابھی تو کھیل شروع کیا ہے میں نے حارث جاوید اتنی جلدی ختم تھوڑی کروں گا۔ آج تو صرف ہاتھ جوڑے ہیں ناں تم نے۔ کل قدموں میں گر کے روؤ گے بھی اور رہ گئی حائقہ ارشد...... اس کا تو نام ونشان مٹادوں گا میں۔ وعدہ کرتا ہوں تم سے کہ چند دنوں میں لوگ اس کا نام تک بھول جائیں گے۔'' عمیر کے لفظوں سے صرف نفرت ٹپک رہی تھی۔

''کاش اتنا اونچا اڑنے کے بعد تم جہاں گرو وہاں میں کھڑا ہوں عمیر راؤ۔'' حارث ہولے سے بولا تھا۔

''اچھا تب تم کیا کرو گے؟'' عمیر نے ہنستے ہوئے پوچھا تھا۔

''یہ تب ہی بتاؤں گا جب گرو گے۔'' حارث کہتے ہوئے باہر آیا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو عمیر کے پاؤں بھی پکڑ لیتا۔ رو کر اس سے معافی بھی مانگ لیتا مگر حائقہ کو اتنی رسوائی سے ضرور بچا لیتا لیکن عمیر کو آج اس کی معافیوں اور آنسوؤں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے صرف حائقہ کو برباد کرنا تھا اور وہ شاید کر چکا تھا۔ وہ ابھی عمیر کے گھر سے نکلا ہی تھا کہ سلمان کی کال آگئی۔

''حارث! کہاں ہے تو......؟'' سلمان پریشانی سے بولا تھا۔

''کیوں کیا ہوا ہے؟'' اس نے ایک دم پوچھا۔

''میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہال گیا تھا لیکن وہاں تو کچھ اور ہی ہو گیا یار، حائقہ کے والد نے سب کو کہہ دیا ہے کہ بارات نہیں آئے گی۔'' حارث نے اس کی بات کاٹی۔

''سلمان! تو مجھے اس اکیڈمی میں آ کے مل یار سب بتاتا ہوں تجھے۔'' حارث نے اسے کہہ کے بائیک کا رخ اکیڈمی کی طرف کیا ماجرا کیا ہے یار؟'' اس نے آتے ہی پوچھا تھا۔ حارث نے اسے مختصراً سب کہہ سنایا۔

''واٹ! تو عمیر کے آگے ہاتھ جوڑ کے آیا ہے۔'' ساری گفتگو میں سلمان کو یہ ہی ایک بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

''ہاں مگر کاش میرے ہاتھ جوڑنے کا کوئی فائدہ ہوتا۔'' حارث بے بسی سے بولا تھا۔

''اب کیا ہوگا حارث؟'' سلمان پریشانی سے بولا۔

وہ حارث نے کندھے اچکائے۔

عمیر سے اتنے گھٹیا پن کی امید نہیں تھی مجھے۔'' حارث نے ہولے سے کہا۔ سلمان ایک دم چونکا۔

''حارث! تجھے یہ تو یقین ہے ناں کہ حائقہ بےقصور ہے۔'' حارث نے غصے سے اسے دیکھا۔

''تجھے ابھی بھی کوئی شک ہے کیا؟'' سلمان ایک دم اس کے قریب آیا۔

''تو حائقہ سے شادی کر لے۔'' حارث دم بخود رہ گیا۔

''عمیر یہ ہی نہیں چاہتا ناں تو یہ ہی کر۔'' اس نے حارث کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''یہاں آ کر عمیر سے غلطی ہو گئی۔ اسے تجھے اتنی جلدی سب کچھ نہیں بتانا چاہیے تھا۔ اب تو اس کی اس غلطی سے فائدہ اٹھا۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑنے کا بدلہ تو لے کم از کم اپنا لے حائقہ کو کیونکہ حمزہ تو اب اسے کسی صورت نہیں اپنائے گا۔'' سلمان شاید درست تھا حارث سوچ میں پڑ گیا۔

''مگر حائقہ...... وہ مان جائے گی کیا......'' وہ بولا تھا۔

''حارث جن لڑکیوں کے ساتھ عین بارات والے دن اتنی رسوائی ہو جائے ناں وہ تو جینے کا حق ہی کھو دیتی ہیں نہ کہ بولنے کا اختیار رکھیں میں دیکھ کے آیا ہوں اس کے ابو کا چہرہ جھکی نظریں اٹھا نہیں پا رہے تھے وہ۔ اب اس

سے پہلے کہ وہ اسے زندہ در گور کریں جا کے اپنا لے اسے۔'' سلمان نے اسے کھڑا کیا تھا۔

''ابو کو بتا دوں؟'' حارث دروازے کے قریب جا کے رکا۔

''پہلے کیا سارے کام ابو جی سے پوچھ کر کرتا آیا ہے تو۔ بعد میں بتا دیں۔'' سلیمان بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں ہال پہنچے تو وہ تقریباً خالی ہو گیا تھا۔ سلمان نے بائیک کا رخ حائقہ کے گھر کی طرف موڑ دیا مگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی عمیر اپنی اس چھوٹی سی غلطی کو سدھار کر جا چکا تھا۔

''انکل جی حائقہ......!'' بند دروازہ کئی مرتبہ کھٹکھٹانے پر کھلا تھا۔

''وہ جس کے پاس جانا چاہتی تھی میں نے ہمیشہ کے لیے اس کے پاس ہی بھیج دیا ہے اسے عمیر لے گیا ہے اسے نکاح کر کے اور آئندہ اس دہلیز پر آ کر کبھی اس کا نام مت لینا۔'' حارث سن کھڑا رہ گیا۔ دروازہ بند ہو گیا تھا۔ تبھی اس کے موبائل کی بیل بجی ایک اور ایم ایس اس نے لرزتی انگلیوں سے Play کا بٹن دبایا تھا۔ عروسی جوڑے میں ملبوس خونم خون اور نیل و نیل چہرہ لیے حائقہ، عمیر کے پاؤں چومتی اس کی روح تک کھینچ گئی۔ سلمان بھی دم بخود رہ گیا تھا۔

''میری آج سے خدا سے ایک ہی دعا ہے عمیر کہ کاش تم جیسا موقع زندگی میں کم از کم ایک بار مجھے بھی ملے کاش......'' حارث نے آنکھوں کے گوشوں میں آیا پانی صاف کرتے ہوئے سلمان سے کہا۔

''چل......'' اور سلمان نے بائیک اسٹارٹ کر دی۔

☆......☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب وہ مجھے لے کر اپنے گھر داخل ہوا، شاید وہ گھر والوں کو کچھ بتا کے میری طرف آیا تھا تبھی جب میں اس کے پیچھے پیچھے لاؤنج میں داخل ہوئی تو میڈم ثمینہ صوفے پر بیٹھیں جاگ رہی تھیں۔ عالیہ ان کے کندھے سے ٹیک لگائے شاید اونگھ رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کے ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''تم تمہارا تو آج نکاح تھا ناں۔'' وہ حد سے زیادہ حیران ہو رہی تھیں۔

''تو نکاح ہی ہوا ہے ماما میرے ساتھ۔'' عمیر ہنسا تھا۔

''اور ویسے بھی یہ ہی چاہتی تھیں ناں آپ کر دی میں نے آپ کی خواہش پوری بنا دیا آپ کی فیورٹ حائقہ ارشد کو آپ کی بہو۔'' میڈم ثمینہ اور عالیہ دونوں دم بخود کھڑی تھیں۔ میں ان سے نظریں بھی نہ ملا سکی۔

''اوپر......'' عمیر نے میری طرف دیکھتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں چپ چاپ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

''آپ کی الجھنیں صبح دور کر دوں گا۔'' ہولے سے کہتا ہوا وہ میرے پیچھے ہی اوپر آیا تھا۔

''تم تو آج مجھ سے زیادہ خوش ہو گئی ناں کیونکہ مجھ سے پیار کرنے کے بعد تم نے کہیں نہ کہیں تو اس رات کی خواہش کی ہو گی۔ ہے ناں۔'' اس نے میرے ساکت وجود کو پیچھے سے آ کر حصار میں لیا تھا۔ میرے سر سے چادر سرک کے ایک دم نیچے جا گری۔ عمیر کی سانسیں میری گردن سے کھیلنے لگی تھیں۔

''میری بات نہیں مانی تھی نا تم نے۔ تو اب آنے والی زندگی میں کوئی گلہ مت کرنا۔'' اس کا حصار تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

''جو مجھے ذرہ بھر دکھ دیتا ہے ناں میں اسے چٹان جیسا بدلہ دیتا ہوں۔'' وہ میرے وجود کو پوری طرح سمیٹتے ہوئے بولا تھا۔

"وعدہ ہے تم سے کہ تمہیں یوں مٹاؤں گا کہ پھر کبھی ابھر نہیں پاؤ گی۔" وہ اپنے لبوں سے میرے وجود پر نقش بناتے ہوئے بولا تھا۔ میرے بس میں تو شاید ماتم کرنا بھی نہیں تھا۔

"تم سے اتنی نفرت نہ کی ہوتی۔ ناں تو قسم سے آج رات تم سے پیار ہو جاتا۔" صبح کی پہلی کرن کے ساتھ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی تھی۔

☆......☆

نئے سورج کے ساتھ ہی شاید میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا دھتکارا ہوا۔

پھٹکارا ہوا۔

جس کی شروعات ہی عمیر کے تھپڑ سے ہوئی۔ عمیر کے نزدیک میری اوقات ایک ملازمہ کے برابر بھی نہیں تھی۔ جب جی چاہتا لفظوں سے لہولہان کر دیتا اور جب جی چاہتا۔ ہاتھوں سے لہولہان کر دیتا۔ اس کی اجازت کے بغیر مجھے بولنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ اس کی موجودگی میں، میں بیٹھ نہیں سکتی تھا۔ کھا نہیں سکتی تھا۔ پی نہیں سکتی تھی۔ بول نہیں سکتی تھی۔ ابو جی کے ہاتھوں نے اس رات میرے چہرے اور بدن پر جو نیل اور زخموں کے نشان چھوڑے، عمیر کے ہاتھوں نے انہیں کبھی مندمل ہونے ہی نہ دیا۔ میں اس کے ہر نفس کی تسکین تھی۔ ہر دکھ کا ازالہ تھی۔ ہر زخم کا مرہم تھی۔ ہر اذیت کا بدلہ تھی۔ میڈم ثمینہ چند دن تو سمجھ ہی نہ پائیں کہ آخر ہوا کیا تھا۔ پھر جیسے جیسے انہیں لوگوں سے خبریں ملتی گئیں مجھ سے بدظن ہوتی گئیں۔ عالیہ نے بھی سیدھے منہ بات نہ کی۔ اس دن وہ صوفے پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں۔ میں ان کے پاس ہی نیچے بیٹھ کے سبزی چھیلنے لگی۔ میرے آتے ہی عمیر نے ہر ملازمہ کی چھٹی کروا دی تھی۔ انہوں نے اخبار سے نظر ہٹا کر مجھے دیکھا۔ عمیر نے رات کھل کے اپنے دکھوں کا بدلہ لیا تھا۔ میرے چہرے اور بازوؤں پر جا بجا زخموں کے نشان تھے۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

"حائقہ! میں آسانی سے لوگوں سے امپریس نہیں ہوا کرتی لیکن تم سے چند دنوں میں ہی ہو گئی تھی۔" میں چپ چاپ سنتی رہی۔

"اکثر میں عالیہ سے کہا کرتی تھی کہ لڑکی ہو تو تم جیسی، ذہین، بااخلاق، مضبوط......" انہوں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

"مجھے اب بھی یقین نہیں ہوتا کہ تم جیسی لڑکی اس قدر گر گئی۔ سب کچھ کیسے بھول گئیں تم چند لمحوں میں حائقہ؟" انہوں نے پوچھ ہی لیا۔ میں ہولے سے ہنسی تھی۔

"میڈم! میں کچھ نہ بھولی تھی۔ سب یاد تھا مجھے۔ میں نے جتنی جلدی عمیر سے پیار کیا اتنی جلدی اسے بھلا بھی دیا لیکن شاید یہ ہی میری غلطی تھی۔ شاید اسی کی سزا ملی مجھے۔ میں گھر پر تھی جب مجھے عمیر کا فون آیا۔ وہ مجھے آنے کو کہہ رہا تھا اور جب میں نے منع کیا تو......" میں نے آنسوؤں کے ساتھ انہیں سب بتا دیا۔

"میڈم! مجھے پتا ہے آپ یقین نہیں کریں گی کیونکہ واقعی یہ یقین کرنے والی بات ہی نہیں ہے۔ آپ بے شک مجھے اپنے دل میں کوئی اونچا مقام نہ دیں لیکن اپنی نظروں سے پاتال میں بھی مت گرائیں پلیز۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے بے دردی سے آنکھوں کو رگڑا تھا۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہیں پھر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے ہولے سے بولیں۔

"اللہ تم پر رحم کرے۔"

☆......☆

15 اگست سے اسکول اوپن ہو رہے تھے، اکیڈمی جانا، وہ بھی حارث جاوید کی وہ بھی فزکس پڑھانے کے لیے خواب وخیال ہی ہو چکا تھا۔ میں ایک مرتبہ عمیر کے سامنے اس کا ذکر کرنے کی غلطی کر بھی چکی تھی اور اس نے مجھے روئی کی طرح دھنک کے رکھ دیا تھا۔ اس دن بھی میں کچن میں کھڑی یہ ہی سوچ رہی تھی کہ اس سے کیسے بات کروں۔

"حالقیہ بات سنو!" عمیر نے مجھے لاؤنج سے آواز دی تھی۔ میں تیزی سے باہر آئی۔ میڈم ثمینہ اپنے کمرے میں تھیں اور عالیہ صوفے پر بیٹھی کوئی کام کر رہی تھی۔ میں چپ چاپ اس کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ ایک نظر میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے ایک کاغذ اور پین میز پر پھینکا تھا۔

"یہ کیا ہے۔" حالانکہ اسے میرا زیادہ بولنا پسند نہیں تھا پھر بھی میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔

"تمہارا ریزائن لیٹر ہے۔ آج سے اسکول ختم۔" عمیر کی بات نے مجھے ہلا کے رکھ دیا۔ عالیہ بھی حیرانی سے مجھے دیکھنے لگی تھی۔

"عمیر پلیز یہ جاب میرے لیے......" عمیر نے میری بات یکدم کاٹ دی۔

"تمہیں دراصل ہر کام مار کھا کے کرنے کی عادت ہوتی جا رہی ہے۔ چپ چاپ کرو سائن۔" میں ساکت کھڑی رہ گئی۔

میں کیسے کر دیتی سائن؟ وہ جاب میرے آگے بڑھنے کا سہارا تھی۔ عارش کا فیوچر تھی۔ میرے ایم فل کا واحد ذریعہ تھی میں خود کو بولنے سے باز نہ رکھ سکی۔

"عمیر! آپ نہیں جانتے یہ جاب میرے لیے کتنی ضروری ہے پلیز ایسا نہ کریں۔" عمیر ایک دم اٹھ کے میرے سامنے آیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں اس جاب کی، زندہ رہنے کے لیے تمہیں دو وقت کی روٹی چاہیے بس اور وہ اس گھر سے مل جائے گی۔ سائن کرو۔" وہ سخت لہجے میں بولا تھا۔

"آپ مجھے بے شک دو وقت کی روٹی نہ دیں۔ میں اس کے بغیر جی لوں گی مگر مجھ سے یہ جاب نہ چھینیں پلیز۔ عمیر مجھے عارش کو ڈاکٹر بنانا ہے۔ ابوجی نے صرف میرے بھروسے پر اسے میڈیکل پڑھنے دیا تھا۔ اب آپ یہ بھروسہ تو نہ چھینیں مجھ سے پلیز۔" میری آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے تھے۔

"کوئی رشتہ نہیں رہا تمہارا اب عارش سے۔ یاد ہے ناں اس رات تمہارے باپ نے کیا کہا تھا کہ مر گئیں تم آج سے ہمارے لیے اور جو مر جاتا ہے اس کا اس دنیا اور یہاں بسنے والوں سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ جیسے تمہارا نہیں رہا۔" عمیر نے انگلی اٹھا کے مجھے جتایا تھا۔

"عمیر! خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔ یہ کوئی کھلونا تو نہیں ہے جو میں نے چند روپے میں خریدا تھا اور اب آپ چھین لیں گے تو میں اور لے لوں گی۔ یہ میرے سولہ سالوں کا صلہ ہے عمیر، میرے سولہ سالوں کی واحد کمائی ہے۔ ایک بار کھو دی تو واپس نہیں ملے گی۔" میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کے بلک بلک کے روئی تھی۔

عالیہ میڈم ثمینہ کو بھی بلا لائی۔

"اور آپ تو جانتے ہیں کہ کھو دینے کا درد کیا ہوتا ہے۔ پلیز مجھے ابھی سے یہ درد نہ دیں۔ صرف عارش کے ڈاکٹر بننے تک اس کے بعد آپ بے شک نہ کرنے دینا، بلکہ میں خود چھوڑ دوں گی مگر پلیز عارش کے ڈاکٹر بننے تک ایسا نہ

کریں پلیز۔" عمیر کو سامنے والے سے اتنا کچھ سننے کی عادت نہیں تھی جب کہ سامنے والا انتہائی قابل نفرت ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی دسترس میں بھی ہو۔ اب بھی اس نے میرا منہ سختی سے اپنے سیدھے ہاتھ سے پکڑا تھا۔

"حائقہ! آخری بار کہہ رہا ہوں چپ چاپ سائن کردو۔" عمیر کی آواز شاید اس سے زیادہ سرد نہیں ہوسکتی تھی مگر عارش سے کیے وعدوں نے مجھے اتنی جلدی ہارنے کی اجازت نہ دی۔

"عمیر! آپ کو خدا کا واسطہ پلیز ایسا......" عمیر نے زناٹے دار تھپڑ میرے منہ پر مارا تھا۔ میں سن رہ گئی۔ اس نے اس بار مجھے اشارے سے سائن کرنے کو کہا۔ میں نے ایک بار پھر ہمت کی۔

"عمیر! میں نے عارش سے وعدہ کیا ہے پلیز مجھے......" دوسرا تھپڑ اس سے بھی زیادہ زوردار تھا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑی نہ رہ سکی۔ پیچھے کو لڑکھڑا گئی۔

"عمیر! ہاتھ نہ اٹھاؤ۔" میڈم ثمینہ ایک دم آگے کو آئی تھیں۔ عمیر نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں وہیں روک دیا۔

"ماما پلیز! اسے ان تھپڑوں کی عادت ہوگئی ہے اب۔" کہتے ہوئے اس نے تیسرا تھپڑ رسید کیا تھا۔ میں لڑکھڑا کے کچن کے دروازے میں گرگئی۔ ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ عمیر نے وہ کاغذ اور پین میرے پاس زمین پر پھینکا۔

"سائن کرو۔"

میں نے روتے ہوئے آخری بار بولنے کی کوشش کی تھی۔ "عمیر میں......"

عمیر نے اپنا پاؤں جوتے سمیت میرے منہ پر رکھا پوری قوت سے، میری چیخیں نکل گئیں۔

"عمیر چھوڑو اسے۔ مر جائے گی۔" میڈم ایک دم میری طرف آئیں۔ عمیر نے اس قدر زور سے میرا چہرہ دبایا ہوا تھا کہ میری سسکیاں بھی نہ نکل رہی تھیں۔ دونوں ہاتھوں سے میں اس کا جوتا ہٹانے کی کوشش کررہی تھی۔

"مارنا ہی تو ہے اسے تاکہ پھر دوبارہ کبھی میرے سامنے کھڑی نہ ہوسکے۔" عمیر نے کہتے ہوئے جوتا رگڑا تھا۔ میری چیخیں کمرے کے در و دیوار ہلا گئیں۔

"حائقہ کرو سائن۔" میڈم ثمینہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر زبردستی سائن کروا کے عمیر کو پرے دھکیلا تھا۔ میرا پورا چہرہ خونم خون ہوچکا تھا مگر درد...... درد دل میں ہو رہا تھا۔ عارش کا ہنستا ہوا چہرہ بار بار نظروں کے سامنے آرہا تھا۔ آج عمیر نے مجھے دوسری بار مار دیا۔ پہلی بار اس دن مارا تھا جب مجھ سے میرے بائیس سالوں کی عزت چند لمحوں میں چھین لی تھی اور دوسری بار آج مار دیا جب مجھ سے میرے بائیس سالوں کی کمائی چند لمحوں میں چھین لی۔

"میں عارش سے کیا کہوں گی۔" بے ہوشی میں بھی میرے لبوں سے یہ ہی الفاظ نکل رہے تھے۔

☆......☆

آخر کار آج فیصلہ کر کے وہ عمیر سے ملنے آ ہی گیا۔ ابھی تو رشتہ بنایا بھی نہیں تھا۔ ابھی تو محبت کرنی شروع ہی کی تھی کہ اس نے ایک ہی جھٹکے میں چھین لی۔ ذرا نہ سوچا کئی سالوں کی دوستی کا کیوں کیا عمیر نے ایسا بس یہ ہی پوچھنے آیا تھا وہ اس سے۔ عمیر اسے دیکھ کے کافی حیران ہوا۔

"مجھے لگا تھا شاید تم جلدی میرے پاس آؤ گے۔" عمیر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"مجھے صبر آگیا ہوتا تو شاید آج بھی تمہارے پاس نہ آتا۔" حمزہ خالی خالی لہجے میں بولا۔ عمیر چپ رہا۔

"مگر میں کیا کروں۔ میرے وجود کی ہر خالی جگہ میں اتر گئی تھی وہ، میرے ذہن میں آج بھی اس کی آوازیں گونجتی ہیں۔ عمیر میں نے تو ابھی اس کے سنگ نہ جانے کہاں کہاں گھومنا تھا یار! پر تو نے تو پوری طرح خوش نہ

ہونے دیا وہ ابھی میری ہوئی بھی نہیں تھی اور تو نے چھین لیا۔" حمزہ کی آواز شاید بھر آئی تھی۔

"اچھا ہوا ناں پہلے ہی چھین لیا بعد میں چھینتا تو زیادہ تکلیف ہوتی۔" عمیر بولا تھا۔

"مگر چھینا ہی کیوں۔" حمزہ ایک دم بولا۔

"کیونکہ اگر میں اسے نہ چھینتا تو وہ مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیتی۔ میرا ماضی، میرا مستقبل سب کچھ مجھ پر چھانے لگی تھی وہ مجھے کہیں گم کرنے لگی تھی۔" عمیر کی بات پر حمزہ ہولے سے مسکرایا۔

"یعنی تو ڈر گیا تھا اس سے۔" اس کی بات پر عمیر سن رہ گیا۔

"اسی لیے اسے مٹا دیا تو نے۔ اس ڈر سے کہیں وہ تجھے گم نہ کردے۔ تو نے اسے گم کر دیا۔ کس چیز کا ڈر تھا تجھے عمیر؟ وہ تیرا نام چھین لیتی، تیرا مقام چھین لیتی۔ تیرے اسٹوڈنٹس چھین لیتی تو یہ ڈر تو مجھے بھی ہونا چاہیے تھا۔ میرا بھی ایک نام تھا۔ میری بھی اپنی اکیڈمی تھی۔ میرے اسٹوڈنٹس بھی اس کے پاس جانے لگے تھے۔ پر میں تو نہیں ڈرا عمیر۔ مجھے تو نفرت نہیں ہوئی اس سے۔" عمیر چپ تھا۔

"کیونکہ میری فطرت الگ ہے۔ تیرے جیسی نہیں ہے۔ اپنی منوانے والی اونچا اڑنے والی۔ دوسروں کو ہمیشہ نیچا دکھانے والی لیکن عمیر آخر کب تک...... کب تک خود کو منوانے کے لیے دوسروں کو مٹاتا رہے گا۔ دوسروں کو خود سے چھوٹا دیکھنے کے لیے کتنا اونچا اڑے گا۔ آج حائقہ کھڑی ہوئی تھی تیرے آگے۔ کل کوئی اور کھڑا ہو جائے گا۔ پرسوں کوئی اور کس کس کو مٹائے گا۔" عمیر نے حمزہ کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"ہر اس شخص کو جو میرے رستے کی رکاوٹ بنے گا۔" وہ ٹھنڈے لہجے میں بولا تھا۔

"کیونکہ میری فطرت الگ ہے حمزہ! اپنی منوانے والی بہت اونچا اڑنے والی۔" حمزہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"عمیر! حائقہ ارشد کسی صفحے پر لکھا ہوا نام نہیں ہے کہ تو نے مٹایا تو مٹا رہے گا۔ جیتی جاگتی لڑکی ہے وہ دوبارہ کھڑی ہو گئی تو......" عمیر ہولے سے ہنسا۔

"جیتے جاگتے وجود جب قبر میں اتار دیے جائیں تو دوبارہ زندہ نہیں ہوتے حمزہ! حارث ہو یا حائقہ مجھے کوئی بھی قابل قبول نہیں ہے۔" حمزہ بھی مسکرایا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ حارث درست تھا۔ یہ اسی کی نفرت کی چنگاری ہے جو حائقہ کو بھی جلا گئی۔" عمیر آگے کو ہوا۔

"غلطی صرف میری نہیں ہے حمزہ! منع کیا تھا میں نے اسے کہ اپنی اور میری جنگ میں حائقہ کو نہ گھسیٹے مگر وہ نہیں مانا اپنے اور میرے بیچ حائقہ کو کھڑا کر دیا اس نے، اب تو تو جانتا ہے کہ مجھے حارث سے کتنا پیار ہے میں کسی کو بھی برداشت نہیں کر سکتا اپنے اور اس کے بیچ۔" عمیر ہنستے ہوئے بولا تھا۔ حمزہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر ہولے سے بولا۔

"عمیر! میں نے سنا ہے کہ بہت اونچا اڑنے والے جب گرتے ہیں تو منہ کے بل بہت گہرائی میں جا کے گرتے ہیں۔ کاش جب تیرا وقت آئے تو میں تیرے پاس نہ ہوں۔ کئی سالوں کی دوستی ہے دیکھ کے بہت درد ہوگا مجھے۔" حمزہ کہہ کے باہر نکل گیا۔

☆......☆

میں اس دن اوپر کمرے میں تھی جب عمیر تقریباً دو بجے کے قریب گھر آیا۔

"حائقہ......!" مجھے آوازیں دیتا ہوا وہ اوپر آیا تھا۔

''ادھر آؤ۔'' مجھے بازو سے کھینچتا ہوا وہ نیچے لے آیا۔
''بیٹھو۔'' کرسی لاؤنج میں آنے والے دروازے کے بالکل درمیان میں رکھ کے اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں حیران ہوتے ہوئے چپ چاپ بیٹھ گئی۔
''لوگوں کو تو ابھی بھی تم سے بڑی امیدیں ہیں بھئی، ہو کیا چیز تم۔ جس سے ملتی ہو اس پر جادو کر دیتی ہو۔ پھر بس تمہارا ہی ہو کر رہ جاتا ہے وہ۔'' میرے گلے سے دوپٹہ کھینچ کے اس نے میرے دونوں بازوؤں کو کرسی سے باندھنا شروع کر دیا۔
''پہلے حارث پھر حمزہ میری ماما میری بہن کیا میرے اسٹوڈنٹس کیا حمزہ کے اسٹوڈنٹس۔ سب پر جادو کر دیا تم نے سوائے میرے، پتا نہیں کیا وجہ ہے جو بس مجھے ہی اچھی نہیں لگتیں تم، باقی تو سارا جہان گرویدہ ہے تمہارا۔''
عمیر کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ نہ جانے اب کیا ہونے والا تھا۔
''کہتے ہیں میں ڈرتا ہوں تم سے، کہتے ہیں تم دوبارہ کھڑی ہو جاؤ گی میرے سامنے۔'' عمیر نے مجھے اچھی طرح کرسی سے باندھ دیا تھا۔
''مگر کیسے؟ میں کھڑا ہونے دوں گا تب ناں میں تم میں رتی برابر بھی جان چھوڑوں گا تب ناں۔'' کہتے ہوئے اس نے عالیہ کو ثمینہ راؤ کے کمرے میں دھکیلتے ہوئے باہر سے دروازہ بند کیا تھا۔ مجھے ایکدم خوف آیا۔
''یہ ہی ہے ناں تمہارا غرور تمہاری طاقت، اسی پر ناز ہے ناں تمہیں۔'' کہتے ہوئے اس نے میرے سارے اکیڈمک ڈاکومنٹس میرے سامنے سیڑھیوں پر پھینکے تھے۔
میری سانسیں تھم گئیں۔ عمیر کیا کرنے لگا تھا۔
''میٹرک، فرسٹ ڈویژن 86%۔'' وہ میرے سامنے سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ ہنستے ہوئے میرے ڈاکومنٹس دیکھ رہا تھا۔
''F.sc فرسٹ ڈویژن 84%۔'' میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ آنکھوں میں مرچیں بھرنے لگیں۔
''B.sc فرسٹ ڈویژن ٹاپر آف ڈسٹرکٹ۔'' اس نے ہنستے ہوئے مجھے دیکھا۔
''عمیر......!'' سرگوشی میرے لبوں پر بھی دم توڑ گئی۔ میڈم ثمینہ کے کمرے کا دروازہ تواتر سے بج رہا تھا۔
''ایم ایس سی فزکس سلور میڈلسٹ۔ پتا ہے یہ بھی مجھے سب سے بری لگتی ہے۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ نہ جانے کیوں میری آنکھوں سے آنسو نکلنا شروع ہو گئے۔ عمیر مجھے دیکھ کے اور ہنسا۔
''بی ایڈ سرگودھا یونیورسٹی سے۔'' وہ ایک ایک کر کے سب پڑھ رہا تھا۔
''ایم ایڈ، GC یونیورسٹی سے Continue۔'' اس کے بعد ڈھیر سارے کیریکٹر سرٹیفکیٹس، اعزازی سرٹیفکیٹس، اسکالرشپ کے سرٹیفکیٹس...... اس نے سیڑھیوں پر ڈھیر لگا دیا۔
''کیا کریں ان فالتو کاغذوں کا حائقہ؟'' وہ میری طرف دیکھ کے ہنسا تھا۔
''عمیر کیا کرنے لگے ہو؟'' میری آواز میرے لبوں پر ہی خاموش ہو گئی۔ عمیر نے لمحوں میں تیلی جلا کے انہیں آگ لگائی تھی۔ چند لمحوں کے لیے تو میں ساکت رہ گئی۔ جو ہوا تھا اس پر یقین سا نہ آیا مگر وہ سب واقعی ہوا تھا۔ ان کاغذات سے نکلتے شعلے مجھے اصل دنیا میں واپس لے آئے۔
''عمیر!'' وہ میری آواز نہیں تھی۔ میرا دکھ تھا۔ درد تھا تکلیف تھی جو لبوں سے نکلی تھی۔
''عمیر! خدا کا واسطہ رک جائیں۔ عمیر پلیز رک جائیں۔'' میں نے پوری قوت سے خود کو کھولنے کی کوشش کی

تھی۔

"عمیر! یہ میری عمر بھر کا صلہ ہے۔ میں نے بہت مصیبتوں اور تکلیفوں کے بعد حاصل کیے ہیں یہ، پلیز رک جائیں۔ عمیر آپ مجھے مار دیں۔ میری جان نکال لیں مگر انہیں نہ جلائیں۔" میں پاگلوں کی طرح روتے ہوئے خود کو کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عمیر مسلسل ہنس رہا تھا۔ میڈم ثمینہ کے کمرے کا دروازہ ٹوٹنے والا ہو گیا۔

"عمیر! میں مر جاؤں گی ان کے بغیر، مجھے اپنے خون سے زیادہ عزیز ہیں یہ۔" مجھ سے بولنا دوبھر ہو رہا تھا۔ میرے بائیس سالوں کا صلہ میرے سامنے جل کے راکھ ہو رہا تھا اور میں چپ تھی۔ بے بس تھی۔ مجبور تھی۔ میرا دل شاید کب کا دھڑکنا بند ہو گیا تھا۔ زور زور سے ہلنے کی وجہ سے کرسی آگے کو گر گئی۔ میرا منہ پوری قوت سے زمین پر لگا تھا۔ ہاتھ ابھی بھی کرسی کی پشت سے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے زمین پر ہی گھسیٹنے کی کوشش کرنا شروع کی۔

"عمیر! رک جاؤ، خدا کا واسطہ، عمیر میرے ساتھ جو مرضی سلوک کرو۔ خدا کا واسطہ۔ عمیر میرے ساتھ جو مرضی سلوک کرو۔ میری کھال ادھیڑ دو، مجھے زندہ درگور کر دو مگر خدا کا واسطہ ایسے مت کرو۔" میرے ماتھے اور ہونٹ سے خون رسنے لگا تھا۔ میڈم ثمینہ کے کمرے کا دروازہ ایکدم کھلا۔ سامنے کا منظر دیکھ کے وہ بھی چند لمحوں کے لیے دم بخود رہ گئیں۔ پھر عالیہ نے تیزی سے آ کے میرے ہاتھ پاؤں کھولے تھے۔

"عمیر! خدا کا خوف کرو۔" میڈم ثمینہ جیسے بے بس ہو گئیں۔ میں پاگلوں کی طرح اپنے ڈاکومنٹس کی طرف بھاگی تھی جو تقریباً جل کے راکھ ہو چکے تھے۔ ماتھے سے ٹپکتے خون کی پرواہ کیے بغیر سلگتی ہوئی راکھ کی پرواہ کیے بغیر میں نے اس میں ہاتھ مارے تھے۔ میرے ہاتھوں کی کھال جلنے لگی۔

"حارث! چھوڑ دے کچھ نہیں بچا۔" عالیہ نے مجھے پیچھے ہٹایا مگر مجھے یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ وہ راکھ نہیں تھی۔ وہ میرے بائیس سال تھے جو لمحوں میں ختم ہو گئے تھے۔ وہ میری محنتوں کا صلہ تھا جو چند لمحوں میں راکھ ہو گیا تھا۔ چہرے سے خون صاف کرتے ہوئے میں نے راکھ میں ہاتھ مارتے ہوئے چند ادھ جلے ٹکڑے ڈھونڈ لیے۔ نہ جانے کس سند کے کون سے حصے تھے۔ میں نے پھونک مار مار کے انہیں ٹھنڈا کیا۔ مجھے اس لمحے کچھ بھی یاد نہ تھا۔ میں بھول گئی کہ میں کہاں تھی کن حالات میں تھی۔ جہاں تھی وہاں کیوں آئی تھی۔ میں رونا بھول گئی۔ چلانا بھول گئی۔ بھول گئی کہ میرے برابر میں عمیر بیٹھا تھا جو مسلسل مجھے دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ اپنا درد بھول گئی۔ چہرے کو رنگین کرتا خون بھول گئی۔ ہاتھوں کی انگلیوں اور ہتھیلیوں کی جلتی ہوئی کھال بھول گئی۔ پھٹا ہوا ہونٹ بھول گئی جو نہ جانے کون سی دفعہ پھٹا تھا۔ سب بھول گئی۔ بس مجھے وہ یاد تھا جو ابھی چند لمحے پہلے ہوا تھا۔ دل کا وہ درد یاد تھا جو انتہا کو پہنچ کے ختم ہو گیا تھا۔ وہ شعلے یاد تھے جو ابھی چند لمحے پیشتر دیکھے تھے اور وہ ٹکڑے یاد تھے جو اس وقت میرے ہاتھ میں تھے جنہیں میں نے ہونٹوں سے لگایا ہوا تھا۔ ہر احساس ختم ہو گیا تھا۔ ہر درد ختم ہو گیا تھا۔ ہر شے خالی ہو گئی تھی۔ بس اس لمحے میں تھی اور میرے ہاتھ میں بند چند ٹکڑے۔

"عمیر! مجھے ڈر لگنے لگا ہے تیرے انجام سے۔" نہ جانے میڈم ثمینہ نے کیا کہا تھا۔

"اس کے انجام سے تو کم برا ہی ہو گا۔" نہ جانے عمیر نے کیا کہا تھا۔ مجھے کچھ نہیں پتا تھا۔ اس دن عمیر نے مجھے تیسری بار مار دیا۔

☆......☆

"حارث......!" سلمان کی تیسری آواز پر وہ چونکا تھا۔

(جاری ہے)

صدف سعد

ردا کی ڈائری

روشنی فیصل کی ڈائری سے

معین نظامی کی غزل

میرا بوجھ خود اٹھانا، میرے دائرے میں رہنا
مجھے اپنے دل میں رکھنا میرے حافظے میں رہنا
میرے منظروں میں بسنا میری گفتگو میں ہونا
میرے لمس میں سمانا میرے ذائقے میں رہنا
میرا حکم خود سنانا، میری مہر خود لگانا
میرے مشورے میں ہونا میرے فیصلے میں رہنا
کبھی دھوپ کے نگر میں میرا ساتھ چھوڑ جانا
کبھی میرا عکس بن کے میرے آئینے میں رہنا
کبھی منزلوں کی صورت میری دسترس سے باہر
کبھی سنگِ میل بن کر میرے راستے میں رہنا
میرے ہاتھ کی لکیریں تیرا نام بن کے چمکیں
میرے خواہشوں کی خوشبو، میرے زائچے میں رہنا

شائقہ ایاز کی ڈائری سے

سپاس گل کا کلام

مجھے ایسا لطف آیا کیا
جو ہجر تھا نہ وصال تھا
میرے موسموں کے مزاج داں
تجھے کتنا میرا خیال تھا
کسی اور کے چہرے کو دیکھ کر
تیری شکل ذہن میں آگئی
تیرا نام لے کے ملی اس سے
میرے حافظے کا یہ حال تھا
تیرے بعد کبھی کوئی نہیں ملا
جو یہ حال دیکھ کے پوچھتا
مجھے کس کی آگ جھلسا گئی
میرے دل کو کس کا ملال تھا
کہیں خون دل سے لکھا تو تھا
تیرے سال ہجر کا سعید
وہ ادھوری ڈائری کھو گئی
وہ نجانے کون سا سال تھا

ایم جے قریشی کی ڈائری سے

محسن نقوی کا کلام

میں تنہائی پہنتا ہوں
اُداسی کے اُجاڑ آنگن میں چھتا ہوں
کٹھن محرومیوں کے زرد پتوں کو
مری آنکھوں میں جگراتے بھرے ہیں ایک مدت سے
مرے ہونٹوں پہ چسپاں ہیں چٹختی ہچکیاں
چہرے پہ کھلتی، پھیلتی، دکھتی خراشیں ہیں
میں اپنی ذات یہاں اجڑے ہوئے گاؤں کا میلہ ہوں
مرے یارو
تمہارے ساتھ رہ کر بھی اکیلا ہوں!
مری سنگت میں مت بیٹھو
تمہیں تو خود سنورنا ہے
تمہاری خواہشوں کے بام و در پہ

روشنی کے پھول کھلنا ہیں
تمہیں لکھنا ہے اپنی سانس کی گرمی سے
نیند کا سفرنامہ
مری سنگت میں مت بیٹھو
کہ میں پتھر کا مجسمہ ہوں
کہ میں محرومیوں کے شہر کا باسی ہوں
مری قسمت اُداسی
کم لباسی، ناشناسی ہے!
مری سنگت میں مت بیٹھو
مجھے ملنے سے کتراؤ
خود اپنے دل کو سمجھاؤ
میرے نزدیک مت آؤ
میرے دل میں اندھیرا ہے
اندھیرا صرف میرا ہے

صائمہ جواد کی ڈائری سے

اظہر جاوید کی نظم

تو اب ہم ایسا کرتے ہیں
محبت ترک کرتے ہیں
یہ شعر و شاعری کا سلسلہ یہ پیار کی باتیں
سب ہی کچھ چھوڑ دیتے ہیں
ہم اپنی سوچ کا، احساس کا رخ موڑ دیتے ہیں
کسی کو بے وفا کہنا، کسی کو کج ادا لکھنا
کبھی اپنی وفاؤں کے صلے کی آرزو رکھنا
ہمیشہ دل کو چاہت کے لیے بے آبرو رکھنا
کسی عینی،، قیس، لیلیٰ، کسی مومل کی خاطر ہم
کسی سوہنی، کسی بھی ہیر کے آنچل کی خاطر ہم
نہیں برباد ہوں گے اب
تو اب یہ فیصلہ کرلیں
ہم اپنی زیست کی ناکامیاں تسلیم کرتے ہیں
ہم اپنی بے بسی کی خامیاں تسلیم کرتے ہیں
یہ شہرت ہے کہ بدنامیاں تسلیم کرتے ہیں
حقیقت مان لیتے ہیں
لپکتے، دوڑتے، بڑھتے ہمارا پاؤں رپٹا ہے
اُدھر و کتوں کے پیچھے سے کوئی انگلی بھی اٹھی ہے
ہماری عمر کی لمبی انگڑائی اب ختم ہوتی ہے
ستارے بجھ گئے ہیں اب
شرارے بجھ گئے ہیں اب
اکیلے پن کی اب کوئی نئی تدبیر کیا ہوگی
کسی بھی عشق کی پاؤں میں اب زنجیر کیا ہوگی
ستم پرور بھلا اب اور بھی تقدیر کیا ہوگی
تو اب ہم ایسا کرتے ہیں
ہم اپنی خودکشی کا آپ خود اعلان کرتے ہیں
قلم کاغذ دھرتے ہیں
بہت کچھ لکھ لیا ہم نے
بہت دن جی لیا ہم نے
یہ رشتہ توڑ دیتے ہیں
سب ہی کچھ چھوڑ دیتے ہیں ہم

اسماء جمشید کی ڈائری سے

وصی شاہ کا خوب صورت کلام

وسعتِ دشت ہجر دیکھ کے ڈر جاتا ہوں
تجھ سے آگے کا سفر دیکھ کے ڈر جاتا ہوں
روز ڈھلتے ہوئے سورج کی طرح شام گئے
میں بھی اک درد کے دریا میں اتر جاتا ہوں
وہ چپ چپ سی کہیں بیٹھ کے روتی ہوگی
میں راتوں کو ذرا دیر سے گھر جاتا ہوں
میں نے بھی جرم بغاوت کے ستم جھیلے ہیں
میں بھی اب لوگ جدھر جائیں ادھر جاتا ہوں
چل پڑا ہوں میں زمانے کے اصولوں پر وصی
میں بھی اب اپنی باتوں سے مکر جاتا ہوں

.......☆.......

اشعار

ماریہ یاسر ــــــــ کراچی
عجب رفاقت تھی اس شخص کی سنگ میرے
سمندر کے ساحلوں کی طرح بے گانہ ہم رہے

فرزانہ شوکت ــــــــ کراچی
گھاؤ گنتے نہ کبھی زخم شماری کرتے
عشق میں ہم بھی گر وقت گزاری کرتے!
وقت آیا ہے جدائی کا تو پھر ہم بھی سوچتے ہیں
تجھ کو اعصاب پہ اتنا بھی نہ سوار کرتے

مریم ماہِ منیر ــــــــ لاہور
محبت کے بیچ کہیں نفرت بھی تھی رکی
پیار کے گجروں میں کانٹے بھی پرو لیے
ایسا تو نہ سوچا تھا قسمت کا کاری وار
تم چپ ہوئے تو ہم بھی خاموش ہو لیے

شہلا گل سحر ــــــــ کوہاٹ کینٹ
جن آنکھوں میں بسی ہے صورت تیری
ان آنکھوں سے اشک بہاؤں کیسے
ترکِ تعلق کیے گو ایک مدت بیتی سحر
دل کے در و بام مہکاؤں کس لیے

ماریہ علی ــــــــ گوجر خان
وہ ہر مقام سے پہلے وہ ہر مقام کے بعد
سحر تھی شام سے پہلے، سحر تھی شام کے بعد
چراغ بزم ستم ہیں ہمارا حال نہ پوچھ
جلے تھے شام سے پہلے جلے ہیں شام کے بعد

امبرین حیدر ــــــــ اسلام آباد
آنکھوں سے خواب دل سے تمنا تمام شد
تم کیا گئے کہ شوقِ نظارہ تمام شد
اک یاد یار ہی تو ہیں انداز ہے ندیم
ورنہ وہ کلیہ عشق تو کب کا تمام شد

نوشین مدثر ــــــــ لاہور
ہم سے اگر ہے ترک تعلق تو کیا ہوا
یارو کوئی تو ان کی خبر پوچھتے چلو
جو خود کو کہہ رہے ہیں منزل شناس ہیں
ان کو بھی کیا خبر ہے مگر پوچھتے چلو

شمائلہ ملک ــــــــ کراچی
ہم سے اہل دل اور بھی ہیں اہل وفا اور بھی ہیں
ایک ہم ہی نہیں دنیا سے خفا اور بھی ہیں
ہم پر ہی ختم نہیں مسلکِ شوریدہ سری
چاکِ دل اور بھی چاک قبا اور بھی ہیں

مریم نواز ــــــــ فیصل آباد
کس قدر انوکھا ہے رابطہ محبت کا
کب نجانے ہو جائے معجزہ محبت کا
اپنی ذات سے بھی وہ اجنبی لگتا ہے
جس کے ساتھ ہو جائے حادثہ محبت کا

عانیہ نیازی ــــــــ ربوہ
عشق مجبور و نامراد سہی
پھر بھی ظالم کا بول بالا ہے

موت آئے تو دن پھریں شاید
زندگی نے تو مار ڈالا ہے
مریم قادر ـــــــ اسلام آباد

اک اداسی کرتی جائے گی سرایت روح میں
اس قدر وابستگی اچھی نہیں ہے شام سے
اسریٰ محمد امین ـــــــ پشاور

اس سے جان گیا میں کہ بخت ڈھلنے لگے
میں تھک کے چھاؤں میں بیٹھا تو پیڑ جلنے لگے
میں دے رہا تھا سہارے تو اک ہجوم میں تھا
جو گر پڑا تو سبھی راستے بدلنے لگے
حوریہ صادق ـــــــ حیدر آباد

محبتوں میں تو ملنا ہے یا اجڑ جانا
مزاج عشق میں کب اعتدال رکھا ہے
دھنک ناز ـــــــ کراچی

عشق ٹھہرا تو پھر انا کیسی
وہ نہ بدلے تو ہم بدل جائیں
عفاف ـــــــ گجرات

مانا کہ تیرا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں
ملنے کے بعد مجھ سے ذرا آئینہ بھی دیکھ
رمنا راحیل ـــــــ ملتان

آجاؤ گے حالات کی زد پر جو کسی دن
ہو جائے گا معلوم خدا ہے کہ نہیں ہے
نور بانو ـــــــ کوئٹہ

افسردہ و پژمردہ نظر آتے ہو ہر دم
چہرے پر وہ رونق نہ آنکھوں میں اجالا
کیا چھین لیا دل کا سکون تجھ سے کسی نے
یا روٹھ گیا تجھ سے ترا چاہنے والا
علیزے، زارا ـــــــ راولپنڈی

اپنے ہاتھوں کی لکیروں پر بگڑ جاتے ہیں
ہم تو پاگل ہیں ہواؤں سے بھی لڑ جاتے ہیں
تم بضد ہو کہ چلو ساتھ ہمارے لیکن
ہم مسافر ہیں بہت جلد بچھڑ جاتے ہیں
اریبہ کامران ـــــــ لاہور

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
یمنیٰ ناصر ـــــــ اوکاڑہ

وہ بھی شاید رو پڑی ویران کاغذ دیکھ کر
میں نے ان کو آخری خط میں لکھا کچھ بھی نہیں
زہرہ مگسی ـــــــ سکھر

اس عبادت کو کون سمجھے گا
کس نے دیکھے ہیں رتجگے اپنے
پاؤں کے آبلے یہ پوچھتے ہیں
کس مسافت میں دن کٹے اپنے
سارا نوید ـــــــ چیچہ وطنی

تاریکیاں ہیں اور ہیں غزلوں کے مشغلے
کتنے عذاب لگتے ہیں سوچوں کے مشغلے
تم تو بچھڑ کے مجھ سے کہیں دور جا بسے
اور میرے پاس رہ گئے یادوں کے مشغلے
ریمل آرزو ـــــــ اوکاڑہ

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں
ہوتا ہے راز عشق و محبت انہی سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں
بشریٰ خان ـــــــ لاہور

کیا ضروری ہے ہاتھوں میں تیرا ہاتھ بھی ہو
چند یادوں کی رفاقت ہی بہت کافی ہے
لوٹ چلتے ہیں اس پل سے گھروں کی جانب
یہ تھکن اتنی مسافت ہی بہت کافی ہے

......☆......

نورین ملک

اس ماہ میں

اس ماہ کے اقوال

اقوال حضرت علیؓ

☆ یہ ایام تمہاری زندگی کے صفحات ہیں انہیں نیک اعمال سے زینت بخشو۔
☆ جو پسند ہے اسے حاصل کرلو یا جو حاصل ہے اسے پسند کرلو۔
☆ معاف کرنا اور باعمل ہونا ان دو اعمال کے برابر کوئی علم نہیں۔
☆ نادانوں کی بات پر تحمل، عقل کی زکوۃ ہے۔
☆ صبر ایک ایسی سواری ہے جو کبھی گرنے نہیں دیتی نہ کسی کے قدموں میں نہ کسی نظروں میں۔
☆ کوئی تمہارا دل دکھائے تو ناراض مت ہونا کیونکہ قدرت کا قانون ہے جس درخت کا پھل زیادہ میٹھا ہوتا ہے لوگ پتھر بھی اسی کو مارتے ہیں۔
☆ جب تک تمہارے اندر غرور اور غصہ باقی ہے تم خود کو کبھی نیک لوگوں میں شمار مت کرنا۔
☆ زندگی میں رشتے نبھانا اتنا ہی مشکل کام ہے جتنا کہ ہاتھ میں لیے ہوئے پانی کو بچانا۔
صائمہ ظہیر۔کراچی

اس ماہ کے اقتباس

چھٹی کا دودھ

صاحب! مقامی کالج میں بی اے پنجابی کے پرچے پر اعلانیہ بوٹی مافیا نے پانچ سو روپے فی سوال ریٹ کا اعلان کیا تو ہمیں بہت دکھ ہوا۔ ہم جانتے ہیں سوالات کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے پھر بھی ہم سمجھتے ہیں یہ طلبہ سے زیادہ پنجابی زبان کے ساتھ زیادتی ہے کہ اسی سینٹر پر انگریزی کے پرچے میں فی سوال نقل کرانے کا ریٹ دو تین ہزار روپے رہا تو پنجابی کو اتنی سستی زبان کیوں سمجھا گیا اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ انگریزی میڈ ان انگلینڈ ہے اور پنجابی یہاں کی بنی ہوئی ہے۔ انگلینڈ میں انگریزی کا یہ حال ہے کہ جو کوئی وہاں گرامر کے حساب سے صحیح انگریزی بول رہا ہو تو فوراً پتا چل جاتا ہے کہ یہ مقامی نہیں۔

ہم زبانوں کے بارے میں اتنا ہی علم رکھتے ہیں کہ ہمیں علم ہے لاہور میں سری پائے کی دکان پر اعلیٰ زبان ملتی ہے۔ ویسے دنیا میں دو ہی بڑی زبانیں ہیں ایک خواتین کی اور دوسری مردوں کی بہ حیثیت پاکستانی ہم سمجھتے ہیں کہ بندے کے منہ میں اپنی زبان ہونی چاہیے کسی اور کی زبان ہونا ویسے بھی فحاشی کے زمرے میں آتا ہے اس کے باوجود ہر منہ میں کسی انگریز کی زبان ملتی ہے۔ صاحب! ہمارے لوگ تو فقرے کے آخر میں جی بھی کہیں تو لہجہ ایسا ہوگا کہ جیسے یہ جی انگریزی کا ہے۔ انگریزی سے ہمیں چھٹی کا دودھ یاد آگیا جس پر ہم نے چھٹی جماعت میں دودھ دوہنے کی انگریزی واشنگ ملک لکھی تو ٹیچر نے کہا۔

"بڑی غلط زبان لکھی ہے۔" تب سے ہم انگریزی غلط زبان سمجھتے ہیں۔
ڈاکٹر یونس بٹ کی کتاب "جوک در جوک" سے اقتباس
صبا سحر۔ ہارون آباد

یادیں

یہی مشکل ہے کہ بھول جانا انسان کے بس میں نہیں جو حادثہ ایک دفعہ گزر جائے وہ یاد بن کے بار بار گزرتا ہے۔ بھولنے کی کوشش ہی اسے زندہ رکھتی ہے۔ انسان ظالم کو تو معاف کرسکتا ہے لیکن اس کے ظلم کو نہیں بھول سکتا۔ بھول جانا انسان کے اختیار میں نہیں۔ موسم گزر جاتے ہیں لیکن یاد نہیں گزرتی۔ مرحوم زمانوں کی یاد مرحوم نہیں ہوتی۔ پرانے چہرے نئے چہروں میں نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پرانے غم نئے غم میں شامل نظر آتے ہیں۔ پرانی یادیں نئی زندگی کے ساتھ چلتی ہیں۔ تہہ در تہہ یاد انسان کے اندر ہمیشہ محفوظ رہتی ہے۔ یاد سے نجات کی کوشش، دلدل سے نجات کی کوشش کی طرح رائیگاں جاتی ہے۔
واصف علی واصف کی کتاب "دل دریا سمندر" سے اقتباس
عانیہ نیازی۔ ربوہ

اس ماہ کا افسانچہ

وہ آج پھر میرے کمرے میں آ گیا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ میری گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے مجھ پر ذرا بھی تو رحم نہیں آتا تھا۔ پہلے بھی کئی مرتبہ اس نے مجھے چھیڑنے کی کوشش کی تھی مگر اب اس کی حرکات بدتمیزی کی حدوں کو چھونے لگی تھیں۔ اس کی بھونڈی اور سیاہ شکل سے تو میں پہلے ہی خائف رہتی تھی۔ بھائی جان نے مجھے کافی سمجھایا کہ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا مگر آج تو بھائی جان بھی دوسرے شہر گئے ہوئے تھے اور میں تنہا گھبرا رہی تھی۔ وہ مختلف زاویوں اور انداز سے میرے قریب آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یکا یک میری سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں اور اس کی دبی دبی سرگوشیاں بھی میرے قریب آنے لگیں۔ نہ جانے وہ اپنی زبان میں مجھے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر مجھ پر تو ہسٹریا کی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک وہ میرے قریب تر ہو گیا اور میرے چہرے سے اس کا چہرہ بھی ٹکرا گیا۔ جواب میں، میں نے منہ پھیر لیا لیکن میں اب پہلے جیسی بزدل بھی نہیں رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ اس کا ناپاک وجود میرے جسم سے ٹکراتا اور وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھتا میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب کی ایک زوردار ضرب سے اس بدتمیز "مچھر" کو ٹھکانے لگا دیا۔

......

اس ماہ کی ہری مرچیں

☆ دودھ زمین پر گر جائے تو اس سے مٹی نکال دیں، دودھ قابل استعمال ہو جائے گا۔
☆ اگر آپ کے سفید سوٹ پر داغ لگ جائے تو اسے پہننا چھوڑ دیں۔ داغ کسی کو نظر نہیں آئے گا۔
☆ چینی ہمیشہ نمک والے ڈبے میں رکھیں اس طرح وہ چیونٹیوں سے محفوظ رہے گی۔
☆ نت نئی بیماریوں سے بچنے کے لیے برف ہمیشہ ابال کر استعمال کریں۔
☆ اگر آپ کپڑوں میں زیادہ سفیدی چاہتے ہیں تو صابن کو واشنگ پاؤڈر میں دھو کر استعمال کریں۔

ثناء ملک۔ کراچی

اس ماہ کی کرنیں

ضروریات کو کم کرلینا سب سے بڑی مالداری ہے۔

سچائی کبھی اپنی تلاش کرنے والوں کو ذلیل نہیں ہونے دیتی۔

جو شخص تمہارے سامنے دوسروں کی برائی کرتا ہے۔ جان لو کہ وہ تمہاری برائی دوسروں کے سامنے کرتا ہے۔

جاہل کے خیال اور عمل میں بہت کم وقفہ ہوتا ہے۔

جو لوگ صبح کو فیصلے کرتے اور شام کو بھول جاتے ہیں وہ زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

جس شخص کے خیالات اور نظریات اچھے ہوں وہ کبھی تنہا نہیں ہوتا۔

زیادہ خوش حالی اور زیادہ بدحالی دونوں برائی کی طرف لے جاتی ہیں۔

زندگی کو سادہ مگر خیالات کو بلند رکھو۔

انسان کو باد صبا کی طرح ہونا چاہیے کہ ہر کوئی اس کے آنے کا انتظار کرے۔

عقل سے کائنات تسخیر ہوتی ہے لیکن لامکاں تک پہنچنے کے لیے عشق کی ضرورت ہوتی ہے۔

احتیاط، دانشمندی کی ہونہار اولاد ہے۔

کوئی شخص تمہاری پیٹھ پر سواری نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ جھکی ہوئی نہ ہو۔

تنہائی میں اپنے خیالات پر اور محفل میں اپنی زبان پر قابو رکھو۔

علم کی محبت اور استاد کی عزت کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

رشتے خون کے ہی نہیں احساس کے بھی ہوتے ہیں اگر احساس ہو تو اجنبی بھی اپنے اور اگر احساس نہ ہو تو اپنے بھی بیگانے ہو جاتے ہیں۔

نوشین مدثر۔ لاہور

اس ماہ آپ کی الجھن...... ہماری سلجھن!

☆ میں جب بھی ہوائی جہاز کا سفر کروں تو مجھے چکر آتے ہیں، متلی ہونے لگتی ہے۔ میرا مسئلہ حل کریں۔ (اڑن چھو۔ ہوائی پور)

☆ نیند کی گولی لے کر ہوائی جہاز کا سفر کریں۔ دوران سفر اگر آنکھ کھل جائے تو ہوائی جہاز سے چھلانگ لگا دیں پھر کبھی چکر نہیں آئیں گے۔

☆ میرا ہر وقت میری ساس سے جھگڑا رہتا ہے۔ میں ہر روز کی تو تو میں میں سے تنگ آچکی ہوں، مجھے حل بتائیں۔ (نئی بہو۔ گجر خان)

☆ آپ کو یہ تعویذ ارسال کیا گیا ہے۔ جب بھی ساس جھگڑا شروع کرے آپ اسے اپنے دانتوں کے نیچے دبا لیں۔ ساس خود بخود دو تین دنوں تک لڑنا بند کر دے گی۔ (جب آپ بول ہی نہ سکیں گی تو تو میں میں نہ ہوگی)۔

☆ میں ایک لڑکی کو پسند کرتا ہوں، کیا میری شادی اس سے ہوگی اور شادی کامیاب رہے گی۔ (آوارہ عاشق۔ محبت آباد)

☆ مطلوبہ جگہ شادی کا امکان بالکل نہیں ہے۔ شادی کا امکان وہاں ہے جہاں اوپر والے نے لکھی ہے۔ زیادہ فکر مند نہ ہوں۔ بیوی کے غلام بن جائیں گے تو کامیاب رہیں گے۔

☆ میں نے اس سال بی اے کا امتحان دیا ہے کیا میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ (بلو۔ جی ٹی روڈ)

☆ اگر آپ نے دل لگا کر پڑھا ہے "کتابوں کو" تو کامیاب ہو جائیں گی اور اگر صفائی پسند ہیں، پیپر صاف دے آئی ہیں تو اس کا انحصار اب آپ کی جیب پر ہے۔ جتنی رشوت کھلا

دیں، اتنی ڈویژن ہائی ہو گی۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

اس ماہ کے لیے نظم

اس سمت چلے ہو تو اتنا اسے کہنا
اب کوئی نہیں حرفِ تمنا اسے کہنا
دنیا تو کسی حال میں جینے نہیں دیتی
چاہت نہیں ہوتی رسوا اسے کہنا
اس نے ہی کہا تھا تو یقین میں نے کیا تھا
امید پہ قائم ہے دنیا اسے کہنا
زرخیز زمینیں کبھی بنجر نہیں ہوتیں
دریا ہی بدل لیتے ہیں راستے اسے کہنا
کچھ لوگ سفر کے لیے موزوں نہیں ہوتے
کچھ راستے کٹتے نہیں تنہا، اسے کہنا

سیدہ فرزین حبیب۔ کراچی

اس ماہ کے اقوال

☆ اللہ کو وہ اچھا عمل پسند ہے جو ہمیشہ ہو اگرچہ تھوڑا ہو۔

☆ پھول اپنی خوشبو اور انسان اپنی خوشی نہیں چھپا سکتا۔

☆ کردار ایسا ہونا چاہیے کہ پتھر بھی موم ہو جائے۔

☆ ناامید کبھی مت ہو کہ اس سے زندگی کم ہو جاتی ہے۔

☆ ماں غریب ہو کر بھی اولاد کو پال سکتی ہے جب کہ باپ امیر ہو کے بھی پرورش نہیں کر سکتا۔

☆ اونٹ صحرا کی طرف بھاگتا ہے۔ یعنی ہر شے اپنے اصل کی طرف رجوع کرتی ہے۔

☆ درزی کی سوئی کبھی ٹاٹ اور کبھی مخمل میں۔ مطلب انسان کو برا بھلا سب پیش آتا ہے۔

☆ ہر گمشدہ چیز وہیں سے ملتی ہے جہاں کھوئی ہو۔

فرزانہ شوکت۔ کراچی

اس ماہ کی اہم معلومات

ادرک پٹھوں کے درد میں مفید ہے۔ امریکہ میں کی جانے والی حالیہ تحقیق کے مطابق ادرک کا استعمال ورزش کرنے کے بعد پٹھوں میں ہونے والے درد کو کم کر دیتا ہے۔ اس نئی ریسرچ میں بتایا گیا ہے کہ ہر روز ادرک کی تھوڑی سی مقدار کھا لینے سے پٹھوں کا درد کا کھینچاؤ کم ہو جاتا ہے کیونکہ ادرک میں درد کو ختم کرنے کی قدرتی صلاحیت موجود ہے جو خاص طور پر ان لوگوں کے لیے مفید ہے جنہیں سخت ورزش کرنے کے بعد مسلسل پٹھوں میں درد رہتا ہے۔ ادرک ایک شافی علاج ہے۔ اسے صدیوں سے مختلف بیماریوں جیسا کہ متلی، قے، کھانسی، ٹھنڈ لگنا، معدے کی بیماریوں اور یرقان وغیرہ کے تدارک میں استعمال کیا جاتا ہے۔ سائنسدانوں نے اپنے اس نئے تجربے میں 76 رضا کار شاگردوں کے ساتھ کام کیا ہے جنہیں تین گروپوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے گروپ کو دو گرام کچی ادرک کھانے کو دی گئی جب کہ دوسرے گروپ کو اتنی ہی مقدار میں پکی ہوئی ادرک کھانے کے لیے دی گئی اور تیسرے گروپ کو Tablet, Placabo دی گئی۔ نتائج کے مطابق کچی اور پکی ادرک کا استعمال کرنے والے گروپ میں درد کم ہونے کا تناسب تیسرے گروپ کے مقابلے میں 25 سے 23 فیصد تھا اس کے علاوہ حالیہ ریسرچ کے مطابق ادرک کا باقاعدہ استعمال آنکھ کے موتیا اور ذیابیطس کو بڑھنے سے روکتا ہے۔ بڑھنے کے عمل کو سست کرتا ہے۔

ریما نور رضوان۔ کراچی

......☆......

نورین ملک



حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ محترمہ حضرت زینب ثقفیہؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔

''کیا میری جانب سے اپنے خاوند پر اور اپنے زیر کفالت یتیموں پر خرچ کرنا صدقے کے طور پر کافی ہوسکتا ہے؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔''اس خاتون کو دو ثواب ملیں گے، صدقہ کرنے کا ثواب اور رشتے داروں سے نیکی کا ثواب۔''

فوائد و مسائل: اقارب اگر امداد کے مستحق ہوں تو ان کی مالی امداد کا ثواب دوسروں کو صدقہ دینے سے زیادہ ہے۔

سیدہ نورین۔ کراچی

صدقہ

جب انسان اپنے ہاتھ سے صدقہ دیتا ہے تو صدقہ پانچ باتیں کہتا ہے میں فانی مال تھا تو نے مجھے بقا دے دی۔ میں تیرا دشمن تھا لیکن تو نے اب مجھے دوست بنالیا ہے۔ آج سے پہلے تو میری حفاظت کرتا تھا لیکن آج سے میں تیری حفاظت کروں گا۔ میں حقیر تھا تو نے مجھے عظیم بنادیا۔ پہلے میں تیرے ہاتھ میں تھا اب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوں۔

عانیہ نیازی۔ ربوہ

اقوال زریں

☆ غصہ حماقت سے شروع ہوتا ہے اور ندامت پر ختم ہوتا ہے۔

☆ سب سے بڑا بزدل وہ ہے جو موت سے ڈرتا ہے۔

☆ ناامید ہونے سے عمر گھٹتی ہے۔

☆ عادت طبیعت کو ضعیف کردیتی ہے اور اس کے خلاف کام کرتی ہے۔

☆ جو بات معلوم نہ ہو اس کے اظہار میں شرم نہیں کرنی چاہیے۔

☆ مہمان کے واسطے زیادہ خرچ کرو کیونکہ یہ اسراف میں سے نہیں۔

☆ کم کھانا بیماریوں کا علاج ہے اور شکم سیری بیماری کی جڑ ہے۔

☆ تمہارے واسطے خیر یہی ہے کہ شر سے باز رہو۔

ثناء ملک۔ کراچی

آنسو

نہ جانے وہ آنسو کسی کے نام کے ہیں کہ جب میں خوش ہوں، تنہا ہوں، تب بھی آجاتے ہیں اور سج دھج کر آئینے میں اپنے آپ کو سراہتے سے دیکھوں تب بھی آجاتے ہیں اور جب گزرتے وقت کی لکیریں اپنے خدوخال میں محسوس کرتے

وقت اداس ہوں تب بھی آدھمکتے ہیں کسی خوشگوار یاد سے کچھ مانوس جملے یاد آجائیں تو پھر یہ آجائے۔ وقت تو گزرتا ہی رہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عمر بھی نئے دوست بھی بن جاتے ہیں ہم ان کے ساتھ خوش بہت رہتے ہیں مگر جب کبھی پرانے دوست اور ان کی یادیں ستاتی ہیں تو یہ آنسو بھی بھرپور ساتھ دیتے ہیں۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جن سے کچھ تلخ یادیں وابستہ ہیں آنسو ان کا سوگ بھی مناتے ہیں۔ تنگ آکر میں نے ان آنسوؤں سے پوچھا۔ ”اب کیوں چلے آئے، میں دکھی تو نہیں۔ میں تو غصے میں ہوں۔ تو پتا ہے ان آنسوؤں نے کیا کہا؟ بولے اے نادان لڑکی ہم ان تلخ یادوں میں تیرا ساتھ دینے نہیں آئے جن پر تو غصہ ہے ہم تو اس غصے میں آئے ہیں کہ تو نے کن بے اعتبار اور کم فہم کم ظرفوں کو باوفا سمجھا۔ اعتبار کے قابل سمجھا اور انہوں نے تیرے سونے جیسے جذبے ضائع کیے اور تجھے بھی ان کے لیے نہ کبھی تو اہم تھی نہ تیرے آنسو تو نے اپنے ساتھ ہمیں بھی بے وقعت کیا۔“ اپنے آنسوؤں نے میرا بھرپور ساتھ دیا اور جیسے دل کا سارا درد مٹ گیا۔

دھنک ناز۔ کراچی

اذان اور موذن کی فضیلت

اذان واقامت بظاہر نماز کے وقت کا اعلان اور نماز کا بلاوہ ہے لیکن اگر ہم ذرا غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اذان میں اللہ تعالیٰ نے ایسے جامع اور بنیادی کلمات حکم فرمائے ہیں جو دین کی بنیادی اصولوں کی تعلیم اور دعوت اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ اذان واقامت انتہائی تبلیغ اور موثر دعوت ہے جو ہماری ہر مسجد سے روزانہ پانچ وقت دی جاتی ہے۔ ہر مسلمان کو اذان کے معنی یاد ہونے چاہئیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان واقامت کی ادائیگی سے متعلق کئی احکام ہمیں دیئے ہیں۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم اذان دو تو آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر دیا کرو (یعنی ہر کلمہ پہ سانس توڑ دو اور وقفہ کیا کرو) اور جب اقامت کہو تو رواں کہا کرو اور اپنی اذان اور اقامت کے درمیان اتنا فاصلہ کیا کرو کہ جو شخص کھانے میں مشغول ہے وہ فارغ ہو جائے اور جس کو استنجے کا تقاضا ہے وہ جا کر اپنی ضرورت سے فارغ ہو جائے اور کھڑے نہ ہوا کرو جب تک مجھے نہ دیکھ لو حضرت زید بن حارثؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ فجر کی نماز کے وقت رسولؐ نے مجھے حکم دیا کہ تم اذان پڑھو میں نے اذان پڑھی اس کے بعد جب اقامت کہنے کا وقت آیا تو حضرت بلالؓ نے ارادہ کیا کہ اقامت وہ کہیں تو حضور نے (پرے متعلق) فرمایا کہ اس صدائی نے اذان پڑھی ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ جو اذان پڑھے وہی اقامت کہے جب موذن اذان دیتا ہے اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی کبریائی، توحید اور رسول کی رسالت اور دعوت کا اعلان کرتا ہے تو انسان کے علاوہ جن اور دیگر مخلوقات بھی اس کو سنتی ہیں اور یہ سب مخلوق قیامت کے دن اس کے حق میں شہادت دے گی۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول کریم سے سنا شیطان نماز کی پکار یعنی اذان سنتا ہے تو مقام روحا (روحا مدینے سے 34 میل دور ہے) کے برابر دور چلا جاتا ہے۔ ہمارے دلوں

میں اذان کی بس اتنی اہمیت ہے اگر دوران اذان گانا بج رہا ہو تو اس کی آواز آہستہ کر دیتے ہیں عورتیں اپنے سروں پر کپڑا ڈال لیتی ہیں اور بس اذان دینے والے موذن کی حیثیت ہمارے معاشرے میں ایک معمولی تنخواہ دار ملازم سے زیادہ نہیں ہے ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جن کے دلوں میں اذان اور موذن کا احترام ہے ہمارے پیارے نبیؐ نے موذن کی بہت فضیلت بیان کی ہے جس کا اندازہ درج ذیل احادیث سے لگایا جاتا ہے۔

حضرت معاویہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسولؐ خدا سے خود سنا ہے آپ فرماتے ہیں اذان کہنے والے قیامت کے دن دوسرے سب لوگوں کے مقابلے میں دراز گردن یعنی سر بلند ہوں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریمؐ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن تین قسم کے آدمی مشک کے ٹیلوں پر ٹھہرائے جائیں گے ایک وہ نیک غلام جس نے دنیا میں اللہ کا حق بھی ادا کیا اور اپنے آقا کا بھی، دوسرا وہ آدمی جو کسی جماعت کا امام بنا اور لوگ اس کی نیک عملی اور پاکیزہ سیرت کی وجہ سے اس سے راضی اور خوش رہے اور تیسرے وہ جو دن راتوں کی پانچوں نمازوں کے لیے اذان دیا کرتا تھا۔ رسول کریمؐ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے جس بندے نے سات سال تک اللہ کے واسطے ثواب کی نیت سے اذان دی اس کے لیے آتش دوزخ سے برائت لکھ دی جاتی ہے یعنی اس کے لیے اللہ کی طرف سے یہ طے فرما دیا جاتا ہے کہ دوزخ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں اور اس کی آگ اور لپٹ کو اس بندے کو چھونے کی اجازت نہیں۔ اسلام میں موذن کی اتنی اہمیت ہے کہ رسولؐ خدا نے نہ صرف موذن کی اہمیت اور فضیلت بیان فرمائی بلکہ ان کے لیے دعا بھی فرمائی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: امام ذمہ دار موذن پر بھروسہ کیا جاتا ہے اے اللہ اماموں کی رہنمائی فرما اور موذنوں کی مغفرت فرما۔

امام کے ذمہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ امام پر اپنی نماز کے ساتھ ساتھ تمام مقتدیوں کی نمازوں کی بھی ذمہ داری ہے موذن پر بھروسہ سے مراد یہ ہے کہ لوگوں نے نماز اور روزوں کے اوقات کے بارے میں اس پر اعتماد کیا ہے چونکہ موذن سے بعض اوقات غلطی ہو جاتی ہے اس لیے نبی کریمؐ نے ان کے لیے دعا فرمائی ہے۔

ارشاد نبویؐ ہے اگر لوگوں کو اذان اور پہلی صف کا ثواب معلوم ہو جاتا تو انہیں اذان اور پہلی صف قرعہ اندازی کے بغیر حاصل نہ ہوتی اور وہ ضرور قرعہ اندازی کرتے۔ صحابہ کرام موذن کی اہمیت و فضیلت جانتے تھے اور اس لیے چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جس اجر و ثواب کا وعدہ موذن کے لیے کیا ہے وہ اجر ثواب کسی طرح ہمیں مل جائے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ اذان کہنے والے ہم سے اجر و ثواب میں بڑھے ہوئے ہیں کیا کوئی ایسا عمل ہے کہ ہمیں بھی اذان دینے والی فضیلت مل جائے؟

رسول کریمؐ نے ارشاد فرمایا: وہی کلمات کہا کرو جو موذن کہتے ہیں یعنی اذان کا جواب دینے والا وہی الفاظ دہرائے جو موذن نے کہے پھر جب تم اذان کا جواب دے چکو تو دعا مانگو جو مانگو

گے دیا جائے گا۔

ملک جواد نواز قریشی۔ ڈیرہ اسماعیل خان

وقت کا کیا کہنا......!

☆ جو وقت ہاتھ سے نکل جائے وہ دوبارہ نہیں آتا اس لیے وقت کی اہمیت جانو۔

☆ گزرے ہوئے مشکل وقت کو بھول جانا ہی بہادر لوگوں کی پہچان ہے۔

☆ وقت بے وقت زیادہ باتیں کرنا اچھی بات نہیں، وقت کی مناسبت سے اچھی بات زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔

☆ وقت کے ساتھ جتنا تیز بھاگو گے اتنا ہی جلدی تھک جاؤ گے۔

☆ جب وقت ہاتھ سے نکل جائے تو اس کی قدر و اہمیت بعد میں ہوتی ہے۔

☆ اچھے وقت کی امید رکھو اور اچھا وقت آنے کا انتظار کرو۔

☆ اعتدال کی زندگی بسر کرنے والے کبھی وقت کی ناقدری کا رونا نہیں روتے۔

☆ جب ہم وقت کا درست استعمال بھول جاتے ہیں تو زندگی ہر وقت بدنظمی کا شکار ہو جاتی ہے۔

☆ وقت اپنا ہے مگر تخت اپنا نہیں۔ وقت کا صحیح استعمال کریں تو وقت میں برکت رہے گی۔

☆ ہر انسان کے لیے اس دنیا میں مخصوص وقت مقرر ہے۔ ہر انسان نے اپنا اپنا وقت پورا ہونے پر دنیا سے لوٹ جانا ہے۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

قسم کے بہروپ

آپ اتنی دور ہیں
جتنی دور آسمان کے تارے
اپنے اتنے قریب ہیں
جتنے میری آنکھ کے تارے ہیں

روشن کرن

خواہشیں بکھرنے کا
دکھ اسی لیے نہ تھا کہ
چاند اپنے پر پھیلائے
اِک روشن کرن کا
راستہ دکھا رہا تھا

خواب

خواہشیں ہنس دیں
خواب سج جائیں
تمہیں جو ہنستا دیکھوں
میرے سبھی دکھ مر جائیں

فرزانہ شوکت۔ کراچی

پٹھان

ایک پٹھان بادام بیچ رہا تھا۔ سردار نے پوچھا: ''یہ کھانے سے کیا ہوتا ہے؟''

پٹھان بولا: ''دماغ تیز ہوتا ہے۔''

سردار بولا: ''کیسے؟''

پٹھان بولا: ''اچھا بتاؤ ایک کلو چاول میں کتنے دانے ہوتے ہیں؟''

سردار بولا: ''پتا نہیں۔''

پٹھان نے سردار کو بادام کھلایا اور بولا۔ ''اب بتاؤ ایک درجن میں کتنے آم ہوتے ہیں۔''

سردار بولا: ''12۔''

پٹھان بولا: ''دیکھو ہو گیا ناں دماغ تیز۔''

سردار بولا۔ ''یار جلدی سے دو کلو بادام دے یہ تو بہت کام کی چیز ہے۔''

ریما نور رضوان۔ کراچی

......☆......

ذرا اپنی سن کہنا

نظم

عشق محبت پر کوئی زور نہیں
یہ کھیل سب قسمت والے ہیں
کسی کی جھولی عشق سے پُر
کسی دل میں غم کے ڈیرے ہیں
کسی دل میں محبوب گھر کیے
کسی دل میں دکھ کے ڈھیر لگے
نہ کوئی جانے دل میں کیا چھپا
لگتے سب نظر کے دھوکے ہیں
کوئی چال چلے جب قسمت کبھی
ایک لمحے میں سب کچھ ڈھیر کیے
کیسے وعدے تھے جو عشق میں کیے
کون سی قسمیں وعدے سب بھولے
یہ کیسے کھیل ہیں عشق کے
کہ قسمت جن پر وار کیے
کبھی دل الجھے، کبھی ذہن کہے!

مریم ماہ منیر

چھپا دکھ

وقت کے کیلنڈر سے کتنے ہی
برس ماضی کے سمندر
میں گرے اور
ڈوب گئے
مگر میرے صحیفہ دل پہ نقش ہے

ابھی تک وہی منظر
جہاں سے ہماری سمتیں بدلیں تھیں
جہاں وہ میرے مقدر کا ستارا ڈوبا تھا
تیری کج ادائی نے جو زخم لگایا
ماہ وسال کی گردش سے وہ
ناسور کا روپ دھار چکا ہے
جس سے محبت کا زہر ٹپک کر
میری روح کو زہر آلودہ کر رہا ہے
میری اندر کی ساری خواہشیں مر چکی ہیں
میرا دل ایک شکستہ حال جزیرہ بن چکا ہے
جہاں خوشی کا کوئی پھول نہیں کھلتا
جہاں صرف ببول اگتے ہیں
جس کی چبھن سے میری روح پہ
آبلے پڑ چکے ہیں
خود سے بچھڑے ہوئے مجھے ایک
عرصہ بیت چکا ہے
میرا شکستہ پا وجود ایک ایسا کھنڈر
بن گیا ہے جہاں
عرصے سے صرف تیری یادوں کی
چمگادڑوں نے بسیرا کیا ہوا ہے

شہلا گل سحر

نظم

تم جانتے ہو کہ!
میں اس قدر اداس کیوں ہوں

میرے اندر ہے کیوں
اتنی خاموشی
میری زندگی کی
حالت کیوں ہے
ایسی جیسے
لہروں سے ساحل کی
میں اس قدر کیوں
ہوں تنہا
تم جاننا چاہتے ہو تو سنو
اس کی وجہ
اس کا سبب تم ہو
اب بتاؤ تم کیسے ہو؟

سیدہ نور الصباعلی

غزل

میں نے کوئی سورج کوئی تارا نہیں دیکھا
کس رنگ کا ہوتا ہے، اجالا نہیں دیکھا
سنتے ہیں کہ اپنے ہی تھے گھر لوٹنے والے
اچھا ہوا میں نے یہ تماشا نہیں دیکھا
حالانکہ مجھے سنورنے کا شوق بہت ہے
اور میں نے کبھی اپنا ہی چہرہ نہیں دیکھا
ہے میری سماعت میں نگاہوں کا اثر بھی
کیا تم نے یہ قدرت کا کرشمہ نہیں دیکھا
یہ شہر صداقت بھی عجب شہر ہے امتیاز
میں نے یہاں اک شخص بھی سچا نہیں دیکھا

ایس امتیاز احمد

غزل

پھول سی لڑکی جب اپنے روبرو ہونے لگی
آئینے سے دیر تک پھر گفتگو ہونے لگی
خواب تیرے پیار کے بننے لگیں آنکھیں مری
جب جواں اس دل میں تیری آرزو ہونے لگی

روشنی اور تیرگی کے درمیاں پھر ٹھن گئی
جب چراغوں سے ہوا کی گفتگو ہونے لگی
دو دلوں کے درمیان پھر فاصلہ بڑھنے لگا
جب انا کے مسئلے پر گفتگو ہونے لگی
ناامیدی کا تصور دل پہ غالب آگیا
رائیگاں آخر ہماری جستجو ہونے لگی
میری آنکھوں میں اچانک آگیا چہرہ ترا
خوب سے جب خوب تر کی جستجو ہونے لگی
جب کسی کی بے وفائی بڑھ گئی حد سے حکیم
رات بھر دیوار و در سے گفتگو ہونے لگی

حکیم خان حکیم

سرد ہوا

گرم لحاف کے اندر آتی سرد ہوا
کن خوابوں کو، کن سوچوں کو کن باتوں کو
کن لمحوں کو کن باتوں کو
برف سا ٹھنڈا کر دیتی ہے
جب میری تھکتی سوچوں کو
جو تیرے خیال کے شانے پر سر دھر دیتی ہے
تو گرم لحاف کے اندر آتی سرد ہوا
سب کچھ برف سا کر دیتی ہے

فرزانہ شوکت

غزل

وفا کی راہ بڑی پُر خار لگتی ہے
زیست آنسوؤں کی دیوار لگتی ہے
میں نے چاہا نہیں تھا پھر سے کسی کو
ہر سوچ اپنی غمگسار لگتی ہے
زندگی ڈھل گئی پھر غم کے سانچے میں
تیری ہر خوشی ہمیں یادگار لگتی ہے
جا کے کوئی نہیں آتا پھر زمانے میں
تیری یاد بھی اب تو پُر نور لگتی ہے

کسی سے جب ملاقات ہوئی ہے جاوید
اس کی ہر بات پھر ہمیں تلوار لگتی ہے
محمد اسلم جاوید

غزل

ان سے بھی کرتی ہے دنیا بے وفائی کا گلہ
جو نبھاتے آرہے ہیں آج تک عہدِ وفا
جو کبھی پڑتے نہیں ہیں امتحانِ عشق میں
ہو نہیں سکتے کبھی رنج و الم سے آشنا
گامزن رہتے ہیں جو ساری تھکن کو بھول کر
سہل ہو جاتا ہے ان پر منزلوں کا راستہ
غیر کا شکوہ کسی بھی طور کر سکتا نہیں
اپنے لوگوں نے مجھے بخشا ہے مرضِ لادوا
ایک ویرانا سا ہے حدِ نظر تک دوستو
نہ کہیں صحنِ چمن ہے نہ کہیں موجِ صبا
دھوپ کی چادر تنی ہے دور تک سایہ نہیں
ہے پریشاں جس کے ہاتھوں میں ہے پتلا موم کا
کیا کسر باقی رہے برباد ہونے میں قمر
کشتیوں کو جب ڈبونے پر تلا ہو ناخدا
ریاض حسین قمر

غزل

سنو میرے پاس وفا نہیں
محبت کی مجھے صدا نہیں
دلوں سے کھیلنا میرا مشغلہ
دیتا مجھے کوئی سزا نہیں
دن رات ایک جیسے ہیں میرے
روزگار کا کوئی سلسلہ نہیں
آوارگی میری پہچان ہے اب
مستقبل کا کچھ پتا نہیں
ڈگری دیکھ کر سوچتا ہوں
اس کا کوئی فائدہ نہیں

بے مقصد زندگی بے بسی بے قراری
دکھائی دیتا کوئی راستہ نہیں
اسکول کالج کیمپس اپنی جگہ ہیں ساتھی
مگر میں کہیں کا رہا نہیں
ساتھی زبیر پنہیار

کُن

عجب
ہو
اگر
میرا
رب
کُن
کہہ کر
تمہیں میرا کر دے
سیدہ موں بخاری

غزل

محبت میں آنسو ہو گیا کوئی
لہروں کی طرح بکھر گیا کوئی
اشارہ دیجیے ابھی ہیں یہ آنکھیں کھلی
پنچھی کے پنجرے سے اڑ گیا کوئی
محبت کے ہاتھ کچھ یوں معاملہ رہا
بازی ہوئی کسی کی اور جیت گیا کوئی
اس کے لیے تو فقط ایک تھپڑ تھا
مگر اندر تک ٹوٹ گیا کوئی
پلکیں اٹھا کے دیکھا جو مجھے اس نے
خنجر بھی نہیں چلا اور قتل ہو گیا کوئی
اس کے چہرے پہ لکھی تھی داستانِ غم عامر
لگتا تھا ساتھ اس کے گزرا ہے حادثہ کوئی
عامر عزیز

......☆......

سندیسے

ماریہ یاسر ــــــ کراچی

آداب عرض ہے۔ سندیسے کی محفل کی رونق بڑھانے کے لیے ماریہ یاسر پھر سے حاضر خدمت ہے۔ ردا کا ساتھ ہو تو یہ سفر بھی گزر ہی جاتا ہے۔ ردا نوجوان نسل کی لڑکیوں کے مشکل حالات میں ان کا ساتھ دیتا ہے جب جب وہ پریشان ہوتی ہیں انہیں حوصلہ اور ہمت دیتا ہے۔ اس میں لکھنے والی تمام ہی رائٹرز کمال کا لکھتی ہیں جنہیں پڑھ کے ہم نے بہت کچھ سیکھا۔ اس ماہ کے ردا پر نظر ڈالی تو سرورق نہایت ڈیسنٹ سا اور سردیوں کے لحاظ سے موزوں لگا۔ ماڈل میری ہم نام نکلی۔ دو تین منٹ تو اس کے بالوں میں ہی کھوئی رہی (اپنے بال گر گر کے آدھے جو رہ گئے) حسرت سے ایک آخری نظر بالوں پر ڈالتے ہوئے آگے بڑھی تو ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ افسانے کی اتنی لمبی لسٹ میرے خیال میں یہ رواں سال کی سب سے لمبی افسانوں کی لسٹ ثابت ہوگی۔ فریدہ فرید، سیدہ فرزانہ اور صالحہ آپی کے نام دیکھ کے دل خوش ہو گیا۔ سعدیہ اقبال، زینب ملک، رابعہ افضال، ریمل آرزو اور باقی سب نے اچھا لکھا۔ عائشہ ذوالفقار کے تو کیا کہنے۔ ویسے عائشہ جی یہ آپ کا پہلا سلسلے وار ناول ہے کیا۔ بہت زبردست لکھ رہی ہیں آپ۔ ناولٹ دونوں ہی اچھے تھے۔ میری شاعری کیسی لگی یہ بھی سندیسے میں بتایئے گا۔ اس ماہ کی ہری مرچیں میں نوشین جی کا Last والا زبردست تھا خراب موڈ میں پڑھنے کے باوجود ہنسی آ گئی۔ اب جاتے جاتے سب کا شکریہ جو میرے ادھورے سے لفظوں کو پسند کرتے ہیں اور صبا جی پسندیدگی پر شکریہ تو بنتا ہے ناں آخر آپ لوگ میرا سیروں خون جو بڑھاتے ہیں۔ رابعہ جی آپ کا بھی شکریہ۔ اب اجازت، اللہ حافظ۔“

افشاں علی ــــــ کراچی

ڈھیر ساری محبتوں، نیک تمناؤں، پرخلوص دعاؤں کے ہمراہ ردا کی تمام پیاری قارئین و شہزادیوں پیارے سے دل کی مالک صالحہ اپیا اور خوب صورت آواز کی مالک نورین آپی کو افشاں علی کا خوب صورت سی مسکراہٹ و محبتوں کی خوشبو سے سجا سلام الفت قبول ہو۔ خوب صورت سے سرورق کے ساتھ فروری کا شمارہ ہاتھ کی زینت بنا۔ ماریہ رضوی من موہنی سی صورت لیے اپنے خوب صورت انداز و ڈریسنگ کے ساتھ سرورق پر چھائی نظر آئیں فہرست میں تو افسانوں کی بہار نظر آئی تو وہیں بابدولت کا نام بھی جھلملا رہا تھا (آہم) بہت بہت شکریہ آپی میرے ناول کو فروری کی زینت بنانے کے لیے بلاشبہ آج میرے قلم سے نکلا ہر لفظ آپ ہی کی مرہون منت پہچان و نام بناتا ہے۔ اس لیے آپ کے نرم لہجے اور بھرپور تعاون کی میں تہہ دل سے مشکور ہوں۔ اب بات ہو جائے خوب صورت سے فروری کے خوب صورت سے شمارے کی۔ شروعات ہمیشہ کی طرح ”گوشۂ آگہی“ سے کی خوب صورت لفظوں سے سجا گوشۂ آگہی منتظر ملا۔ سعید واثق

بھائی کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ شاعری بھی پسند آئی۔ فاطمہ خان ردا میں اچھا اضافہ ثابت ہو رہی ہیں۔ ''محبت جاوداں ہے'' خوب صورت نام ہی کی طرح خوب صورت تحریر بہت زبردست منظر کشی کی گئی۔ ''عنادل تمہاری ہوئی دل سے'' مکمل ناول بھی کافی پسند آیا۔ عائشہ ذوالفقار کے ناولٹ نے شروعات سے ہی اپنا اسیر بنایا ہوا ہے بہت خوب صورت ناول جارہا ہے۔ شازیہ جی آپ کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ ''میری خوشی کا آغاز تم ہو'' قرۃ العین سکندر نے بھی اچھا ناولٹ لکھا۔ اب آتے ہیں افسانوں کی طرف اس بار ایک سے بڑھ کر ایک افسانے شامل رہے سبھی افسانے بہت پسند آئے کچھ ایک تو کافی سبق آموز بھی تھے۔ یوم مجنوں، محبت کے دن ہزار، یہ ویلنٹائن کے عنوان پر تحریر تھی۔ وہیں سونیا چوہدری نے ویلنٹائن کی اصلیت بہت اچھے سے واضح کی۔ رابعہ فضال نے بھی افسانے میں اس محبت کے نام و نہاد دن کی اصلی شکل پیش کی۔ ثناء کنول، سیدہ فرزانہ حبیب اور اسویرہ علی کے افسانے دل کو چھو گئے۔ بہت ہی اچھا لکھا۔ فریدہ فرید اور فرح ناز رفیق سمیت مون شاہ آپ تینوں ایک الگ موضوع کے ساتھ حاضر ہوئیں آپ کی تحریریں بھی کافی منفرد تھیں۔ حمیرا قریشی، شہلا گل اور اقراء سیف نے مختصر پیرائے میں سبق آموز افسانہ لکھا۔ صالحہ آپی آپ کی تحریر ہو اور پسند نہ آئے ناممکن بہت انوکھی و دلچسپ تحریر تھی۔ ریمل آرزو، زینب ملک ندیم اور سعدیہ اقبال نے بھی کافی اچھا لکھا۔ الغرض اس بار کا ردا خوب سے خوب تر رہا۔ ردا کی ڈائری سے ریما نور رضوان، روشنی فاطمہ، ایم جے قریشی، مہرین کنول اور مصباح مسکان کی ڈائری پسند آئی۔ اشعار، اس ماہ میں اور خوشبو سبھی اچھا تھا جب کہ ''ذرا پھر سے کہنا'' میں سبھی کی شاعری چھائی رہی۔

''سندیسے'' میں عانیہ نیازی، صبا عبدالغنی، گیتی آراء، رابعہ افضال نے خوب رونق بڑھائی۔ صبا عبدالغنی کیا خوب و جامع تبصرہ لکھا۔ زبردست یار! دوستوں کے نام پیغام میں سب کے پیغام اچھے لگے اب ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ افشاں علی کو اجازت۔

سیدہ فرزین حبیب۔ کراچی

سوئیٹ سی صالحہ آپی، نورین جی اور قارئین کو پیار بھرا سلام۔ امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ سب سے پہلے آپ سب سے معذرت کہ کچھ ذاتی مصروفیات کی بنا پر سندیسے میں شامل نہ ہو سکی مگر اب اس بزم میں آپ سب کے ساتھ ہوں (افشاں ڈیئر اب تو شکایت دور ہوگئی ناں!)۔ اپنے فیورٹ ناول ''تیرے پیار کی خوشبو'' قمروش جی بہت ہی خوب صورت انداز میں ہر کردار کو سمیٹا مبارک باد قبول ہو۔ نورین ملک اور صالحہ آپی کا شکریہ جنہوں نے فون اور اپنے پیغام کے ذریعے مبارک باد اور پرخلوص دعاؤں سے نوازا اور ان تمام دوستوں کا شکریہ جنہوں نے زندگی کے اس حسین موقع پر ای میلز، کالز اور فیس بک کے ذریعے مبارک باد دی۔ دانیہ آفرین کا دل کی گہرائی سے شکریہ جو میری شادی میں شریک ہوئی۔

مصباح مسکان رؤف امینہ رؤف۔ جہلم

پیارے پاکستان اور اس میں بسنے والے سب پیارے پیارے لوگوں کو مصباح مسکان رؤف اور امینہ رؤف کا محبتوں چاہتوں بھرا السلام علیکم! تو جناب ہم سب خیریت سے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ سب بھی ٹھیک ٹھاک فٹ فاٹ ہوں گے۔ سب سے پہلے تو یہ بتاتے چلیں کہ ہمارا یعنی (مصباح) کا ایم اے اردو اللہ کے فضل و کرم سے مکمل ہو گیا ہے۔ خیر مبارک یہ سب اللہ کا کرم اور میرے سب پیاروں کی دعاؤں کا ثمر ہے۔ اللہ ان

سب کی دعائیں اور پیار ہمیشہ یونہی قائم و دائم رکھے، آمین۔ ردا ہمیں اتنا لیٹ ملتا ہے کہ اس کے آنے تک ردا میں حاضری کی ڈیٹ قریب آجاتی ہے۔ ہم چاہ کر بھی ہر ماہ ردا کی محفل میں حاضری نہیں دے پاتے لیکن خیر کوئی بات نہیں گزشتہ ماہ کے ناولز پر تبصرہ کر لیتے ہیں، جن میں سب سے پہلے نیا سلسلے وار ناول ہے جس کا انداز اور موضوع قدرے منفرد اور دلچسپ ہے۔ لگتا ہے کافی مزہ آنے والا ہے۔ آئندہ اقساط سے۔ وری گڈ عائشہ جی۔ فریدہ فرید جی آپ کی تو کیا ہی بات ہے۔ دل کو لگنے والے الفاظ و انداز۔ ماریہ یاسر، صالحہ آپی، سیدہ فرزانہ بہت اچھا لکھا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ ریما نور رضوان ہمیں اپنی فرینڈ لسٹ میں شامل کرنے کا بہت شکریہ جی۔ فریدہ فرید آپ کا بھی شکریہ کہ آپ نے ہمیں یاد رکھا۔ امید ہے انشاء اللہ جلد ہی حاضر خدمت ہوں گے۔ آپ کے خلوص و محبت کے ہم مشکور ہیں۔ اشعار، خوشبو، ردا کی ڈائری، اس ماہ میں اور ذرا پھر سے کہنا حسب معمول ایک سے بڑھ کر ایک۔ پیاری بہنوں کا پیارا انتخاب دل کو بھلا لگا۔ دلچسپ سندیسے پڑھ کر خوشی ہوئی بہت اچھا لگا۔ چلیں نیک تمناؤں اور ڈھیروں محبتوں کے ساتھ اب ہم اجازت چاہتے ہیں اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے پاک وطن پر اپنا کرم کرے اور ہم سب کی تمام مشکلات و پریشانیاں آسان فرمائیں۔

شہلا گل سحر ــــــ کوہاٹ

سلام محبت اور زور قلم اور زیادہ۔ ایمان، صحت اور آپ کا سایہ سلامت رہے، آمین۔ کیا کروں ردا 16 سے پہلے ملتا ہی نہیں تبصرہ کی حسرت دل میں دبائے بیٹھے ہیں۔ بہت ارمان ہے آپ سے فیس ٹو فیس ملنے اور دیکھنے کا۔ تھینکس ردا کے ذریعے ایک نئی پہچان دینے کی اور اتنی پیاری بہنوں سے ملوانے کے لیے۔ ورنہ کچھ نہ لکھوں تو خوشی کے باوجود روح بے چین رہتی ہے۔ میرے اندرونی سکون کے لیے۔ بہت بہت شکریہ اور اگرچہ میں لفظوں کا حق ادا کرنے میں طفل مکتب ہوں مگر آپ کی رہنمائی یا حوصلہ افزائی شاید اچھا لکھاری بننے میں مدد دے۔

شبانہ زبیر ــــــ لیہ

السلام علیکم! سب سے پہلے اسٹاف ردا، صالحہ محمود، اپنے خاوند زبیر، اپنے کزنز ایم جے قریشی اور پاکستانیوں کو نیا سال 2016ء مبارک ہو۔ اللہ کرے 2016ء پاکستان اور پاکستان میں بسنے والوں کے لیے خوشیوں کی نوید لائے۔ ماہ فروری 2016ء کا ردا ڈائجسٹ ہنستا مسکراتا ہزاروں رنگ بکھیرتا بارہ تاریخ کو ہمارے گھر کی دہلیز پر اپنا پیارا قدم رکھ چکا تھا۔ ردا پر نظر پڑتے ہی ساری تھکن دور ہوگئی اور مرجھائے چہرے پر بہار آگئی۔ ٹائٹل اچھا تھا۔ اس کے بعد حسب عادت فہرست پڑھی۔ پھر آگے چل کر ''گوشۂ آگہی'' سے دل کو ٹھنڈک پہنچائی۔ مکمل ناول بہت پسند آئے۔ ناولٹ بھی اچھا رہا۔ افسانے میں نگوڑی، شکستہ آرزو، محبت دکھ دیتی ہے، باقی بھی اچھے تھے۔ ''ردا کی ڈائری'' میں ایم جے قریشی، مہرین کنول، دھنک ناز نمبر لے گئے۔ باقی فرینڈز نے بھی اچھا لکھا۔ اشعار میں سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ''اس ماہ میں'' سب نے اچھا لکھا۔ ''خوشبو'' میں ہر لفظ خوشبو کی طرح مہک رہا تھا۔ ''ذرا پھر سے کہنا'' میں سب کا کلام دل کو بھایا۔ سندیسے میں سب سکھیوں نے خوب محفل جمائی۔ کچن میں جا کر بہت خوب سیکھا۔ سنگھار میں جلد کی حفاظت سیکھی۔ بہت کم وقت میں ردا پڑھ کر یہی کچھ لکھ سکی۔ ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ اجازت۔

صباء عبدالغنی ــــــ کراچی

بادِ صبا کے سنگ چلتا اور خوشبوؤں سے مہکتا سلامِ الفت قبول ہو۔ فروری کا شمارہ جیسے ہی ہاتھوں

کی زینت بنا دل و دماغ کو معطر کر گیا۔ سرورق پر موجود پیاری سی ماریہ رضوی نے توجہ کھینچ لی۔ اشتہار سے چھلانگ لگا کر فہرست کی طرف بڑھے۔ اتنی بے شمار تحریریں دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ عائشہ ذوالفقار! آپ کا ناول بہت عمدگی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ حائقہ کا کردار بہت اٹریکٹو ہے لیکن اتنی سی جان پر اتنا ظلم اچھا نہیں لگا۔ عمیر راؤ تو بہت سنگدل انسان ہے۔ آپ کا ناول پڑھنے میں بہت مزہ آ رہا ہے، ویلڈن۔ شازیہ مصطفیٰ! آپ کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ افشاں علی! نہایت ہی اعلیٰ تحریر تھی آپ کی۔ ایس حبیب خان! ردا میں آپ کی پہلی تحریر ہے تو موسٹ ویلکم۔ فاطمہ خان! آپ کا ناولٹ بہت عمدہ تھا۔ قرۃ العین سکندر! آپ کی کہانی کا نام بہت پیارا تھا۔ بے شک یہ دنیا ایک بہترین انتقام گاہ ہے۔ ہر عمل کا ردعمل ضرور ہوتا ہے۔ نظیر فاطمہ! آپ کی تحریر ہلکی پھلکی بہت اچھی لگی۔ ماریہ یاسر! آپ کی مستقل حاضری اچھی لگتی ہے۔ ثناء کنول! میرے دل کی ملکہ تو آپ ہیں۔ سونیا چوہدری! ردا فیملی کا آپ نے پہلی بار دروازہ بجایا ہے تو ہم ردا فیملی کا دروازہ کھولتے ہوئے آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ رابعہ افضال! آپ کا منفرد اندازِ بیان آپ کو خاص بناتا ہے۔ فریدہ فرید! افسانوں میں تشریف آوری فرما کر سندیسہ کی محفل سے کہاں غائب ہیں؟ ذوق کا اندازِ محبت بہت انوکھا لگا اور بہت اچھا بھی۔ سیدہ فرزانہ حبیب! آپ کا افسانہ بہترین تھا۔ حمیرا قریشی! سب سے پہلے تو پہلی حاضری پر خوش آمدید۔ کم عمر، الہڑ اور نادان لڑکیوں کے لیے آپ کی تحریر یقیناً موثر ثابت ہو گی۔ ریمل آرزو! آپ کی تحریر تجسس سے بھرپور تھی۔ صالحہ آپی! آپ کی تحریر پر میرا تبصرہ ''چھوٹا منہ بڑی بات'' کے مترادف ہے۔ مجھے اچھی لگی۔ مون شاہ! آپ نے اپنی تحریر سے ثابت کر دیا کہ محبت صورت کی محتاج نہیں ہوتی۔ شہلا گل سحر! آپ کی تحریر کمال کی تھی۔ اقراء سیف! آپ کا افسانہ مختصر پر اثر تھا۔ زینب ندیم ملک! آپ کی تحریر بھی مختصر، پر اثر تھی۔ حوریہ سعد! آپ کی پہلی کہانی کی طرح دوسری بھی اچھی تھی۔ ردا کے سنگ اپنا سفر مزید جاری رکھیے گا۔ اسوریہ علی! آپ کا افسانہ لاجواب تھا۔ فرح ناز رفیق! آپ کا افسانہ بہترین تھا۔ باقی تمام مستقل سلسلے بہترین تھے۔ ''سندیسے'' کی محفل ہر بار کی طرح بارونق تھی۔ ٹاپ پر موجود عانیہ نیازی کے سندیسے کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ بے شک آپ کو ہم نے بہت مس کیا۔ اب دوبارہ غائب مت ہو جایئے گا۔ اوکے۔ افشاں علی! مصروفیت کے باوجود آپ کی حاضری نے دل خوش کر دیا۔ ایسے ہی ردا میں شامل رہیے گا۔ فرح ناز رفیق! افسانوں کے ساتھ ساتھ سندیسے میں بھی آپ کی شرکت بہت اچھی لگی۔ گیتی آراء! آپ کا تبصرہ ہر بار تعریف کا حامل ہوتا ہے۔ رابعہ افضال خان! میرے وش کرنے سے آپ کو خوشی ہوئی جان کر اچھا لگا لیکن صرف خوشی سے گزارہ نہیں ہے بدلے میں آپ کو بھی مجھے میری برتھ ڈے وش کر کے خوشی دینی ہو گی۔ میری برتھ ڈے 2 مئی کو ہے۔ (یاد رہے گا ناں؟) ''دوستوں کے نام پیغام'' میں تمام پیغام اچھے تھے۔ حنا کنول، تبسم فیاض، اقراء چنہ اور شازیہ مصطفیٰ آپ سب کی مارچ کے مہینے میں برتھ ڈے ہے تو میری طرف سے Many many happy returns of the day. اور ہاں کشف ضیاء! آپ کی بھی برتھ ڈے ہے تو میری طرف سے آپ کو سالگرہ کی ڈھیروں مبارک باد۔ ''کچن'' اور ''سنگھار'' ہر بار کی طرح بہترین تھے۔ اسی کے ساتھ اجازت اللہ حافظ۔''

......☆......

دوستوں کے نام پیغام

پیاری دوست کے نام

میری بہت ہی خاص و پیاری سی دوست کشف ضیاء کے نام میرے دل کی تمام گہرائیوں سے نکلا یہ چھوٹا سا پیغام کشف ضیاء وہ نام وہ ذات جو ہر قدم ہر موڑ پر میرے سنگ سنگ ہے جس نے میری زندگی میں اپنی دوستی کے خوب صورت رنگ بکھرے جو اپنے نام ہی طرح روشنی بکھیرتی ہے میں اپنی خاص دوست کو اپنے پیارے ردا کے توسط سے اس خوب صورت دن کی مبارک باد دینا چاہتی ہوں جس دن وہ اس دنیا میں آئی یعنی 19 مارچ۔ میری پیاری سی دوست کشف ضیاء کو ڈھیر ساری محبتوں، پرخلوص دعاؤں اور دل کی گہرائیوں سے سالگرہ کی بہت بہت بہت مبارک۔

میں نے چاہا کہ کوئی ایسا تحفہ تیری نذر کروں
جسے تو عمر بھر یاد رکھے
پھر ایک لمحے کی سوچ نے میرے ہاتھ بلند کیے
کچھ دعاؤں کے پھول دل کی گہرائیوں سے آزاد کیے
کہ تیری آنکھوں کے دیئے سدا چمکے
خدا تیرا دامن مسرتوں سے ہمیشہ ہمکنار رکھے
بہت سی دلفریب یادیں
اور گلاب لمحوں کی چاندنی تیرے دل کو بھلائے
محبتوں کی چاشنی خدا تیرے آس پاس بکھرائے
تو گزرے لمحوں سے پیار کرے

خدائے عزوجل تیری عمر دراز کرے
اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں عطا کرے، آمین

Wish you many many
happy return of the day.

افشاں علی۔ کراچی

میرے سوئیٹ Husband
آصف خان کے نام

میرے ہمسفر تیری نذر ہیں
میرے جذبۂ دل کی شدتیں
میرے خواب، میری بصارتیں،
میری دھڑکنیں، میری چاہتیں
جو تیرے قدم میرے گھر چلیں
میرے ساتھ شمس و قمر چلیں
تیری قربتوں میں سمیٹ لوں
رہ زندگی کی مسافتیں
یہ ردائے جان تجھے سونپ دوں
کہ نہ دھوپ تجھ کو کڑی لگے
کہیں دکھ نہ تجھ کو عطا کریں
سر دشت غم کی تمازتیں
تیرے نام سے میری صبح ہو
تیری یاد سے میری شام ہو
تیری روبرو ہیں سرخرو میرے چشم و دل کی عبادتیں
تیرا پیار میری دعا ہے یہی فکر مجھ کو سدا رہے

کہ ہرا رہے تیرا نخل جاں کہ
نصیب ہوں تجھے راحتیں
میرے روز و شب کے نصاب میں
میرے پاس اپنا تو کچھ نہیں
تیرا قرض ہے میری زندگی
میری سانسیں تیری امانتیں

سیدہ فرزین حبیب۔ کراچی

مجھے چاہنے والوں کے نام

متاثر ہم نہیں ہوتے اتنی جلدی کسی سے مگر نور
کچھ لوگوں کو دل میں اتر جانے کا فن آتا ہے

ریما نور رضوان۔ کراچی

میری پیاری بیگم، میری زندگی کے لیے

جان میری جان
تم اگر نہ ہوتے تو
اس دنیا میں ہم بھی نہ ہوتے
بنایا ہے میرے پیارے رب نے
بہت بہت پیار سے میرا پیار
شکرادا کرتا ہوں پل پل
اپنے سوہنے رب کا
جب دیکھتا ہوں تم کو میری جان
وہ پل بھی کم لگتے ہیں
شکرادا کرنے کے لیے
میں تمہارا نام نہیں لیتا میری ریما
نظم تمہارے لیے لکھی ہے

محمد رضوان۔ کراچی

پیاری بہن کے نام، مسکان کا پیار

بہن ہماری جان
کبھی گلاب تو کبھی چنبیلی ہے وہ
بہن کے روپ میں اِک مخلص سہیلی ہے وہ
اچھی بھی ہے وہ اتنی پیاری بھی ہے
ہے فخر کہ ایسی بہن ہماری بھی ہے
ہوتی ہے خفا پھر جلدی ہی مان جاتی ہے
ہماری خطاؤں کو وہ ہنس کے ٹال جاتی ہے
ہے وہ ہمیشہ سے ہمارے دکھ سکھ کی ساتھی
دعا ہے رہے وہ سدا ہنستی مسکراتی
ملے اسے دنیا کی ہر ایک خوشی
نہ ہو کبھی دور اس کے لبوں سے ہنسی
خدا کرے سدا سنگ سنگ یہ رہے مسکان
کہ اس بہن میں ہی ہے بسی ہماری جان

مصباح مسکان رؤف۔ جہلم

پیاری آپی صالحہ جانی اور دوستوں کے نام

پیاری آپی صالحہ محمود، تمام اسٹاف، قارئین اور دوستوں کو السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ سب کی جھولیوں کو خوشیوں سے بھر دے، آمین۔ پیاری آپی صالحہ جانی سب سے پہلے میں آپ کی نوازشوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ فرید باہو، نگوڑی اور انٹرویو شائع کر کے آپ نے مجھے خوش کر دیا۔ امید کرتی ہوں انشاء اللہ ہمارا اور آپ کا تعلق تاعمر رہے گا۔ جزاک اللہ۔ آپ سمیت تمام دوستوں کی محبت کا شکریہ مجھ پر قرض تھا اگرچہ کچھ دیر ہو گئی لیکن میں معذرت خواہ ہوں اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ مختصر لفظوں میں دوبارہ شکریہ ادا کرتی ہوں۔ دل بہت چاہتا ہے ہر ماہ روا میں شرکت کرنے کا لیکن پڑھائی اور دیگر مصروفیات بند باندھ دیتی ہیں۔ تقریباً دو تین ماہ بعد میرے فرسٹ ایئر کے امتحانات ہونے والے ہیں۔ درخواست کرتی ہوں آپ سب سے کہ میرے لیے دعا کیجیے گا میں کامیابی سے سال اول مکمل کر لوں۔ آخر میں افشاں علی، ملالہ

اسلم، صباء عبدالغنی، رابعہ افضال خان، ثناء کنول اللہ دتہ اور رامین ناز کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار...... تمام اچھی دعائیں آپ سب کے نام۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا، والسلام۔

سیدہ مون بخاری۔ سرگودھا

اپنے ہسبینڈ کے نام

میری زندگی کے ہمسفر، تجھے کیا پتا تجھے کیا خبر
یہ جو تیرا میرا ساتھ ہے
زرد روشنیوں کے نام ہے
ہو کبھی مجھ سے کوئی خطا
نہ ہونا تم مجھ سے خفا
تجھے پیار کروں میں بے پناہ
تو بھی رکھنا مجھ کو سب سے خاص
یہ جو تیرا میرا ساتھ ہے
زرد روشنیوں کے نام ہے
جب ہوتے ہو تم مجھ سے دور
تجھے یاد کروں میں بے پناہ
میرے دل کا حال تجھے کیا پتا
یہ تو جانے صرف میرا خدا
ہو جب بھی تجھ کو کوئی گلہ
مجھ کو دینا تم صرف اک صدا
سب کچھ میں چھوڑ چھاڑ کے
دور کروں میں تیرا گلہ
تو بھی کرنا مجھ سے بہت ہی پیار
نہ چھوڑ کے تو جانا کہیں
میری زندگی کے ہمسفر
تجھے کیا پتا تجھے کیا خبر
یہ جو تیرا میرا ساتھ ہے
زرد روشنیوں کے نام ہے

یاسر میں ردا ڈائجسٹ کے توسط سے آج آپ سے یہ اظہار کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کا پیار اور ساتھ میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے اور ساتھ ہی آپ کو Thanks بھی کہنا چاہتی ہوں کیونکہ آپ نے ہی میرے لکھنے کے شوق میں بھرپور ساتھ دیا۔ آپ کے Motivate کرنے سے ہی میں نے لکھنے کی ہمت کی اور پیارے ردا کے ذریعے میرا یہ شوق پورا ہوا۔ ساتھ ہی صالحہ آپی اور نورین کا بھی شکریہ جنہوں نے سب سے پہلے میرے لیے ردا کا دروازہ کھولا اس کے بعد تو ہر طرف سے راستے کھلتے چلے گئے لیکن پہل تو آپ نے ہی کی اس لیے شکریہ۔ میں اپنے Husband کو سرپرائز دینا چاہتی ہوں اپنی اس غزل کے ذریعے جو میں نے صرف انہی کے لیے لکھی۔

ماریہ یاسر۔ کراچی

مس ثمرین صباء کے نام

سب سے پہلے السلام علیکم! امید ہے اپ بالکل ٹھیک ٹھاک اور مزے میں ہوں گی۔ بہت دنوں سے سوچ رہی تھی کہ آپ کو کیا گفٹ دوں۔ تو سوچا کیوں نہ اپنے فیورٹ ردا کے توسط سے آپ کو اپنے عقیدت مندانہ جذبات اور دعاؤں کو بطور تحفہ پیش کروں اور اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آج قلم تھاما ہے۔ ہر ٹیچر سے مجھے بہت عقیدت ہے لیکن آپ سے تھوڑی زیادہ ہے۔ کیونکہ آپ نہ صرف ہمیں بہت اچھا پڑھاتی ہیں بلکہ آپ ہماری اچھی تربیت بھی کر رہی ہیں۔ میری دعا ہے کہ آپ بہت اچھی ڈاکٹر بنیں۔ امید ہے گفٹ اور سرپرائز دونوں آپ کو پسند آئے گا۔ گفٹ کیسا لگا ضرور بتایئے گا۔

صباء عبدالغنی۔ کراچی

......☆......



بیف قیمہ ہری مرچیں

اجزاء:

بیف قیمہ : آدھا کلو (موٹا)
پیاز (سلائس کاٹ لیں) : دو عدد
آئل : پون کپ
لہسن، ادرک پیسٹ : ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر : آدھا چائے کا چمچہ
گرم مصالحہ (کٹا ہوا) : ایک چائے کا چمچہ
نمک : حسب ذائقہ
دہی : ایک کپ
ہری مرچیں (چھوٹی) : آدھا کپ

ترکیب: سوس پین میں کوکنگ آئل گرم کر کے پیاز ڈال کر فرائی کریں پیاز سنہری ہو جائے تو قیمہ، لہسن، ادرک پیسٹ، نمک اور ہلدی پاؤڈر ڈال کر قیمہ بھون لیں۔ قیمے کا پانی خشک ہو جائے تو دہی ڈال کر ڈھک کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ دہی کا پانی خشک ہو جائے تو مصالحہ بھون لیں۔

ہری مرچیں اور کٹا ہوا گرم مصالحہ ڈال کر دم پر رکھیں۔ مزیدار بیف قیمہ ہری مرچیں تیار ہے۔ سرونگ ڈش میں نکال کر چپاتی کے ساتھ سرو کریں۔

چنے کی دال گوشت

اجزا:

بکرے کی بوٹیاں : آدھا کلو
چنے کی دال (ابلی ہوئی) : ایک پیالی
پیاز (باریک کٹی ہوئی) : دو عدد
پسا ہوا لہسن ادرک : ایک کھانے کا چمچہ
پسی ہوئی ہلدی : ایک کھانے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ : ایک کھانے کا چمچہ
پسا ہوا گرم مصالحہ : ایک کھانے کا چمچہ
بھنی اور پسی دار چینی : ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس : ایک کھانے کا چمچہ
گرم پانی : چار پیالی
نمک : حسب ذائقہ
تیل : ایک پیالی

پودینہ، ہری مرچیں، لیموں کا رس، ادرک چھڑکنے کے لیے

ترکیب: دیگچی میں بوٹیاں، 1/2 پانی، پیاز، لال مرچ، ہلدی، لہسن ادرک اور نمک ملا کر پکائیں۔ پانی خشک ہو جائے تو اس میں دال اور باقی پانی شامل کر کے دال اور گوشت یکجان ہونے تک پکائیں۔ اس میں باقی اجزاء ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ مزیدار دال گوشت پودینہ، ہری مرچیں، لیموں کا رس اور ادرک ڈال کر پیش کریں۔

پودینے کی چٹنی

ضروری اشیاء:

پودینہ : ایک گٹھی

ہرا دھنیا : آدھی گٹھی
ہری مرچیں : دس عدد
انار دانہ : پانچ چائے کے چمچے
لہسن کے جوے : چار عدد
سفید زیرہ : ایک چائے کا چمچہ
نمک : حسب ذائقہ

ترکیب: پودینہ اور ہرا دھنیا توڑ کر دھولیں، انار دانہ صاف کر کے بھگو دیں، سفید زیرہ، لہسن، ہری مرچیں، پودینہ، ہرا دھنیا اور انار دانہ نمک تمام اشیاء ملا کر بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کر لیں یا سل میں پیس لیں۔ چٹنی پیسنے کے بعد نمک، مرچ چکھ لیں اگر کچھ کمی لگے تو حسب خواہش شامل کر لیں۔ لیجیے پودینے کی مزیدار چٹنی تیار ہے۔ اسے آپ شیشے کے صاف اور خشک جار میں محفوظ کر لیں۔ اسے بیسنی روٹی، آلو بھرے پراٹھے اور دال بھرے پراٹھے کے ساتھ کھائیں، خوب مزہ دے گی۔ اس کے علاوہ دال، چاول، بریانی اور پلاؤ کے ساتھ کھانے کا بھی اپنا مزہ ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اسے دہی میں ڈال کر رائتہ بنا کر بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ ہر صورت میں مزہ دے گی اور ہاضمہ درست رکھنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ ساتھ ہی آپ کے دستر خوان کی شان بھی بڑھائے گی۔

اروی کے پتوڑ

اجزاء

اروی کے پتے : دو عدد
سرخ مرچ نمک : حسب ضرورت
پیاز : آدھا پاؤ
ہرا دھنیا : آدھی گٹھی
بیسن : ایک پاؤ
انار دانہ : دو کھانے کے چمچ
سبز مرچ : چار عدد (باریک کٹی ہوئی)
خشک دھنیا : دو چائے کے چمچ
کوکنگ آئل : حسب ضرورت

ترکیب: اروی کے پتوں کو دھو کر باریک کاٹ لیں۔ ہری مرچیں بھی دھو کر باریک کتر لیں پیاز کو باریک کچھوں میں کاٹ لیں۔ دھنیے کو توے پر ہلکا سا بھون لیں۔ ہرے دھنیے کی پتیاں چن کر باریک کاٹ لیں۔ انار دانے کو چن کر صاف کر لیں۔ اب ان تمام اجزاء کو بیسن میں ملا دیں۔ نمک مرچ بھی ڈال دیں اور پانی ڈال کر اس آمیزے کی پیسٹ سی بنا لیں کچھ دیر رکھا رہنے دیں۔ ایک کڑاہی میں تیل گرم کر کے اس میں پہلے سے تیار کردہ آمیزے سے پتوڑ بنا کر تل لیں۔ گولڈن براؤن ہونے پر کڑاہی سے نکال لیں اور ہری مرچ انار دانے کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

گاجر آلو بھجیا

اجزاء

آلو : ایک پاؤ
گاجر : ایک پاؤ
زیرہ : ایک چائے کا چمچ
رائی دانہ : ایک چائے کا چمچ
خشک دھنیا پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ
ہلدی : ایک چائے کا چمچ
سرخ مرچ : ایک چائے کا چمچ
گرم مصالحہ : آدھا چائے کا چمچ
اچور : آدھا چائے کا چمچ
ہرا دھنیا (چوپڈ) : ایک چائے کا چمچ

ادرک : ایک انچ کا ٹکڑا (باریک کاٹ لیں)

نمک : حسبِ ذائقہ

آئل : حسبِ ضرورت

ترکیب: گرم آئل میں زیرہ اور رائی دانہ کڑکڑا کر ادرک کو صرف 20 سیکنڈ بھونیں۔ پھر اس میں آلو اور گاجر شامل کر کے بھونیں۔ اب گرم مصالحہ اور اچور ڈالیں اور ڈھک کر پکنے دیں۔ تیار ہونے پر ہرے دھنیے اور ادرک سے گارنش کر کے سرو کریں۔

کیبج کٹلٹس

اجزا

بند گوبھی : آدھا عدد (چوپ کرلیں)

انڈا : تین عدد (پھینٹ لیں)

پیاز (چھوٹا) : دو عدد (چوپڈ)

آلو (چھوٹے) : دو تین عدد (ابال کر میش کرلیں)

ہری مرچ : چھ عدد (چوپڈ)

کوکونٹ : پون کپ (گرینڈ)

بریڈ کرمز : ایک کپ

ہینگ : ایک چٹکی

دال چنا : ایک کھانے کا چمچ

چاول : ایک کھانے کا چمچ

ہرا دھنیا (پتے) : دو کھانے کے چمچ

ثابت کالی مرچ : پانچ چھ عدد

ادرک : ایک انچ کا ٹکڑا

نمک : حسبِ ذائقہ

آئل : حسبِ ضرورت

ترکیب: پیاز، ہرا دھنیا، ہری مرچ، ادرک اور گوبھی ایک ساتھ مکس کرلیں۔ کالی مرچ اور کوکونٹ شامل کر کے مزید مکس کریں۔ دال اور چاول گرائنڈ کر کے آٹا بنائیں اور ڈرائی روسٹ کر کے گوبھی کے مکسچر میں مکس کرلیں۔ اب آلو شامل کر کے میش کریں اور کٹلٹس بنا لیں۔ پہلے انڈے اور پھر بریڈ کرمز میں رول کریں۔ دوبارہ انڈے میں ڈِپ کر کے گرم آئل میں فرائی کرلیں۔ کیچپ یا سوس کے ساتھ سرو کریں۔

سیلڈ سینڈوچ

اجزا

بریڈ : تین سلائسز (کنارے کاٹ لیں)

انڈا : ایک عدد (ابال کر سلائسز کاٹ لیں)

ٹماٹر : ایک عدد (سلائسز)

کھیرا : ایک عدد (سلائسز)

بند گوبھی (کش کی گئی) : آدھا کپ

سلاد پتا (چوپڈ) : آدھا کپ

مایونیز : تین کھانے کے چمچ

کالی مرچ پاؤڈر : حسبِ ذائقہ

نمک : حسبِ ذائقہ

ترکیب: پہلے سلائس پر مایونیز لگا کر انڈے، ٹماٹر اور سلاد پتے کی تہ لگائیں۔ دوسرے سلائس پر مایونیز لگا کر اوپر رکھیں اور اس پر ٹماٹر، کھیرے اور بند گوبھی کی تہ لگائیں۔ تیسرے سلائس پر مایونیز لگا کر نمک اور کالی مرچ چھڑکیں اور اوپر رکھ دیں۔ تیار ہونے پر کاٹ کر سرو کریں۔

......☆......

شہلا مشائق

سنگھار

جلد کی ساخت کے اعتبار سے میک اپ

میک اپ ہمیشہ جلد کی ساخت اور چہرے کی رنگت کو مدِ نظر رکھ کر کرنا چاہیے۔ آپ جلد کی ساخت کے اعتبار سے میک اپ کریں گی تو میک اَپ درست ہو سکے گا۔ جلد کی ساخت کئی طرح کی ہوتی ہے۔ مثلاً چکنی جلد، خشک جلد، نارمل جلد، حساس جلد اور اسی طرح چہرے کی رنگت بھی کئی طرح کی ہوتی ہے۔ گندمی رنگت، سرخی مائل رنگت، سیاہ رنگت، زرد رنگت، زیتونی رنگت۔ ان میں سے خشک، چکنی اور نارمل جلد پر ایک ہی طرح کا میک اپ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح چہرے کی رنگت کے اعتبار سے اشیاء استعمال کرنی چاہئیں۔ چاہے آپ کی رنگت سفید ہو یا گندمی اگر آپ سفید رنگت کی مالک ہیں تو آپ کو ہلکا میک اپ بھی کرنا چاہیے اور تیز میک اپ بھی۔ دونوں طرح کا میک اَپ آپ کی سفید رنگت پر نکھار پیدا کرے گا اور اگر گندمی رنگت کی مالک ہیں تو آپ کو نیچرل کلر کا میک اَپ کرنا چاہیے اور ہلکے رنگ کے لباس پہننے چاہئیں۔ مثلاً اورنج، ہلکا پیلا، گلابی، ہلکا نیلا، ہلکا گلابی وغیرہ۔ میک اَپ کرتے وقت اپنی گردن کو بھی خاص طور پر مدنظر رکھیں۔ میک اَپ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ چہرے اور گردن دونوں کی رنگت ایک جیسی ہو۔ میک اَپ زیادہ گہرا نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ مصنوعی معلوم ہوگا اور آپ بالکل ماڈل نظر آنے لگیں گی۔ ذیل میں ہم مختلف جلدوں پر میک اَپ کرنے کے طریقے درج کر رہے ہیں۔

1۔ خشک جلد: اگر آپ کی جلد خشک ہے تو سب سے پہلے آپ بغیر چکنائی والی فاؤنڈیشن یا کریم چہرے پر لگائیں۔ خشک جلد کے لیے موسچرائزر یا موسچرائزنگ لوشن استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لوشن جلد کو نمی اور روغن فراہم کرتا ہے۔

2۔ چکنی جلد: چکنی جلد کے لیے جو فاؤنڈیشن استعمال کیا جائے اس میں بنیادی عنصر پانی ہونا چاہیے۔ ایسی جلد والی خواتین کو ویلواسٹھ لوشن استعمال کرنا چاہیے۔ یہ چہرے کے لیے بہترین اسٹرنجنٹ ہے۔ روغنی جلد والی خواتین کو اسکن ٹانک کا استعمال ہرگز نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کے بجائے ہلکی ہلکی کلینزر سے جلد صاف کر کے ویلواسٹھ لوشن لگانا بہتر ہوتا ہے۔

3۔ نارمل جلد: یہ جلد کی سب سے بہترین ساخت ہے۔ جن خواتین کی جلد نارمل ہو انہیں چکنی اور پانی کی آمیزش والی فاؤنڈیشن لگانی چاہیے کیوں کہ یہ اس جلد کے لیے بہت مفید ہوتی ہے۔

4 حساس جلد: حساس جلد سے مراد ایسی جلد ہے جو بہت ہی نازک ہوتی ہے ایسی جلد کو پریشان کن جلد بھی کہا جاتا ہے۔ جن خواتین کی جلد حساس ہو انہیں چاہیے کہ وہ بغیر چکنائی والی فاؤنڈیشن استعمال کریں کیوں کہ ان کی جلد کے مسامات ویسے ہی زیادہ چکناہٹ خارج کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ وہ ادویات پر مشتمل فاؤنڈیشن استعمال کریں جو ان کے لیے مفید ہے۔

5۔ سیاہ رنگت: جن خواتین کی رنگت سیاہ ہوتی ہے انہیں ہلکے نارنجی یا گلابی شیڈ کی فاؤنڈیشن استعمال کرنی چاہیے۔ اس سے ان کے چہرے پر صحت مند تازگی کا تاثر نظر آنے لگتا ہے۔ بعض خواتین جن کی رنگت سیاہ ہوتی ہے وہ اپنی سیاہ رنگت کو چھپانے کے لیے بہت ہی بھاری قسم کا میک اپ کرلیتی ہیں جو مناسب نہیں ہوتا ہمیشہ ہلکے پھلکے میک اَپ سے ہی چہرے پر وقار اور دلکشی پیدا ہوتی ہے۔

6۔ گندمی رنگت: سفید رنگت پر چاہے ہلکا میک اپ کیا جائے چاہے بھاری اور تیز میک اَپ سفید رنگت پر دونوں طرح کا میک اَپ اچھا ہے۔ لیکن گندمی رنگت کے سلسلے میں ایسا نہیں ہے۔ گندمی رنگت رکھنے والی خواتین کو بہت سی احتیاط اور سلیقہ سے کام لینا چاہیے۔ ورنہ ان کا چہرہ بدنما اور رنگ سیاہ نظر آنے لگے گا۔ گندمی رنگت والی خواتین کو ایلزبتھ آرڈن کی فیئر لائٹ فاؤنڈیشن کا روز ایشل شیڈ استعمال کرنا چاہیے۔ میک اَپ کے ماہرین نے اس فاؤنڈیشن کو بہت مفید قرار دیا ہے اور اس سے چہرے پر نکھار پیدا ہوتا ہے۔

7۔ زرد رنگت: زرد رنگت یا پیلاہٹ مائل رنگت رکھنے والی خواتین کو گلابی اور ہلکے اورنج شیڈ کے امتزاج والی فاؤنڈیشن استعمال کرنی چاہیے۔ کیوں کہ اس شیڈ کے فاؤنڈیشن لگانے کے بعد ان کے جسم کی جلد کا رنگ چہرے کے رنگ سے زیادہ متضاد نہیں لگے گا۔ اس کے علاوہ دوسرا شیڈ پیلاہٹ مائل براؤن اور گلابی کا بھی لیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں رنگوں کی فاؤنڈیشن کے استعمال سے چہرے پر قدرتی تازگی اور گلابی پن کا احساس پیدا ہوگا اور یوں چہرے کی دلکشی میں بہت زیادہ اضافہ پیدا ہو جائے گا۔

8۔ سرخی مائل: رنگت رکھنے والی خواتین کے چہرے پر چھوٹے چھوٹے سرخ دھبے بھی نظر آتے ہیں۔ خصوصاً ناک کی نوک، تھوڑی، پیشانی اور رخساروں پر سرخ نشانات قدرے واضح ہوتے ہیں۔ سرخی مائل رنگت رکھنے والی خواتین کو چاہیے کہ وہ پیلاہٹ مائل رنگ کی فاؤنڈیشن استعمال کریں۔ کیوں کہ اس شیڈ کی فاؤنڈیشن چہرے کی سرخی کو بھی چھپائے گی اور اس کے ساتھ ساتھ چہرہ قدرتی سرخی سے بھی محروم نہیں رہے گا لیکن فاؤنڈیشن سے پہلے پرائمر ضرور لگا لینا چاہیے۔

میک اپ کرنے کا طریقہ

1۔ میک اَپ کرنے کے لیے سب سے پہلے چہرے کی تھریڈنگ کریں گے۔ تھریڈنگ کرنے کے بعد چہرے کا مساج کریں۔ اس کے بغیر آپ خوب صورت نہیں لگیں گے۔

2۔ Neck پر فاؤنڈیشن ایک ہی لیول میں لگایا جاتا ہے۔ ورنہ زیادہ بام ہونے کی وجہ سے دھبے نظر آئیں گے۔ گردن پر سامنے کی طرف لگانے کے بعد فاؤنڈیشن گردن کے پیچھے اور کندھوں پر بھی اچھی طرح لگائیں۔ Neck سے اوپر کان پر بھی فاؤنڈیشن لگائیں اور کان کے پیچھے بھی تاکہ تمام حصے ایک جیسے نظر آئیں۔

3۔ اب فاؤنڈیشن گالوں پر لگائیں۔ گالوں پر لگاتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ ہاتھوں کو نیچے سے اوپر کی طرف لے جایا جائے۔ ایک گال پر لگانے کے بعد اسی طرح دوسرے گال پر بھی لگائیں۔

4۔ Cheecks پر لگانے کے بعد Chin پر لگائیں۔

5۔ پھر آنکھوں پر لباس کی مناسبت سے شیڈز لگائیں۔ بلشر رخسار کے ابھار سے کان کی لوئیں تک پنک اور پیچ کلر کا لگائیں تو نیچرل لگتا ہے اور پھر صاف رنگت کی خواتین ڈارک کلر کی اور گندمی رنگت کی خواتین لائیٹ کلر کی لپ اسٹک کا استعمال کریں۔ تھوڑی سی توجہ اور محنت سے آپ کی شخصیت پرکشش اور جاذب نظر ہو جائے گی۔

☆......☆